بسم اللہ الرحمن الرحیم

بھنور

بھنور

ساجدہ غلام محمد

اساس پبلیکیشن لاہور

کتاب کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

پراجیکٹ ہیڈ:	محمد عفان،
پراجیکٹ مینیجر:	محمد عثمان عارف
کانٹینٹ ہیڈ:	عبداللہ اذفر
مصنفہ:	ساجدہ غلام محمد
نظرثانی:	عزام محسن، ڈاکٹر فاروق احمد،
سرورق:	؟
صفحات:	؟
قیمت:	؟
باراول:	دسمبر 2023ء
زیراہتمام:	اساس پبلی کیشن
ناشر:	اُردو سرائے

ناول منگوانے کے لیے

انتساب !

اُن تمام اہل حق کے نام

جنھوں نے اپنی جد و جہد کے ذریعے مسلمانوں کو بھنور سے نکال کر سرخرو کیا۔

تقریظ

مصنف کی بات

بھنور

رکشہ قبرستان کے گیٹ کے قریب آکر رُکا تھا۔ وہ رکشے سے اُترا اور حیرت سے قبرستان کی جانب دیکھنے لگا۔ جہاں لوگوں کا ایک جمِ غفیر موجود تھا۔ لوگ مرحوم کی یاد میں گفتگو کر رہے تھے اور کچھ خاموشی سے سر جھکائے کھڑے تھے۔ رکشے سے اترتے ہوئے اس نے اندازہ لگالیا کہ یہاں کسی میت کی تدفین ہونے والی ہے۔ اُس نے جیب سے بٹوہ نکال لیا۔

''جناب! لگتا ہے یہاں کوئی انسان اگلے جہان کے سفر پہ جانے کو تیار ہے۔ لوگوں کا رش بتا رہا ہے کہ یقیناً یہ اللہ کے کسی نیک اور پسندیدہ بندے کا ہی جنازہ ہوگا۔'' رکشے والے نے بھی قبرستان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''للہ... لیکن ایسے کیسے؟'' بٹوے سے پیسے نکالتے ہوئے وہ الجھن کا شکار ہو گیا۔

''اللہ کا نیک اور پسندیدہ بندہ؟''

وہ ابھی تعجب اور حیرت سے جنازے کے شرکاء کو دیکھ ہی رہا تھا کہ رکشے والے کی آواز آئی:

"بھائی صاحب! مجھے فارغ کر دیں، میں نے مزید سواریاں بھی اُٹھانی ہیں۔"

اس نے چونک کر رکشے والے کی جانب دیکھا، پھر جیسے کچھ یاد آنے پر "اوہ، معاف کرنا" کہتے ہوئے بٹوے سے پیسے نکال کر اسے پکڑا دیے۔ رکشے والے نے پیسوں کو قمیص کی بغلی جیب میں اُڑسا اور چند ہی لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ رکشہ چلے جانے کے بعد اُس نے دوبارہ حیرت سے میت کی جانب دیکھا۔ جہاں لوگ بلند آواز میں کلمہ شہادت کا ورد کر رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں پورے احترام کے ساتھ میت کی تدفین شروع ہو گئی۔

"یہ... یہ ناممکن ہے! بھلا اُس کے جنازے پر اتنا رش کیسے ہو سکتا ہے؟"

اس کی حیرت ابھی تک برقرار تھی۔ اسی حیرت میں اس نے قبرستان کا گیٹ عبور کیا اور میت کے قریب کھڑے لوگوں کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہاں موجود سبھی چہرے انجانے سے تھے۔ اُسے کوئی بھی شناسا چہرہ نظر نہیں آیا۔ اُس نے ان کے چہروں کو غور سے دیکھا۔ وہاں دُکھ تھا، رنج تھا، شدید کرب تھا، سسکیاں تھیں اور آنسو تھے۔

"کیا یہ سب اُس کے ساتھی ہیں؟ لیکن میں نے تو سنا تھا کہ یہ لوگ کسی کے نہیں ہوتے۔ اُن کے جنازے ویران ہوتے ہیں، لیکن یہاں تو منظر ہی کچھ اور ہے۔" اُس کی حیرت ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

"بیٹا....! بس، صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے والد کی مغفرت فرمائے۔"

ایک باریش بزرگ نے آگے بڑھ کر غم سے نڈھال ایک نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نوجوان نے پیچھے مڑ کر بزرگ کی جانب دیکھا۔ پھر جذبات سے مغلوب ہوتے ہوئے اُن کے کندھے پر سر ٹکا کر سسکیاں لینے لگا۔

وہ قدرے فاصلے پر کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے نوجوان کا چہرہ دیکھا، اسے دوبارہ حیرت ہوئی، لیکن اس دفعہ حیرت کے ساتھ ساتھ تسلی بھی تھی۔ ایک لمبی گہری سانس لے کر وہ ذرا پُرسکون

ہو گیا۔

''اوہ..... تو یہ وہ جنازہ نہیں ہے جو میں سمجھ رہا تھا!''اس سوچ کے ساتھ ہی اس کا وجود ہلکا پھلکا سا ہو گیا۔

''لیکن.... اگر یہ وہ والا جنازہ نہیں ہے جس کی تلاش میں یہاں میں آیا ہوں، تو پھر وہ کہاں ہے؟''

یہ خیال آتے ہی اس نے چاروں جانب نظریں دوڑائیں لیکن اسے کوئی اور چیز وہاں نظر نہ آئی۔ارد گرد لوگوں کی تعزیتی گفتگو سے اسے علم ہو گیا تھا کہ یہ جنازہ اس علاقے کی جامع مسجد کے امام صاحب کا ہے جو تیس سال سے وہاں امامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔آج صبح فجر کی نماز پڑھ کر سلام پھیرا ہی تھا کہ اللہ کے حکم سے فرشتے نے ان کی روح قبض کر لی۔

''اے نفسِ مطمئنہ! اپنے پروردگار کی طرف پلٹ آ......''اس کے ذہن میں بے اختیار سورہ الفجر کی آیتیں گونجی تھیں۔اس نے رشک سے میت کو دیکھا جنہیں بہت پیار اور آرام سے ان کے لواحقین قبر میں اُتار رہے تھے۔

''اس حالت میں کہ تُو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے.....''

اس کی آنکھیں بھر سی آئیں۔ حالانکہ مرنے والے سے نہ اس کا کوئی رشتہ تھا نہ تعلق، لیکن پھر بھی اسے ان سے اپنائیت محسوس ہو رہی تھی۔

''اور جس سے میرا تعلق تھا، اس کا جنازہ؟''

تدفین کے احترام میں کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد اس نے دوبارہ ارد گرد متلاشی نظریں دوڑائیں۔

''جگہ بھی یہی ہے، وقت بھی یہی۔ پھر وہ جنازہ کہاں ہے؟''

اُسے اب الجھن ہو رہی تھی۔ قبر پر مٹی ڈالی جا چکی تھی اور دعا کے بعد شرکاء بھی رفتہ رفتہ چھٹتے جا رہے تھے۔اس نے گہری سانس لی اور واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔اس قبرستان میں نئی پرانی، ٹوٹی پھوٹی اور سجی سنوری، کچی پکی، جڑی بوٹیوں سے اٹی اور پھولوں کے پودوں سے ڈھکی ہر قسم کی قبریں تھیں۔ کچھ کو اپنے اندر مکین سموئے عشرے بیت گئے تھے اور کچھ کے اوپر تازہ گلابوں کی پتیاں ابھی تک مہک رہی

تھیں۔

وہ ان قبروں کے قریب احتیاط سے گزرتا ہوا، ان پر درج کتبوں کو پڑھتا جا رہا تھا۔

"بھائی صاحب! یہاں ایک جنازہ آنا تھا ایک بجے، ابھی تک آیا نہیں؟"

اسے ایک قبر کھودنے کی تیاری کرتا ہوا گورکن نظر آیا تو اس سے جا کر پوچھا۔

"کس کا جنازہ آنا تھا؟" گورکن نے کدال روکتے ہوئے اُلٹا اس سے سوال کیا۔

اس نے نام بتایا تو گورکن کدال ایک جانب رکھ کر پھیکی مسکراہٹ سے اپنا سر جھٹکتے ہوئے کہنے لگا:

"ارے! بھلا اُس عجیب انسان کا جنازہ یہاں کیوں آتا؟ ہمارے ہاں تو ویسے ہی اس کی اجازت نہ دی جاتی۔ یہاں ایسے لوگوں کی قبریں نہیں بن سکتیں، بھائی صاب! یہ سوہنے رب کے سوہنے بندوں کا قبرستان ہے۔"

گورکن کا جواب سن کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ اس کے حلق میں جیسے اٹک گئے تھے۔ اس سے شاید غلطی ہوئی تھی۔ وہ اپنے مطلوبہ جنازے کو اِس قبرستان میں ڈھونڈ رہا تھا حالانکہ اُس کو یہاں ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔

"آپ شاید نئے ہیں یہاں....، یا پہلی دفعہ آئے ہیں؟" گورکن نے اسے مشکوک نظروں سے گھورا۔

"جی، میں پہلی دفعہ یہاں آیا ہوں لیکن.... لیکن براہ کرم.. میری تلاش کا سن کر آپ میرے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔"

اس نے پھیکی مسکراہٹ سے گورکن کا شک دور کرنے کی کوشش کی۔ پھر خود تھوڑا سنبھل کر دوبارہ گویا ہوا:

"آپ اس جنازے کے بارے میں بتا رہے تھے۔"

گورکن کچھ ثانیے تو اسے گھورتا رہا، پھر قبرستان کے شمال کی جانب اشارہ کرکے کہنے لگا:

"آپ قبرستان کے گیٹ سے باہر نکلیں اور جنگلے کے ساتھ ساتھ چلتے جائیں۔ کچھ فرلانگ کے فاصلے پر آپ سیدھے ہاتھ مڑ جائیں، وہاں جھاڑی کے قریب میں ایک چھوٹا سا پلاٹ ہو گا، بس وہیں پر وہ جنازہ آئے

گا۔“

اتنا کہہ کر گورگن قبر کھودنے میں مشغول ہو گیا تو وہ ’شکریہ‘ کہہ کر گورکن کے بتائے ہوئے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ایک عجیب سا احساس تھا جو اس کے ہر اٹھتے قدم کے ساتھ اس کے دل پر بوجھ ڈالتا جا رہا تھا۔اس کے قدم جیسے من من بھاری ہوتے جا رہے تھے۔

”واپس پلٹ جاؤ.....“دل نے اسے جھنجھوڑا تھا۔

”نہیں، میں ان کی قبر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

دل کو جواب دیتے ہوئے وہ احتیاط سے ایک ٹوٹی قبر کے قریب سے گزرا تھا جو زمانے کے نشیب و فراز سہتی ہوئی اب ڈھے چکی تھی اور صرف ایک ٹوٹا ہوا کتبہ نظر آرہا تھا۔چوہدری جلال، تاریخِ وفات 1951ء...چوہدری جلال کا کتبہ باقی تھا۔جلال باقی نہ تھا! ہر جلال کو زوال ہے، صرف اللہ کی ذات پر جلال ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔

وہ قبرستان کا گیٹ عبور کر کے جنگلے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔چلتے چلتے وہ جنگلے کے دوسری طرف قبرستان میں موجود قبروں کو بھی دیکھتا جا رہا تھا۔یادوں کی ایک پٹاری اس کے دماغ میں کھل چکی تھی۔

”وہاں کچھ نہیں ہے تمہارے لیے.....“دل نے ایک دفعہ پھر اسے روکنے کی کوشش کی۔

”مجھے معلوم ہے، وہاں کچھ بھی نہیں ہے، سوائے عبرت کے.....اور میں عبرت کے لیے ہی جا رہا ہوں۔“

وہ گلاب کی پتیوں سے مہکتی ایک نئی قبر کے قریب سے گزرا، جہاں ایک چادر میں لپٹی ایک عورت قبر کے اوپر جھکی سسکیاں لے رہی تھی اور اس کے ساتھ ایک چار پانچ سال کا بچہ سہمی اور الجھی ہوئی نگاہوں سے اس عورت کو دیکھ رہا تھا۔قبر کے کتبے پر درج تھا:

محمد کفیل....تاریخِ وفات 1995ء......گویا اسے وفات پائے ابھی تین چار سال ہوئے تھے۔اس نے دل ہی دل میں جنگلے کے اُس پار سے محمد کفیل کے لیے دعائے مغفرت کی اور آگے بڑھ گیا۔جس نے کفالت کرنی تھی، وہی چلا گیا تھا، ہر وقتی سہارے نے جانا ہے، صرف اللہ بہترین کفالت

کرنے والا ہے۔اس کے ہاتھوں کی ہتھیلیاں پسینے میں ڈوبنے لگیں۔

''اس پلاٹ نما قبرستان جانا ضروری ہے کیا؟'' دل نے ایک دفعہ پھر احتجاج کیا۔

''ہاں، بہت ضروری ہے، میرے لیے، میرے ارد گرد موجود لوگوں کے لیے، میری آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے....''

اس نے دل کو جواب دیا اور پگڈنڈی پر احتیاط سے چلنے لگا۔ابھی دو قدم ہی اُٹھائے تھے کہ اسے ہوا میں ناگوار سی بو کا احساس ہوا۔اس نے منہ بناتے ہوئے ناک سکیڑی اور چلتا رہا لیکن جیسے جیسے وہ پلاٹ کے قریب آتا جا رہا تھا، ہوا میں ناخوشگوار سی بُو کا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔پگڈنڈی ٹوٹی ہوئی اور ویران سی تھی، تڑخی ہوئی، دراڑوں سے بھری ہوئی، جیسے وہاں کسی کی آمد و رفت نہ ہوتی ہو۔اس کے آخر میں مقبرہ موصیان تھا! محض پانچ چھے مرلے کا قبرستان...! جہاں ہر سو عجیب سی وحشت طاری تھی، خوف تھا، پُراسراریت تھی، نحوست ہی نحوست تھی۔

جیسے ہی وہ وہاں پہنچا، ٹھٹک کر رک گیا۔وہاں ایک کھدی ہوئی قبر کے قریب ہی کفن میں لپٹی ہوئی ایک میت رکھی ہوئی تھی اور اس کے گرد دس پندرہ افراد سر جھکائے کھڑے تھے۔وہ اس کی آمد سے انجان تھے۔ایسی وحشت اُس نے اپنی زندگی میں اس سے قبل نہیں دیکھی تھی۔اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔جسم پر لرزا طاری ہو چکا تھا۔

....☆....

"اوئے مراد! بھئی سالن میں نمک ضرور چکھ لینا۔ کل بھی آلو گوشت میں نمک زیادہ تھا۔ سارا مزا ہی کر کرا ہو گیا تھا۔"

شوکت نے ڈیرے کے احاطے میں داخل ہوتے ہی آواز لگائی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پودے سے توڑا ہوا تازہ کھیرا تھا۔ وہ احاطے کے ایک جانب لگے نلکے کی جانب بڑھ گیا۔

"جی جی شوکی بھائیا! میں نے آج خوب دھیان سے سالن پکایا ہے۔ کل تو بس مامے بشیر سے تھوڑی منہ ماری ہو گئی تھی، اس لیے مجھ سے سالن بنانے میں غلطی ہو گئی۔ بس ابھی تندور گرم ہو جائے تو روٹیاں بھی لگاتا ہوں۔"

مراد نے کندھے پر رکھے صافے سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے تندور کے نیچے جلتی بھڑکتی لکڑیوں کو ہلایا۔

" تیری تو ہر دوسرے تیسرے بندے سے منہ ماری ہو جاتی ہے، اس میں ہمارا یا مالک کا کیا قصور؟"

شوکت نے ایک ہاتھ سے نلکے کو گیڑتے ہوئے، پانی کی آتی بوچھاڑ میں دوسرے ہاتھ سے کھیرا دھوتے ہوئے کہا۔

"نمک حرامی نہ کیا کر، اپنا کام کیا کر"!

اس کی بات کے جواب میں مراد نے ڈھیٹ بن کر بس دانت نکوسے۔ شوکت نے کھیرا دھونے کے بعد اسے ایک دو دفعہ چھٹکا دیا، پھر منہ سے اسے توڑ کر چباتے ہوئے چولہے کی طرف بڑھا۔ کچے چولہے پر ایک دیگ رکھی ہوئی تھی جس کے نیچے ایک موٹی لکڑی ابھی بھی ہلکی ہلکی سی سلگ رہی تھی۔

شوکت نے کھیرے کا ایک اور ٹکڑا چباتے ہوئے دیگ کا ڈھکن ہٹایا۔ دیگ کے اندر سرخ تری والے شوربے میں تیرتی گوشت کی موٹی موٹی بوٹیوں کے اوپر سبز دھنیے، ادرک کی پتلی کترنیں اور باریک ہری مرچیں دیکھ کر اِس کا دل خوش ہو گیا۔

"مرادے! سالن کی شکل وصورت اور خوشبو تو بڑی اچھی ہے بھئی! اگر ذائقہ بھی ایسا ہی سوادا ہوا تو مزا ہی آجائے"!

"فکر ہی نہ کرو شوکی بھرا! آج تو انگلیاں چاٹنی ہیں سب نے۔ دیکھنا تو سہی!" مراد نے خوش ہو کر کہا۔

مراد دراصل اس گھرانے کا بہت پرانا ملازم تھا۔ شاید لڑکپن ہی سے وہ اِدھر چلا آیا تھا۔ شاہ جی کے گھر میں اسے بہت عزت ملی تھی۔ اسے کبھی نوکر نہیں سمجھا گیا تھا۔ شفاف رنگت... تیکھی ناک.. چمکدار آنکھیں... لمبوترا دھڑ اور دھان پان سا وجود... مراد واقعی اپنی جسامت کے عین مطابق ہر کام میں پھرتیلا، باتونی اور کافی حد تک چست وچالاک ثابت ہوا تھا۔ جب کہ اس کے برعکس شوکت عرف شوکی کو اس گھر میں ملازمت کرتے ہوئے ابھی چند سال ہوئے تھے۔

شوکی چوڑے وجود اور گہری گندمی رنگت کا حامل شخص تھا۔ جس کے سر پر لمبے بال اور بڑی بڑی مونچھیں اس کے نرالے شوق کا پتا دیتی تھیں۔ مراد کے مقابلے میں شوکی تھوڑا سست مگر پیٹو واقع ہوا تھا۔ بہر حال دونوں کو شاہ جی کے ہاں برابر عزت واحترام میسر تھا۔ مزے مزے کے کھانے پکانا جہاں مراد کا کام تھا، تو وہیں مہمانوں کی آؤ بھگت کرنا اور انھیں ہر طرح کا آرام مہیا کرنا شوکت کی ذمہ داری تھی۔

مراد اب خمیر لگے آٹے کے بڑے بڑے پیڑے بنا رہا تھا۔ کھیرا کھاتے کھاتے شوکت نے ڈھکن

دیگ پر رکھا اور کچھ لمحوں میں وہ پلٹا ہی تھا کہ اسے کچھ انہونی کا احساس ہوا۔ جیسے اس کے حلق میں کچھ پھنس گیا ہو۔ مراد اپنی ہی دھن میں اس کی جانب پشت کیے، کام میں مگن بولے جا رہا تھا۔

''ویسے سچ بتاؤں شوکی بھرا!..... میں کیا اور میرا ہنر کیا، یہ سب تو ہمارے بڑے صاب شاہ جی کی مہربانی ہے۔ اللہ انہیں لمبی حیاتی دے، ان کے ڈیرے کو پھلتا پھولتا رکھے۔ آج کے زمانے میں کون ایسے اپنی کمی کمینوں کا کرتا ہے۔''

شوکت نے اپنا گلا کھنکھار کر حلق صاف کرنا چاہا، مگر اکوشش کے باوجود وہ کامیاب نہ ہوا۔

''اور وہ بھی مجھ جیسا کمی کمین، جس کے نہ آگے کوئی، نہ پیچھے..... بس اللہ کے بعد شاہ جی کی ہی مہربانی کا آسرا تھا جو مجھے اس ڈیرے تک لے آیا۔ کہاں وہ اتنے پڑھے لکھے، اتنے کھلے دل اور کھلے ہاتھ کے بندے اور کہاں میں چٹا ان پڑھ، گنوار.....'' مراد اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا۔ اس نے پیڑے کو ہاتھ پر مار مار کر بڑا کیا، پھر اسے کپڑے کی ایک گدی پر پھیلایا اور اس گدی کو پھرتی سے تندور کی اندرونی دیوار پر مارا۔

تندوری روٹی دیوار سے چپک گئی تھی۔ مراد نے گدی باہر نکالی اور دوسرے پیڑے کو ہاتھوں پر گھمانے لگا۔

اِدھر شوکت نے ابھی تک دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا تھاما ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں درد کی اذیت سے باہر کو نکل آئی تھیں۔ اس نے کھینچ کھینچ کر بمشکل ایک سانس لیا، لیکن اس کے رک رک کر آتے سانس کی آواز چٹختی اور سلگتی لکڑیوں سے گزر تک مراد تک کیسے آسکتی تھی بھلا!!

''میرے اندر ہے کیا جو شاہ جی میرا اتنا خیال کرتے ہیں.... بس یہی کہ اللہ نے ہاتھ میں تھوڑا بہت سواد رکھا ہوا ہے، لیکن اندر کی بات مجھے پتا ہے کہ شاہ جی بڑی عزت والے ہیں شوکت بھرا! دوسروں کی عزت انہیں بڑی پیاری ہے تبھی تو مجھے کام پر لگا دیا ورنہ میں بھی سڑکوں پر رُل رہا ہوتا.... مجھے سڑک سے اٹھا کر انہوں نے باعزت ہنر پر لگا دیا اور اوپر سے میرے کام کی اتنی تعریف کرتے ہیں کہ میں حیران ہی ہو جاتا ہوں۔ جسے پوری دنیا نے کبھی منہ نہ لگایا، اس میں بھی کچھ تعریف کے لائق ہو سکتا ہے؟ میں ٹھیک کہہ

رہا ہوں ناں شوکت بھرا؟''

مراد نے اپنے دھیان میں دوسری روٹی تندور کی اندرونی دیوار پر لگا کر گدی واپس نکالی، پھر اپنی بات کی تصدیق کے لیے تائیدی نظروں سے پیچھے مڑ کر شوکت کی جانب دیکھا جو زمین پر گرا، دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا تھامے تڑپ رہا تھا۔

''شوکت بھائیا.....ارے شوکت بھرا....!'' مراد چیخ کر اس کی جانب لپکا تھا۔

''کیا ہوا تجھے شوکی...! ارے کوئی ہے ادھر.... ذرا بھاگ کر آئیے۔'' مراد تندور سے اٹھ کر شوکی کی طرف بھاگا۔ اُس نے شوکی کا وجود اپنے دونوں بازوؤں پر منتقل کر لیا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ آوازیں بھی لگا رہا تھا۔ پھر کسی کو قریب نہ پا کر وہ بھاگا اور احاطے کے اندر کھلنے والا حویلی کا گیٹ دھڑ دھڑانے لگا۔ کچھ لمحوں بعد اندر سے مالکن کی آواز اُبھری:

''کیا بات ہے شوکی؟ مراد..؟ کون ہے بھئی؟''

اتنے میں باہر والا گیٹ کھلا اور شاہ جی کا ڈرائیور گاڑی لیے احاطے میں داخل ہوا۔ سامنے مراد کو ہانپتا کانپتا دیکھ کر وہ بھی حیران رہ گیا۔ پھر دوڑتے ہوئے وہ اُن دونوں کی طرف لپکا۔

''ارے.. کیا ہوا شوکی کو..؟ تم لوگوں نے صاحب جی کو بتایا؟ مجھے لگتا ہے اِسے دورہ پڑا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے ڈرائیور شبیر احمد جلدی سے شوکی پر جھک گیا۔ پھر تیزی سے اس نے مراد کی مدد سے شوکی کو اپنے کندھوں پہ لادا اور تقریباً بھاگتے ہوئے اسے گاڑی میں ڈال کر وہ اسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔ زنان خانے کے دروازے سے مالکن یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ جھٹ سے بھاگی دوڑی ٹی وی لاؤنج میں پہنچی، پھر تیزی کے ساتھ اس نے فون سیٹ سے کالج کا پی ٹی ایل نمبر ڈائل کیا... تیسری بیل پر کسی نامعلوم نے فون ریسیو کیا تھا:

''ہیلو... شعبہ اردو کے پروفیسر سید اصغر علی شاہ سے بات کروائیے جلدی... میں اُن کی بیوی بول رہی ہوں۔ ایمرجنسی ہے۔''

''جی بہتر... ہولڈ کیجیے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ پھر کچھ دیر بعد وہی آواز دوبارہ گونجی:

"میڈم! کالج کو چھٹی ہو چکی ہے۔ شاہ جی تو گھر روانہ ہو گئے ہیں اپنے دوست پروفیسر کے ساتھ۔"

"اوہو.... اب میں کیا کروں؟" شاہ جی کی بیگم نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"میڈم! معاملہ کیا ہے؟ آپ ہمیں بتایئے۔ کیا پتا وہ ابھی زیادہ دور نہ گئے ہوں۔ ہم آپ کا پیغام پہنچاسکے تو ضرور یہ کام کریں گے۔"

"ہمارے گھریلو ملازم شوکت کی اچانک طبیعت بگڑ گئی ہے۔ ڈرائیور شبیر احمد اسے گاڑی میں سرکاری اسپتال لے کر گیا ہے شاید۔"

پروفیسر اصغر شاہ کی بیوی نے تفصیل بتائی تو دوسری طرف سے 'جی اچھا' کہہ کر فون رکھ دیا گیا۔

فون سننے والے نے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر جلدی سے ایک چپڑاسی کے ہاتھ پروفیسر صاحب کے لیے پیغام بھیجا۔ اتفاق سے وہ ابھی کالج گیٹ سے باہر نکلے ہی تھے کہ پیغام رساں نے اُنھیں جالیا۔ پیغام سنتے ہی شاہ جی نے اپنے پروفیسر دوست مجیب الرحمن کو گاڑی اسپتال کی جانب موڑنے کا کہا اور اپنی نرم طبیعت کے باعث خود شوکی کے لیے دل ہی دل میں دعائے خیر کرنے لگے۔

اُدھر اسپتال پہنچتے ہی ایمر جنسی وارڈ میں ڈاکٹرز نے شوکت عرف شوکی کو بیڈ پر اُلٹا لیٹا کر اسے دو چار جھٹکے دیے، ساتھ ہی پانی کے ساتھ قے والی ایک گولی بھی اُسے دکھلادی۔ چند لمحوں میں قے ہوئی، کھیرے کا ایک ٹکڑا شوکی کی سانس والی نالی سے نکل کے زمین پر آرہا۔ شوکی نے لمبی لمبی سانسیں لے کر اپنے جسم میں موجود آکسیجن کی کمی کو بحال کرنا چاہا۔

"شاباش جوان! ہمت کر..! کچھ نہیں ہوا!" شاہ جی نے اسپتال کے ایمر جنسی وارڈ میں پہنچتے ہی اس کا کندھا تھپتھپایا تھا۔

"جی شاہ جی....! اب میں ٹھیک ہوں۔" شوکت نے گلا کھنکھارا اور کپڑے درست کرتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"شکر ہے اللہ کا.... اور مراد ے!! بات سنو!" انہوں نے مراد کی جانب دیکھا۔

"کیا ہوا تھا...؟" شاہ جی نے پوچھا تو مراد نے پوری تفصیل انھیں بتادی۔ شاہ جی نے اس کے

کندھے پہ ہاتھ رکھا اور کہنے لگے:
"بھئی جب کسی کے گلے میں کچھ پھنس جائے تو چیختے ہوئے اِدھر اُدھر نہیں بھاگتے، اس کی کمر پر زور زور سے ہاتھ مارتے ہیں"!

"جی شاہ جی...، اگلی دفعہ اسی طرح کروں گا!" مرادنے کھسیانا ہو کر سر کھجایا تو اصغر شاہ مسکرا دیے۔
"یعنی شوکت کو دوبارہ اپنے حلق میں کچھ پھنسانا پڑے گا"!!
"نہیں نہیں شاہ جی...! شوکی بھرا تو اپنا جگر ہے!" مرادے نے فوراً سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

تب تک شوکت اپنے آپ کو مکمل طور پر سنبھال چکا تھا۔
"شکریہ شاہ جی...! آپ یہاں پہنچ گئے تو دل کو حوصلہ ہوا ہے۔"
"میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ تو بس اللہ کا فضل ہے، لیکن پھر بھی ڈاکٹر صاحب سے کچھ مزید ہدایات لے لیتے ہیں۔ کوئی زیادہ مسئلہ نہ ہو گیا ہو۔"

شاہ جی نے کہا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ڈاکٹر کو تلاش کرنے لگے۔ اس دوران انھوں نے مراد اور ڈرائیور شبیر احمد کو رکشے میں بیٹھ کر جلدی سے گھر پہنچنے کا کہہ دیا تاکہ باقی سب لوگوں کے گھر پہنچنے سے قبل وہ دوپہر کے کھانے پینے کا بندوبست کر لیں۔

مرادنے قریب کھڑے رکشے والے سے کرایہ طے کیا اور گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ جب کہ شاہ جی ڈاکٹر ز کو کہہ کر اپنے دوسرے ملازم شوکت کا تسلی بخش چیک اپ کروانے لگ گئے۔

شاہ جی نا صرف گھر والوں بلکہ اپنے عزیز و اقارب اور محلے والوں کے لیے بھی کسی فرشتے سے کم نہ تھے۔ ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں، جو دل سے انسانیت کا درد محسوس کریں۔ یہ لوگ ہر وقت دوسروں کے لیے مسکراہٹیں اور خوشیاں بکھیرنے کا کام سرانجام دیتے ہیں۔

سرخ و سپید سا چمکتا ہوا چہرہ اور اس پر کالی سفید خشخشی ڈاڑھی...، مسکراتی آنکھوں اور لمبے قد کے ساتھ ساتھ کسرتی بدن کے حامل شاہ جی کی شخصیت ایسی وجیہہ تھی کہ دیکھنے والا انھیں رشک کی نگاہ سے

دیکھتا۔

اکثر اوقات وہ شلوار کرتے کے اوپر واسکٹ اور پشاوری سینڈل کا استعمال کرتے تھے۔ دونوں ہاتھوں کی ایک ایک انگلی میں چمکدار انگوٹھیاں، سر پر سفیدی مائل سیاہ گھنے بال انھیں باقی سب سے الگ سا انسان بناتے تھے۔ ویسے بھی ان کے شوق سب سے جدا اور منفرد ہی تھے۔

اپنے ملازموں سے ان کا رویہ سگے بیٹوں جیسا ہوتا تھا۔ ان کے ڈیرے پر مفلوق الحال انسانوں اور بھوک کے مارے فقیروں اور عام انسانوں کا رش لگا رہتا تھا۔ وہ جس طرح لاچار اور غریب انسانوں کی خدمت پر کمربستہ رہتے تھے، اللہ تعالیٰ بھی انھیں اسی قدر مزید نوازتا تھا۔ ویسے بھی ان کا حلقہ یاراں بہت وسیع تھا، ان میں علم وادب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی اکثریت ہوتی تھی۔

.....☆.....

"ہیا.... ہیا.... شاواشے"!!!

بابا اسحاق سڑک پر اپنے تانگے کو بھگائے جارہا تھا۔ گھوڑے کے ٹاپوں سے پکی سڑک کا وجود لرز رہا تھا۔ لکڑی کے ڈھانچے پر نرم پوشش کی نشستوں کے آگے چمڑے کی بنی ایک نشست پر منحنی سی سفید داڑھی والا بابا اسحاق بیٹھا تھا۔ اس کے ہنکارنے پر تانگے کے آگے جُتے سیاہی مائل گھوڑے نے مزید سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا تھا۔

"او بابا! خیر ہووئے"!!

اکرم اپنی دکان کے آگے پانی کا چھڑکاؤ کر رہا تھا، جب اس نے تانگے کو تیزی سے سڑک پر بھاگتے دیکھا۔

"خیر ای اے، خیر اے"!

اس کے قریب سے تیزی میں گزرتے بابا اسحاق نے ہاتھ ہلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

بابا اسحاق کا تانگہ گھوڑا پورے علاقے میں مشہور تھا۔ اسے جہاں بھی کوئی بلاتا، وہ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے فوراً پہنچ جاتا تھا۔ بھاڑے پہ سواریاں ڈھونا اس کا پیشہ تھا اور پیٹ کی مجبوری بھی۔ آج اُسے گاؤں کے نمبر دار کے ہاں آنے والے مہمانوں کو لینے اسٹیشن جانا تھا۔ اس نے نمبر دار کو زبان دی تھی کہ وہ گیارہ بجے

مہمانوں کو اسٹیشن سے لے آئے گا۔

مگر پھر وہ دوسری سواریوں کو ان کی منزل تک پہنچاتے پہنچاتے کچھ تاخیر کا شکار ہو گیا تھا۔ چوک سے گزرتے ہوئے اس نے گھڑیال پر نظر ڈالی۔ ٹرین کی آمد میں بس چند منٹ باقی تھے۔

"شاباشے کالو! آج تو ہوا میں اُڑ رہا ہے تُو! ریل گڈی آنے میں دس منٹ رہتے ہیں ابھی۔ بس ایک دفعہ اپنے ٹیم پر اسٹیشن پہنچ جائیں، پھر تجھے خوب چارہ کھلاؤں گا۔" اس نے اپنے گھوڑے کو چابک رسید کرتے ہوئے کہا تھا۔

کالو نے بھی جواب میں ہنکارا بھرا۔ دونوں اپنے ہی جوش میں بڑھتے جا رہے تھے کہ بابا اسحاق کو لگام کھینچنا پڑی۔ سامنے سڑک پر ریل پھاٹک بند تھا اور دو منٹ بعد وہاں سے اسی ریل گاڑی نے گزر کر اسٹیشن پہنچنا تھا جس میں بابا اسحاق کی سواریاں موجود تھیں۔

"اُلو کے....." بابا اسحاق نے پھاٹک والوں کو ایک عدد گالی سے نوازا۔ اس کا سارا منصوبہ خراب ہو گیا تھا! کیا جاتا اُن کا اگر وہ بابا اسحاق کا تانگہ گزر جانے پر پھاٹک بند کر دیتے!!! اب تین چار منٹ وہاں پھاٹک پر انتظار کرنے کے بعد ٹریفک کے اژدہام میں سے گزر کر تانگے کا وقت پر اسٹیشن پہنچنا تقریباً ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔

"یہ تو ہیں ہی سدا کے نامرادے اور کم بخت...!' بابا اسحاق گھوڑے کی لگامیں کھینچے بس پھاٹک والوں کو صلواتیں سنائے جا رہا تھا، سو وہ یہی کام کر رہا تھا۔ اس کے ارد گرد بھی دیگر لوگ بے زار صورت لیے ریل گاڑی کے گزرنے کے انتظار میں تھے۔

جتنی بے زاری ان کے چہروں پر تھی، اتنی ہی خوشی اور تجسس ان کے ساتھ آئے بچوں کے چہروں پر تھی جو بہت اشتیاق سے ریل گاڑی کو دیکھنے کے منتظر تھے۔ اللہ اللہ کر کے ریل گاڑی گزری، اور پھر پھاٹک کھول دیا تھا۔ سبھی کو اپنی اپنی منزل پر پہنچنے کی جلدی تھی اس لیے کوئی بھی کسی کو رعایت دینے کو تیار نہیں تھا۔ باوجود کوشش کے، بابا اسحاق اپنے تانگے کو تیزی سے وہاں سے نکال نہیں سکا، اور جب تک وہ اسے وہاں سے نکال کر ریل اسٹیشن پہنچا، ریل گاڑی کو وہاں سے روانہ ہوئے دس منٹ گزر چکے تھے۔

" ماریا گیا بھئی ساکو پُتری..... نمبر دار جی کی سواریاں اب تجھے ڈھونڈ رہی ہوں گی۔ "

وہ قدرے غصے سے اپنی ران پر چابک مارتے ہوئے بڑبڑایا۔ پھرتی سے اس نے تانگے کو ایک جگہ روک کر باندھا اور خود رش میں مہمانوں کو تلاش کرنے لگا۔ اتنے جم غفیر میں مطلوبہ فرد کو ڈھونڈنا بھی مشکل کام تھا۔ ابھی وہ گھبراہٹ کے مارے ادھر اُدھر دیکھتا ہوا تیز تیز چل رہا تھا کہ اچانک اس کے کندھے پر کسی نے اپنا بھاری بھر کم ہاتھ رکھا۔

"کدھر بھاگا جا رہا ہے بابا اسحاق....؟" بابا اسحاق عرف ساکو ہڑبڑا کر مڑا اور دیکھا، تو وہاں نمبر دار کے مہمان یعنی ان کے چھوٹے بھائی چودھری خورشید اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ کھڑے مسکرا رہے تھے۔

"اوہ، سلاما لیکم چودھری صاب! ست بسم اللہ! میں آکھیا، جی آیاں نوں..."!!

بابا اسحاق نے انہیں عجلت میں سلام کیا اور خوش آمدیدی کلمات کہتے ہوئے ان کا سامان اٹھانے کے لیے آگے بڑھا۔

" رکو بابا اسحاق! میں اُٹھالیتا ہوں۔" چودھری صاحب نے اسے منع کیا لیکن بابا اسحاق نے ان کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے ایک بیگ اپنے سر پر جبکہ باقی دونوں بیگوں کو ایک ایک ہاتھ میں اٹھایا اور تانگے کی جانب چلنے لگا۔

"ایسے کیسے چودھری صاب! اتنے عرصے کے بعد گاؤں آئے ہیں، کچھ ہمیں بھی خدمت کا موقع دیں سرکار۔"

تانگے کے پاس پہنچ کر بابے اسحاق نے سامان کو تانگے میں سیٹ کیا اور مہمانوں کے سوار ہونے پر تانگے کو نمبر دار کی حویلی کی طرف جانے والے راستے پر ڈال دیا۔ سرخ اور سفید جھالروں سے سجا اس کا تانگا اور بھاگتے سموں کی آواز کے ساتھ اس کے ساہی مائل گھوڑے کی کالی چمکتی رنگت تارکول کی سیدھی سڑک پر سب سے زیادہ نمایاں لگ رہے تھے۔

"تم اور تمہارا تانگہ.....ابھی بھی پہلے جیسے چست اور پھرتیلے ہو۔"

چودھری خورشید نے تانگے کے ہچکولوں اور کھلی ہوا کے مزے لیتے ہوئے مسکراتے ہوئے بابے اسحاق سے کہا، تو وہ بھی گھوڑے کو چابک رسید کرتے ہوئے مسکرایا: ''چودھری جی! تانگہ لہور دا ہووے تے بھانویں جھنگ دا، او تانگے والا خیر منگدا......''

''ہاہاہا..... صحیح کہا بھئی صحیح کہا تُونے۔'' چودھری نے ہنستے ہوئے سر ہلایا تھا۔

جلد ہی تانگہ نمبر دار کی حویلی کے سامنے پہنچ گیا۔ بابے اسحاق کی اس مہمان نوازی کا اسے خوب صلہ ملا، ملنا بھی چاہیے تھا۔ اس کے کرائے کے پیسے تو نمبر دار جی نے ادا کر دیے تھے مگر اُن کے چھوٹے بھائی چودھری خورشید نے خوش ہو کر سو سو روپے کے دو کڑکتے نوٹ بابا اسحاق کی ہتھیلی پر رکھ دیے تھے۔ ایک لمحے کے لیے تو بابا اسحاق جیسے حیرت کا بت بنا رہ گیا تھا۔

''چودھری صاب! یہ..... یہ کس لیے.... اتنی زیادہ رقم؟''

''بھئی انعام اکرام بھی تو ہونا چاہیے ناں!'' چودھری صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

''لیکن۔ کرایہ صرف چھے روپے بنتا ہے جی، اور یہ انعام تو بہت زیادہ ہے۔''

بابا اسحاق کی بات چودھری خورشید نے درمیان سے ہی کاٹ لی۔

'' بس بس..... کوئی بات نہیں۔ جتنا بھی ہے، تیرے بچوں کے لیے ہے۔''

بابا اسحاق نے حیرت اور خوشی سے چودھری صاحب کی طرف دیکھا اور پھر آسمان سے اُتری رحمت کی طرف۔ اسی کشمکش میں اس نے کانپتے ہاتھوں سے چودھری صاحب کا شکریہ ادا کیا اور کورنش بجالانے کے انداز میں سلامی دیتے ہوئے اُلٹے قدموں پلٹ گیا، اگلے ہی لمحے وہ ہنکار لگا کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا خوشی خوشی اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گیا تھا۔

.....☆.....

اسپتال سے واپسی پر شاہ جی نے ڈرائیونگ سیٹ خود سنبھال لی۔ اپنے پروفیسر دوست مجیب الرحمن کا شکریہ ادا کر کے انھیں روانہ کیا اور اپنی گاڑی سٹارٹ کر لی۔ شوکت عرف شوکی ان کے ساتھ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر تقریباً نیم دراز ہو چکا تھا۔

''شوکی پتر... تو چل کے اب کل تک آرام کرنا۔ ٹھیک ہے ناں؟''

''بس مالک... شرمندہ نہ کریں، اب تو ڈاکٹر نے بھی کہہ دیا ہے کہ میں ٹھیک ہوں۔'' اس پر شاہ صاحب نے مسکراتے ہوئے اسے حوصلہ دیا تھا۔

اسپتال سے گھر کا فاصلہ تقریباً آدھے گھنٹے کا تھا۔ شوکی ذرا بے چین سا تھا۔ آخر اس نے خود ہی خاموشی کو توڑا:

''شاہ صاجی... !'' شوکت نے شاہ صاحب کو پکارا تو وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''کہو شوکت، کیا بات ہے؟'' شاہ صاحب نے اس کی طرف دیکھا۔

''میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔'' شوکت بھرائے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔

''آپ مانیں یا نہ مانیں، یہ جو میں ابھی آپ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں، سانس لے رہا ہوں، باتیں کر رہا

ہوں، یہ سب آپ کی وجہ سے ہے۔آپ کو یاد ہے کہ میں حالات سے مایوس ہو کر خود کشی کرنے نکلا تھا۔مگر اللہ نے آپ جیسے رحم دل بندے سے ملوادیا۔ہمارے لیے تو آپ فرشتہ ہیں جی فرشتہ...!ورنہ میں نے وہیں ایک منٹ میں مر جانا تھا اور میرے پیچھے بس میری بہنوں اور ماں نے ساری زندگی روتے رہ جانا تھا۔''اس نے بولتے ہوئے ایک ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھے۔

''جھلا نہ ہو تو..!''شاہ صاحب نے پیار سے اس کی ران پر ہاتھ مارا۔

''اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔بس اللہ نے مجھے وسیلہ بنا دیا تھا۔اور وہ انسان ہی کیا جو دوسروں کے کام نہ آسکے۔

چلو اب میں گاڑی کی تھوڑی سپیڈ بڑھاتا ہوں، بڑی بھوک لگ رہی ہے۔پتا نہیں مراد نے آج کیا پکایا ہو گا۔''

انہوں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔شوکت نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا دیا۔

''آلو گوشت بنایا تھا اس نے....بلکہ شاہ جی!مراد تو ڈینگیں مار رہا تھا کہ سالن آج بہت لذیذ بنا ہے۔سب لوگ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔''

اس پر شاہ جی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

''بھئی اونگا بونگا سا ہے وہ، لیکن....ہے وہ بڑا محنتی.....''

شاہ جی نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔اچانک ان کی نظر سڑک کنارے ایک نوجوان پر پڑی جو پسینے میں شرابور چلتا ہوا جا رہا تھا۔انھوں نے نوجوان سے تھوڑا آگے جا کر گاڑی روک دی۔

''شوکی!!اس نوجوان کو دیکھنا ذرا.....''شاہ جی کے کہنے پر شوکت نے گردن موڑ کر نوجوان کو دیکھا۔اپنی سوچوں میں گم، بے زار صورت لیے یہ نوجوان چلا آرہا تھا۔جیسے ہی اس نے اپنے آگے ایک گاڑی کو رُکتے دیکھا تو چونک گیا۔وہ پچیس چھبیس سال کا دھان پان سا نوجوان تھا جس کے تن پر عام سا لباس اور چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔اس نے ایک ہاتھ میں فائل پکڑی ہوئی تھی۔

''السلامُ علیکم بیٹے....!''نوجوان جیسے ہی گاڑی کے قریب آیا تو شاہ صاحب نے کھڑکی کا شیشہ نیچے

کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"وعلیکم السلام..." اس کے چہرے پر الجھن اور حیرت تھی۔

"کدھر جا رہے ہو؟ آؤ، میں چھوڑ آؤں۔" شاہ صاحب نے اسے پیشکش کی۔

"نہیں نہیں جناب..! میں چلا جاؤں گا۔ آپ کا بہت شکریہ۔" نوجوان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"اتنی گرمی میں پیدل جا رہے ہو، پسینے میں ڈوبے ہوئے ہو۔ آجاؤ بھئی، ڈرو نہیں۔ میں سرکاری کالج میں شعبہ اردو کا پروفیسر ہوں، اس کے علاوہ شہر کے مشہور برائٹ فیوچر اسکول کا مالک بھی۔ تمہیں جہاں جانا ہو گا، ہم چھوڑ دیں گے۔ آجاؤ...."

شاہ جی کے پُر زور اصرار پر نوجوان نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا، پھر سڑک کے اطراف میں جہاں ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ ایسے میں گاڑی کے مفت سفر کی پیشکش اسے غیبی مدد محسوس ہوئی۔ اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا تو شاہ جی نے ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی جگہ کی طرف اشارہ کیا... تب وہ نوجوان گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"بیٹے! تمہارا نام کیا ہے؟ مجھے تو سید اصغر شاہ ہیں اور یہ شوکت ہے۔" شاہ صاحب نے چہرہ اس کی طرف موڑ کر کہا۔

"جی....، نام تو امی ابو نے کچھ اور رکھا تھا، مگر بچپن ہی سے مجھے دوست اور گھر والے سب پیار سے منگلا کہہ کر بلاتے تھے۔ سو آج بھی میں اسی نام سے جانا جاتا ہوں۔ مجھے بھی اپنے لیے یہ نام پسند ہے۔"

"منگلا...؟ بڑا منفرد نام ہے بھئی..!!" شاہ جی نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا:"اور کیا یہیں کے رہنے والے ہو؟"

"نہیں جناب...!! میں یہاں کا رہائشی نہیں، آپ کے شہر راولپنڈی میں ایک کورس کے سلسلے میں آیا تھا۔ جب کہ میرا اصل علاقہ چنیوٹ کا ضلع ہے۔"

نوجوان نے اپنا مختصر تعارف کروایا۔

''ارے تو یوں کہوناں کہ پردیسی ہو!''اصغر شاہ کے لہجے میں مزید اپنائیت آچکی تھی۔ منگلا مسکرا کر رہ گیا۔

''جی، پردیسی ہی سمجھ لیں۔ابھی ایک کام کے سلسلے میں بازار گیا ہوا تھا۔ وہیں سے واپسی ہو رہی ہے۔''

''تو پردیسیوں کو کھانا کھلانااور مہمان نوازی کرنا ہمارا فرض بنتا ہے.... بھئی شوکت..!اپنے ڈیرے کی طرف چلتے ہیں۔آج اللہ تعالیٰ نے ہمارے رزق میں ایک پردیسی کا رزق بھی اُتارا ہے۔''اصغر شاہ نے عاجزی سے کہا تھا۔

''نہیں نہیں شاہ جی....!ایسا نہ کریں۔خواہ مخواہ آپ کو زحمت ہو رہی ہے،مجھے بس راجہ بازار کے قریب اتار دیں،آگے میں خود ہی چلا جاؤں گا۔''

منگلا نے انہیں روکنا چاہا۔

''وہاں بھی اتار دیں گے،پہلے تھوڑا کھانا شانا،آرام وغیرہ کرلو۔''

اصغر شاہ نے اصرار کیا تو منگلا کو مجبوراً اان کی بات ماننا پڑی۔ تیکھے نین نقش والے منگلا کی آنکھیں نیلی اور رنگت قدرے شفاف تھی۔ گھنگریالے سیاہ بالوں نے اس کی شخصیت کو اور بھی الگ سی پہچان دی ہوئی تھی۔اس کا چوڑا ماتھا، ستواں ناک اوپر سے سنگل پسلی جسامت...وہ واقعی کسی کہانی کا کردار لگتا تھا۔اس کی سمجھ بوجھ اور چالاکی اسے مزید توجہ کے قابل بناتی تھی۔

دھیرے دھیرے سفر کرتے ہوئے وہ اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھے۔ بڑی سڑک سے اترتے ہی اصغر شاہ اب گاڑی کو اصغر ڈیرے کی طرف جانے والی سڑک پر اُتار چکے تھے۔آگے کا فاصلہ محض چند ساعتوں کا تھا۔

.....☆......

بابا اسحاق نے کالو گھوڑے کو تانگے سے نکال کر کھونٹے سے باندھتے ہوئے پیار سے اس کی پشت پر

ہاتھ پھیرا۔ جواباً گھوڑا خر خرایا اور پاؤں اُٹھا کر، سر کو ہلا کر مالک سے لاڈیاں کرنے لگا۔

''کالو پُتر.... ! لے اب تُو بھی کچھ دیر آرام کرلے۔ خوب بھاگا ہے ناں۔ آج تو میں نے تجھے کچھ زیادہ ہی چابک مار دیے، بس اب معافی دے دے بابے کو۔ پریشان تھا ناں، اس لیے مار دیے۔ اب نہیں ماروں گا۔'' مالک کے لہجے میں نرمی محسوس کر کے کالو نے بھی محبت سے اس کے کندھے سے اپنی تھوتھنی رگڑی۔

''لے..... آج تیرے لیے گڑ کی ڈلی بھی ہے۔ شاباش، کھالے۔''

بابا اسحاق نے ایک تھیلے سے گڑ کی ایک ڈلی نکال کر کالو کو کھلائی، پھر اس کی پیشانی کو پیار سے تھپتھپایا۔ اسی وقت گھر کا دروازہ کھلا اور بابے اسحاق کی بیٹی منال باہر نکلی اور گھوڑے کو سہلاتا دیکھ کر باپ کی طرف آ گئی۔

''سلام ابا! خیر ہے، آج بڑا پیار آرہا ہے کالو پر۔'' منال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جیوندی رہ دھیے! آج تو کالو نے کمال کر دیا..... میرا جی خوش کر دیا اِس بے زبان نے۔ چل، اندر چل، پھر بتاتا ہوں۔''

بابا اسحاق نے ایک بار پھر کالو کو تھپتھپایا اور بیٹی کے ساتھ گھر کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

''کھانا لاؤں ابا... ؟'' منال نے پوچھا۔

''ہاں دھیے! کھانا تو جلدی سے لے آ۔ بڑی بھوک لگی ہے۔ پھر بس اڈے کے لیے بھی نکلنا ہے۔''

بابا اسحاق نے نلکے پر ہاتھ دھوتے ہوئے کہا تو منال باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ چارپائی پر نیم دراز ہو کر آسمان پر اُڑتے کبوتروں کو دیکھتا ہوا بابا اسحاق سوچوں میں گم ہو گیا۔

منال، امداد اور جاوید، یہ تینوں کہنے کو تو بابا اسحاق کی اولادیں تھیں لیکن ان میں سے صرف منال ہی تھی جسے باپ کی فکر تھی۔ بڑے لڑکے امداد کو بوڑھے باپ اور جوان بہن سے زیادہ کُشتی اور کبڈی پیاری تھی اور چھوٹے جاوید کو کبوتر بازی۔ سارا دن امداد کبڈی کے میدان میں کشتی لڑتے ہوئے یا فیقے استاد کی دودھ کی دکان کے سامنے مکھن ملائی والی لسی چڑھاتے نظر آتا اور جاوید گاؤں کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ

کبوتر اُڑاتے اور مرغے لڑاتے ملتا۔

بابا اسحاق نے بہتیرا کہا کہ دونوں سدھر جائیں اور کسی کام پر لگیں تاکہ اس کی بوڑھی ہڈیوں کو آرام ملے اور بہن کی شادی کا جہیز جمع ہو لیکن دونوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی تھی۔ دونوں ہی جوان اور ہٹے کٹے تھے۔ بابا اسحاق کو اَڑیل گھوڑے کو سیدھا کرنا آتا تھا، لیکن اڑیل انسان کو سیدھا کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ تبھی دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر اس نے ساری امیدیں بیٹی سے وابستہ کر لی تھیں۔ منال جتنی حسین تھی، اتنی ہی ذہین بھی تھی۔ اماں کو اس کی پڑھائی سے کافی خار چڑھتی تھی، اس لیے اسے گھر کے کاموں میں لگائے رکھتیں۔ لیکن گھر کی ذمہ داریوں اور پڑھائی کے شوق نے اسے مزید محنتی بنا دیا تھا۔

ابا نے اس کا شوق دیکھتے ہوئے اسے کبھی پڑھائی سے منع نہیں کیا حالانکہ امداد اور جاوید نے بہت زور لگایا تھا کہ بس میٹرک کے بعد وہ گھر بیٹھے اور سلائی کڑھائی کر کے اپنا جہیز خود بنائے، لیکن بیٹوں کے سامنے بابا اسحاق بیٹی کی ڈھال بن گیا تھا۔

”خود تو تم دونوں نکمے ہو، مگر جو پڑھ لکھ کر کچھ بننا چاہتی ہے، اسے تو بننے دو! یہ پڑھے گی اور خوب پڑھے گی۔ میں دیکھتا ہوں میرے جیتے جی اسے کوئی کیسے روکتا ہے۔ جسے اس کی پڑھائی سے مسئلہ ہے، وہ اپنا بوریا بستر اُٹھائے اور گھر سے دفع ہو جائے“!

بابا اسحاق کے غصے کے سامنے اماں اور بھائیوں کی ایک نہ چلی اور منال کو ساہیوال شہر کے بڑے کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ اسے قدم قدم پر اپنے باپ کا ساتھ میسر تھا، اس کی امتحانی کارکردگی شاندار تھی۔ اس تعلیمی سفر میں بابا اسحاق اور اس کے تانگے نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ ہر صبح وہ بیٹی کا تانگے پر بٹھا کر کالج چھوڑتا اور دوپہر کو چھٹی کے عین وقت پر کالج کے سامنے آموجود ہوتا۔

ایک لڑکی اور وہ بھی کسی عام گھرانے کی لڑکی کا شہر کے کالج میں پڑھنا... گاؤں میں یہ بھی ایک انوکھا واقعہ تھا۔ تقریباً دو سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ منال دل لگا کر تعلیم حاصل کرتی رہی، ہر درجے میں اس نے اعلیٰ نمبروں کی کارکردگی دکھائی تھی۔ ساہیوال کالج سے بہترین نمبروں میں بی اے کرنے پر اسے ہر طرف سے مبارک باد کے پیغامات موصول ہوئے تھے۔

اگلی پڑھائی کے لیے اسے لاہور یا فیصل آباد جانا تھا، لیکن دوسرے شہر جائے کون؟ سفر کی صعوبتیں، رشتہ داروں کی باتیں، تعلیم کے اخراجات.. ویسے بھی گاؤں میں لڑکیاں تو ایک طرف، لڑکوں میں سے بھی شاید ہی کوئی ہوگا جو دوسرے شہر پڑھنے گیا تھا۔ پھر کوئی کیسے برداشت کرلیتا کہ ایک معمولی کوچوان کی ذہین بیٹی پڑھنے کے لیے دوسرے شہر چلی جائے، لوگوں کی جانب سے باتیں تو بنائی جانی تھیں، سو بنائی گئیں، مگر منال نے اپنی ذہانت سے اپنے بابا کو قائل کرلیا تھا۔ بابا اسحاق خوشی خوشی اپنی بیٹی کو لاہور لے گیا۔ جہاں تھوڑی سے کوشش کے بعد منال کو کی ایک سرکاری یونیورسٹی میں سکالرشپ پر داخلہ مل گیا۔ اب صرف ضروری کاغذات جمع کروانا باقی تھے۔ منال کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔

یونی ورسٹی کے قریب ہی ایک ہاسٹل میں اس کی رہائش کا انتظام بھی ہو گیا۔ تب منال کے اس کارنامے پر گاؤں بھر میں خوب دھوم مچی تھی کہ بابا اسحاق تانگے والے کی بیٹی منال لاہور پڑھنے جارہی ہے ۔ کچھ لوگ اسے مزید ترقی کی دعا دیتے، کچھ خاموشی اختیار کرلیتے، بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے لڑکی کی کامیابی پر ناک بھوں چڑھانا ضروری سمجھا تھا۔

''اتنا پڑھنے لکھنے کا فائدہ؟ کرنی تو ہانڈی روٹی ہی ہے۔''

منال کے لاہور جا کر پڑھنے کی خبر سن کر رخسانہ بھٹے والی نے ریت میں دانے بھونتے ہوئے منہ بنا کر کہا تھا۔ دو تین عورتیں وقت گزاری کے لیے اس کے گرد بیٹھی ہوئی تھیں۔

''نہیں! تو کیا منال اپنے خصم کو روٹی کی جگہ یہ کتابیں کھلائے گی''!

اپنی باری کے انتظار میں کھڑی ایک لڑکی نے اپنی سہیلی کے کان میں کھسر پھسر کی تھی۔ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ لوگوں کا کام تو باتیں کرنا ہی ہوتا ہے، جو اور کچھ نہیں کر سکتے، وہ یہی تو کرتے ہیں۔ منال کو ان میں سے کسی کی پرواہ نہ تھی۔

...☆...

''ابا! کھانا کھا لے۔'' بیٹی کی آواز بابا اسحاق کو حقیقت کی دنیا میں واپس کھینچ لائی تھی۔ وہ انگڑائی لیتا ہوا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کیا پکایا ہے دھی رانی نے؟'' ابا نے سالن کی کٹوری اپنی جانب کی۔

''کدو پکائے ہیں ابا۔'' منال اس کے پاس کی چار پائی کے دوسرے جانب بیٹھ گئی اور جگ سے گلاس میں لسی انڈیلی۔

''مزے دار!'' ابا نے پہلا لقمہ منہ میں رکھتے ہی رغبت سے کہا اور شوق سے کھانا کھانے لگا۔ ''تیری ماں کتھے اے؟''

''ماسی بانو کی طرف گئی ہے۔آتی ہی ہو گی۔'' منال نے کہا: ''ابا! تُو نے بتایا نہیں، آج اتنا خوش کیوں ہے؟ ویسے تو کبھی میرے دور ہو جانے پر تُو بہت اُداس ہوا کرتا تھا۔ اب میرے لاہور جانے پر خوش ہو رہا ہے، کیا مجھ سے تنگ آ گیا ہے؟'' منال کی آنکھوں میں جھٹ سے آنسو آ گئے تھے۔

''اری او جھلیے!! میں تیرے جانے پر خوش کیوں ہوں گا؟''

ابا نے پیار سے اس کے سر پر چپت لگائی: ''بس آج تو کمال ہی ہو گیا، بلکہ اللہ سوہنے کا کرم ہو گیا۔ میں صبح پریشان تھا کہ تُو نے کل لاہور چلے جانا ہے اور میرے پاس تجھے دینے کے لیے پیسے تھوڑے تھے۔ میں فکر مند تھا کہ تھوڑے پیسوں میں تیرا گزارا کیسے ہو گا، تجھے تنگی نہ ہو۔ بس اسی پریشانی میں صبح نکلا تو نمبر دار نے بلا لیا کہ آج دوسرے شہر سے ریل گاڑی پر اس کا چھوٹا بھائی چودھری خورشید اپنے بال بچوں کے ساتھ آ رہا ہے، تو میں اسے لینے اسٹیشن پر چلا جاؤں۔'' ابا نے منال کے ہاتھ سے لسی کا گلاس پکڑا۔

'' تو جب میں نے چودھری صاب کو نمبر دار جی کے گھر اتارا تو انہوں نے مجھے شاباشی میں پیسے تھما دیے۔''

یہ کہہ کر ابا نے لسی کا ایک بڑا سا گھونٹ بھرا، گلاس کو چار پائی کی ایک جانب رکھا اور اپنی قمیص کی جیب سے دو روپے اور پانچ روپے کے کئی نوٹوں کے ساتھ ساتھ دو لال نوٹ بھی نکال لیے۔ یہ نوٹ بابا اسحاق نے جیسے ہی منال کی ہتھیلی پر رکھے تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''ابا!!! اتنے سارے پیسے!!! آج تو تُو واقعی امیر ہو گیا ہے۔'' منال نے شوخی اور خوشی سے کہا۔

''میں کیوں؟ یہ سارے پیسے تو میرے دھی رانی کے ہیں، پھر امیر تو وہ ہوئی ناں''!

ابا نے مسکراتے ہوئے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ ''چل اب جلدی سے ان پیسوں کو سنبھال۔ میں روٹی ختم کرلوں، پھر کل کی تیاری کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر بابا اسحاق اپنے کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا تو سرشار سی منال بھی مسکراتے ہوئے اندر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

...☆...

چناب نگر کی اس مرکزی سڑک پر وہ بہت عام سا دن تھا، جو کچھ ہی ثانیے میں ایک انسان کی زندگی کا پورا دائرہ بدلنے والا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب کاروباری چہل پہل جاری تھی، لوگ کاروبارِ زندگی میں مصروف تھے۔ ہر کوئی اپنی اپنی روزی کے اڈے پر بیٹھا گاہکوں کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک ایک گاڑی کے ٹائر چرچرانے کے ساتھ ہی کسی بچے کی بلند چیخ فضا میں گونجی۔

ایک ہلکا سا انسانی وجود عبدل کی گاڑی سے ٹکرا کر اُڑتا ہوا دور جا گرا تھا۔ عبدل نے بر وقت بریک لگانے کی پوری کوشش کی تھی لیکن پھر بھی وہ دس سال کا بچہ اس کی گاڑی کے بونٹ سے ٹکرا گیا تھا اور اب زخمی حالت میں سڑک پر گرا کراہ رہا تھا۔ اس کے جسم سے خون تیزی سے نکل رہا تھا۔ سڑک پر خون کے سرخ دھبے نظر آرہے تھے۔ یہ منظر دیکھتے ہی آس پاس کے لوگ جائے حادثہ کی طرف بھاگے۔ کسی نے دوڑ کر بچے کو اُٹھانے کی کوشش کی، تو کوئی غصے کے عالم میں گاڑی والے کی جانب لپکا تھا۔

"ابے او! اندھا تھا کیا؟" ایک آدمی کار والے پر چلایا۔

"ارے! کم بخت نے ننھے پھول کو روند ڈالا!!" دوسرے راہ گیر نے آواز لگائی۔

"بھئی تیرے باپ کی سڑک ہے کیا جو یوں گاڑی دوڑا رہا تھا؟" ایک اور آدمی نے اُسے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا تھا۔

"اسے یہیں پر باندھ دو، جانے نہ پائے، ایسی کی تیسی اس کی۔"

عبدل گاڑی سے باہر آچکا تھا اور اس وقت خوف اور بے چینی سے اپنے اوپر کسے جانے والے آوازوں کا سامنا کر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی اپنی جماعت کی ایک اہم میٹنگ سے فارغ ہو کر نکلا تھا اور گاڑی چلاتے ہوئے اگلے لائحہ عمل کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے کہاں سے یہ بچہ اس کی گاڑی کے سامنے آگیا۔ عبدل اب چاہتے ہوئے بھی وہاں سے فرار نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ایک دم سے لوگوں کا مجمع اکٹھا ہو چکا تھا۔

کچھ نوجوانوں نے جلدی سے بچے کو اٹھایا اور اسے ایک گاڑی میں ڈال کر اسپتال کی طرف لے گئے۔ جب کہ باقی لوگ عبدل اور اس کی گاڑی کے گرد دائرہ بنائے کھڑے تھے اور اس کی تواضع کے لیے پر تول رہے تھے۔

"کون ہو تم...؟ اور کہاں جا رہے تھے؟"

"گاڑی اتنی تیز کیوں چلا رہے تھے؟"

"لائسنس کہاں ہے گاڑی کا؟"

لوگ عبدل سے مختلف سوال کر رہے تھے۔ اتنے میں قریب ہی رہائش پذیر بچے کے والدین اور دیگر اہلِ خانہ کو بھی خبر ہو گئی تھی۔ وہ روتے دھوتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے۔ ہسپتال کا نام پتا چلنے پر باپ نے بچے کی ماں کو اپنے بھائی کے ہمراہ ہسپتال روانہ کیا اور خود آستینیں چڑھا کر عبدل کی طرف بڑھا۔

"دیکھیں بھائی صاحب! میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں، مجھے معاف کر دیں، جو اس غلطی کا جرمانہ آپ کہیں میں دینے کو تیار ہوں۔"

عبدل نے بچے کے باپ سے معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن آگے سے وہ بپھر گیا تھا۔

"تم لوگ خود کو سمجھتے کیا ہو؟ گاڑی کیا لے لی، ساری دنیا تم لوگوں کے لیے حقیر ہو گئی؟ گاڑی میں بیٹھ کر یہ چلتے پھرتے انسان تمھیں نظر نہیں آتے کیا؟"

بچے کا باپ آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

"دیکھیں، میں جرمانہ بھرنے کو تیار ہوں۔ آپ جتنا ہرجانہ کہیں گے، میں ادا کر دوں گا۔" عبدل

بہت گھبرایا ہوا تھا۔

''اور اگر میرا بچہ مر جاتا تو...؟''

باپ نے زور سے اپنا ہاتھ اس کے بونٹ پر مارا تھا۔ عبدل نے پریشانی میں اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے مسلا۔

''بات پھیلنی نہیں چاہیے۔ جتنی جلدی ہو سکے، اس مسئلے کو یہیں ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے ورنہ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔''

عبدل نے دل میں سوچا اور نئے سرے سے نرم لہجے میں بچے کے باپ سے مخاطب ہوا:

''بھائی صاحب! اللہ کا شکر ہے آپ کا بچہ محفوظ رہا ہے۔ غلطی تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ آئیں، ہم کہیں بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔''

مگر بچے باپ ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں تھا، بلکہ بضد تھا کہ وہ عبدل کو پولیس کے حوالے کرے گا۔

''یہ معاملہ اس طرح نہیں سلجھے گا۔'' عبدل نے پریشانی سے دل ہی دل میں سوچا،

پھر اپنی جیب سے ایک بزنس کارڈ نکالا اور ہجوم میں موجود ایک نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا:

''چھوٹے بھائی! براہِ مہربانی، ان صاحب کو اس حادثے کے بارے میں اطلاع دے دیں۔ ان کا گھر قریب ہی ہے۔ ان سے کہیں کہ عبدل نامی بندے نے انہیں بلایا ہے۔''

اس نوجوان نے کارڈ پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے اوپر درج نام اور پتا دیکھا،، وہاں درج نام کچھ جانا پہچانا سا تھا۔ نوجوان نے کارڈ جیب میں ڈالا اور اپنی سائیکل پر سوار ہو کر مطلوبہ پتے کی طرف روانہ ہو گیا۔

...☆...

''اور کھاؤ بیٹے...! تکلف نہ کرو۔'' منگلا نے کھانے سے ہاتھ کھینچنا چاہا تو شاہ صاحب نے اصرار کرنے کے ساتھ ساتھ ایک اور تندوری نان اس کے سامنے رکھ دیا۔ ساتھ ہی سالن کا ڈونگا بھی اس کی

جانب بڑھایا۔ وہ، منگلا اور شوکت دستر خوان پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ دستر خوان پر آلو گوشت کا ڈونگا اور ایک رومال میں لپٹے نان رکھے تھے۔ درمیان میں باریک لچھوں کی صورت میں کٹی ہوئی پیاز اور کھیرے بھی موجود تھے۔

''بس سر جی! اللہ کا شکر ہے... پیٹ بھر گیا ہے۔ مزید کھانے کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔ پہلے ہی آپ نے دو گلاس شربت پلا دیے تھے۔''

منگلا نے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے چارگی سے کہا تو شاہ صاحب نے انکار میں سر ہلایا۔

''ارے اتنا سا کھانا تو بچے کھاتے ہیں، تم تو جوان ہو۔ شاباش، کھاؤ اور....'' شاہ صاحب نے خود ہی اس کی پلیٹ میں مزید سالن ڈالا تو منگلا کو مجبوراً کھانا جاری رکھنا پڑا۔ شوکت خاموشی سے ان دونوں کو دیکھتا ہوا کھانا کھا رہا تھا۔

''آپ صرف شوربے کے اندر نان بھگو کر کیوں کھا رہے ہیں؟'' منگلا کی نظر شوکت کے کھانے پر پڑی تو اسے حیرت ہوئی۔

''اس کے حلق میں کھیرے کا ٹکڑا پھنس گیا تھا۔ بڑی مشکل سے باہر نکلا۔ تمہیں ملنے سے پہلے ہم ڈاکٹر کے کلینک سے ہی واپس آ رہے تھے۔ اسی نے کہا ہے کہ ایک دو دن شوربے میں نان کو اچھی طرح نرم کر کے کھائے تا کہ حلق پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔''

شوکت کی بجائے شاہ صاحب نے جواب دیا تو شوکت مسکرایا۔ منگلا 'اوہ' کہہ کر رہ گیا۔

''تم اپنی سناؤ بیٹا...'' شاہ صاحب نے لقمہ توڑا۔

''سر جی...! میں نے بتایا تھا ناں کہ چنیوٹ کے قریب ایک چھوٹے سے قصبے کا رہنے والا ہوں۔ بی اے کیا ہوا ہے۔ ایک دوست نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ کچھ ٹیکنکل کورس کر لوں، آج کل اس کی بہت زیادہ ڈیمانڈ ہے۔ تو بس اسی سلسلے میں یہاں آیا ہوا ہوں۔ پنڈی کے کمرشل انسٹیٹیوٹ میں داخلہ لیا ہے، وہ مختلف تیکنیکی کورسز کرواتے ہیں۔''

''آج کا زمانہ تو واقعی ٹیکنکل تعلیم کا ہے۔ ہمارے زمانے میں ہم نے کہاں سوچا تھا کہ ٹیکنالوجی اتنی

ترقی کر جائے گی۔" اصغر شاہ مسکرائے۔

"جی ہاں...! بس یہی سوچ کر یہاں آگیا۔ میرا شہر تو چھوٹا سا ہے۔ وہاں تو ابھی کوئی معیاری انسٹیٹیوٹ ہے ہی نہیں۔ پھر یہاں راولپنڈی میں کورس کے بعد کوئی جاب بھی مل گئی تو سونے پر سہاگہ ہو جائے گا۔"

"ان شاء اللہ.... اللہ کسی کی محنت کو ضائع نہیں جانے دیتا۔" شاہ جی نے جگ سے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے کہا۔

"بات چیت سے تم اچھے گھرانے کے لگتے ہو۔ تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟' '

"وہ ایک سرکاری ادارے میں ملازم ہیں۔ ایک بڑی بہن ہے اور بس میں..... امی گھریلو خاتون ہیں۔"

"ماشاءاللہ، تم خود بھی بہت سلجھے ہوئے جوان لگ رہے ہو۔" اصغر شاہ نے تعریف کی تو منگلا آنکھیں جھکا کر مسکرا اٹھا۔

"اب کچھ دیر آرام کر لو... پھر شوکت تمہیں اکیڈمی چھوڑ آئے گا یا ابھی جانا چاہتے ہو؟" اصغر شاہ نے منگلا سے پوچھا۔ سبھی کھانا ختم کر چکے تھے۔

"اگر آپ برا نہ منائیں تو اتنا لذیذ کھانا کھا کر اب تو کچھ دیر قیلولہ کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔"

منگلا ان کے دوستانہ لہجے سے مانوس ہو گیا تھا، تبھی کچھ بے تکلفی سے بولا تو اصغر شاہ ہنس پڑے۔

"اس میں برا منانے والی کیا بات ہے۔ میرے مہمان خانے کے دروازے سبھی کے لیے ہمہ وقت کھلے ہوئے ہیں۔ تم جتنی دیر چاہو، آرام کر لو۔ جب جانے کے لیے تیار ہو تو شوکت کو بتا دینا بلکہ عصر کی نماز کے بعد چائے پی کر جانا۔" ان کی بات سن کر منگلا کھل کر مسکرا دیا۔

......☆......

تانگے سے اُترتے ہی بابا اسحاق نے تانگے والے کو کرایہ دیا اور دونوں اٹیچی کیس اٹھا لیے۔ منال نے اپنی چادر درست کی، پھر اپنے بابا کے ساتھ چلتے ہوئے یونی ورسٹی مین گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ رفتہ رفتہ

وہ مرکزی عمارت کی طرف جا رہے تھے۔ چار منزلہ سرخ عمارت سے کچھ دور منال نے بابا جانی کو مخاطب کیا:

''ابا جی...! بس ٹھیک ہے اب۔ میں آگے خود ہی دیکھ لوں گی۔آپ انتظار گاہ میں کچھ دیر آرام کرلیں۔''

عموماً وہ دوسروں سے مرعوب ہونے والی نہیں تھی۔ اپنے شہر کے کالج میں بھی اس نے اپنے باپ کے حوالے سے کبھی سبکی محسوس نہیں کی تھی لیکن یہ لاہور تھا! اور وہ لاہور کی یونی ورسٹی میں داخلہ لینے والی اپنے گاؤں کی پہلی لڑکی تھی۔ وہ دیہاتی اب ایک بڑے شہر میں تھی۔

''نہ بیٹا، میں چلتا ہوں ناں اندر تک۔ تُو پریشان ہو گی۔''

بابا اسحاق سمجھ نہ پائے کہ ان کی بیٹی انہیں اپنی یونی ورسٹی میں لانے سے کیوں کترا رہی ہے۔

''وہاں بہت رش ہو گا۔ ہم کہاں سامان کو اٹھا کر پہلے کلرک کے پاس جائیں، پھر وہاں سے رجسٹریشن کروا کر ہاسٹل کی طرف جائیں۔آپ سامان کے ساتھ یہیں رکیں، میں کاغذی کارروائی کر کے آتی ہوں۔'' منال نے تسلی دی تو بابا اسحاق سر ہلا کر رہ گیا۔

''ٹھیک ہے دھیے۔ میں پھر مین گیٹ کے باہر چائے والے کے پاس بیٹھتا ہوں، تُو سارا کام کر کے آجا۔ پھر تیرا سامان ہاسٹل چھوڑ آؤں گا۔''

بابا اسحاق بیٹی کے دونوں اٹیچی کیس ایک درخت کی چھاؤں میں رکھ کر خود ان کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ منال نے سٹپٹا کر پہلے اپنے باپ کو اور پھر یونی ورسٹی گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہوئے لوگوں کو دیکھا اور سر کے گرد کس کر لپیٹی چادر کو تھوڑا ڈھیلا کرتے ہوئے تیزی سے یونی ورسٹی آفس کی جانب قدم بڑھا دیے۔ جب کہ بابا اسحاق کچھ دیر سستانے کے بعد اٹیچی کیس اٹھائے مین گیٹ سے باہر چلا آیا تھا۔

کلرک آفس کے سامنے اپنے داخلے کی رجسٹریشن اور دیگر ضروری کارووائی سے سلسلے میں آئے ہوئے طلبا اور طالبات کی الگ الگ قطاریں لگی ہوئی تھیں ۔ منال بھی اپنی فائل سنبھالتی ہوئی قطار میں کھڑی ہو گئی۔ انجانی جگہ اور انجانے لوگ لیکن ایسی جگہ اور لوگوں کے درمیان اپنا آپ منوانے کی خواہش

رکھنے والی منال اس وقت تو بس خاموشی سے اپنے اطراف کا جائزہ لے رہی تھی جب اچانک اس کے پیچھے ایک لڑکی آکر کھڑی ہوئی۔

''اف! کتنی گرمی ہے یار! اوپر سے اتنی لمبی لائن۔'' بے زار لہجے والی لڑکی کو منال نے تھوڑا سا سر گھما کر کن اکھیوں سے دیکھا تھا۔ باب کٹ بالوں کے ساتھ چہرے پر بڑے سے سن گلاسز لگائے، چست پینٹ شرٹ میں ملبوس، چیونگ گم کو چباتی اس لڑکی کو منال نے پہلی ہی نظر میں دوستی کی لسٹ سے خارج کر دیا۔

''بہت تیز لڑکی لگ رہی ہے۔'' منال نے فوراً اس سے نظریں ہٹائیں اور دل میں اپنے آپ کو کہا۔ اپنے عقب سے اسے مسلسل چیونگ گم چبانے، اس کا غبارہ بنا کر پھاڑنے اور پھر سے چبانے کی آوازیں آتی رہیں۔ قطار بہت سست روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔

''اے، سنو!'' اچانک اس لڑکی نے منال کی کندھے کو انگلی سے ہلکا سا ٹہوکا دیا۔ منال نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''کہاں سے آئی ہو؟'' اس نے پوچھا تھا۔ منال نے ایک لمحہ سوچا، پھر جواب دیا۔

''ساہیوال سے۔''

''مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم لاہور کی نہیں لگ رہی۔'' اس نے سن گلاسز کو اپنے سر پر ٹکاتے ہوئے ایک ادا سے منال کے لباس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، تو منال ایک لمحے کو تو سن ہو کر رہ گئی۔ اسے اپنی بے عزتی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے بغیر کچھ کہے اپنا چہرہ پلٹ دیا۔ جواب میں اسے عقب سے ہلکی سی ہنسی کی آواز آئی تھی۔

''ہائے بینش''!

قطار میں ایک اور لڑکی کا اضافہ ہو گیا تھا اور اب اس کے پیچھے کھڑی دونوں لڑکیاں گرم جوشی کے ساتھ ایک دوسرے سے مل رہی تھیں۔

''شکر ہے الوینہ، تم آ ہی گئی... کدھر رہ گئی تھی یار؟ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔''

چیونگ گم چباتی لڑکی نے نئی آنے والی لڑکی سے شکوہ کیا تھا۔ منال کو سب آوازیں آرہی تھیں۔

''بس یار... ! مجھے گھر سے نکلتے ہوئے دیر ہو گئی۔ پھر راستے میں ٹریفک کارش بھی بہت تھا۔'' الوینہ نے جواب دیا تھا۔

''میں تو آدھے گھنٹے سے یہاں دھوپ میں کھڑی سڑ رہی ہوں۔اسٹوپڈ فہد کو میں نے کہا بھی تھا کہ اپنی رجسٹریشن کے ساتھ ساتھ میری بھی کروادینا لیکن اس نے منہ پھلایا ہوا ہے تین دن سے۔'' بینش نے جواب دیا تھا۔ منال نے 'آدھے گھنٹے' پر بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی۔ بینش کو اس کے پیچھے آئے ہوئے مشکل سے دس منٹ بھی نہیں ہوئے تھے۔الوینہ البتہ ہلکا سا ہنس دی تھی۔

''اس نے کس بات پر منہ پھلایا ہوا ہے؟''

''یہی کہ میں اس کے منع کرنے کے باوجود توقیر کے ساتھ کافی ہاؤس کیوں چلی گئی تھی۔ یو نو، کبھی کبھی وہ زیادہ ہی اوور ریئیکٹ کر جاتا ہے۔ حالانکہ اسے میں کئی دفعہ بتا چکی ہوں کہ توقیر اور میں صرف اچھے دوست ہیں،اور کچھ نہیں۔''

دونوں سہیلیوں کی باتیں سن کر منال کے کانوں کی لوئیں گرم ہوتی جارہی تھیں۔

''اُف ! یہاں کی لڑکیاں کیسے آرام سے مردوں کو دوست بنالیتی ہیں اور ان کے ساتھ گھومتی پھرتی ہیں''!

منال نے جھرجھری سی لی۔ قطار کچھ اور آگے بڑھی۔

''ویسے To be honest! مجھے شروع سے ہی یہ فواد بالکل ڈفر لگتا ہے۔ تمہارے ساتھ بالکل بھی سوٹ نہیں کرتا۔'' الوینہ نے کہا تھا۔

''آئی نو یار، لیکن کیا کروں، مجھے وہ کیوٹ بھی بہت لگتا ہے۔'' بینش نے کہنے کے ساتھ ہی قہقہہ لگایا تھا۔الوینہ بھی ہنس پڑی۔

''اچھا چھوڑو اس ڈفر کی باتیں،ادھر آؤ، میرے ہوتے ہوئے لائن میں لگنے کی کیا ضرورت ہے؟''

یہ کہہ کر الوینہ نے بینش کا ہاتھ پکڑا اور قطار سے نکل کر کلرک آفس کی طرف چل پڑی۔ منال

حیرت سے انہیں جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ الوینہ نے جینز کی پینٹ کے اوپر ہلکے آسمانی رنگ کی لان کی کُرتی پہنی ہوئی تھی۔ نازک سے سینڈل میں ایک ادا سے چلتی ہوئی الوینہ کی چھوٹی سی پونی ٹیل دائیں بائیں جھول رہی تھی۔ نظم وضبط کے تمام ضابطے اس کے سینڈل کی 'ٹِک ٹِک' کے نیچے آکر روندے جا رہے تھے۔

....☆....

''بس شوکت بھائی..! یہیں گاڑی روک دیں۔'' شام کی چائے پلا کر اصغر شاہ نے منگلا کو رخصت کر دیا تھا اور اب شوکت اسے اس کے انسٹیٹیوٹ تک چھوڑنے آیا تھا۔ اس کے کہنے پر شوکت نے دو منزلہ عمارت کے سامنے گاڑی روک دی۔ اس عمارت کے زیریں حصے میں مختلف دکانیں تھیں جبکہ دوسری منزل پر ایک بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا: فرید کمرشل انسٹیٹیوٹ....

''آئیں ناں میرے ساتھ.... آپ کو چائے پلواتا ہوں۔'' گاڑی سے اترتے ہوئے منگلا نے شوکت کو پیشکش کی۔

''نہیں جناب... ابھی تو چائے پی کر آیا ہوں۔ مزید طلب نہیں ہے۔ ان شاءاللہ پھر کبھی سہی....'' شوکت نے مسکراتے ہوئے معذرت کی۔

''ٹھیک ہے، اللہ حافظ...''!

''جیسے آپ کی مرضی بھائی۔ اللہ حافظ۔'' منگلا نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور شوکت کی گاڑی کو جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ جب وہ گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی تو وہ عمارت کی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا دوسری منزل کی طرف چل پڑا۔

''کدھر رہ گئے تھے منگلے؟ سر عظمت کتنی ہی دفعہ تمہارا پوچھ چکے ہیں۔'' دروازے پر اس نے دستک دی تو دروازہ کھولنے والے نے بغیر کسی سلام دعا کے، سب سے پہلے یہ سوال پوچھا۔

''سر جی کو بتانا کہ میں ایک شکار کی تلاش میں تھا۔'' منگلا نے پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب گہری سی چمک آگئی تھی۔

کچھ ہی دیر میں وہ سر عظمت کے کمرے میں موجود تھا۔ عظمت صاحب نے کتاب بند کرتے ہوئے

اسے دیکھا:

''ہاں بھئی جوان.. !آگئے تم..؟ کہاں تھے اتنی دیر.. اور کیا خبر لائے ہو؟''

''سر جی...! بس یوں سمجھیں کہ میری قسمت اچھی تھی جو آج فلیٹ سے آتے ہوئے راستے میں مجھے اصغر شاہ نامی ایک صاحب مل گئے۔ بلکہ مجھے کہاں ملے، یوں سمجھئے کہ یہ انہیں میں مل گیا! بے انتہا ملنسار اور مہمان نواز ہیں۔ ان کے گھر سے ملحقہ ان کا اپنا ہائی سکول ہے۔ ایک کالج میں پروفیسر بھی ہیں۔ علاقے کی بڑی اہم شخصیت ہیں، ان کی بات کو لوگ بہت اہمیت دیتے ہیں۔'' منگلا سر عظمت کے سامنے بیٹھا کار گزاری سنا رہا تھا۔

''جیسا حلیہ اور ان کا رویہ تم نے بتایا ہے، اس سے تو مجھے وہ بھلے مانس سے بندے لگے ہیں۔ اگر ان پر توجہ دی جائے، تو علاقے بھر پہ بہت اچھا اثر پڑے گا۔'' بھاری جُثے اور چھوٹی خشخشی ڈاڑھی والے سر عظمت نے اپنی گول عینک کے عدسوں کے پیچھے سے منگلا کو دیکھتے ہوئے اس کی بات پوری توجہ سے سن رہے تھے۔ انھوں نے کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے ہنکارا بھرا اور منگلا کی طرف دیکھ کر گویا ہوئے:

''تم نے ہمارے اِس ادارے کا کیا بتایا انھیں؟''

''یہی کہ میں یہاں سے ٹیکنکل تعلیم حاصل کر رہا ہوں تا کہ ملازمت مل سکے۔''

''صحیح.....'' انہوں نے پر سوچ انداز میں کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ایسے لوگ اگر ہمارے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں تو ان سے وابستہ باقی تمام لوگ بھی خود بخود حق کی راہ پر چل سکتے ہیں۔ کچھ ماہ پہلے ہی میری کوشش اور محنت سے پیر سیداں میں ایک بڑے چودھری نے ہمارے شیخ و مربی کا بیعت نامہ بھرا تو اس کی دیکھا دیکھی اس کے مزارعوں نے بھی ہماری جماعت میں شمولیت اختیار کر لی۔ یہ سب بس اللہ کا کرم ہے کہ لوگ ہماری باتوں سے قائل ہو جاتے ہیں۔''

سر عظمت نے بڑے دھیمے لہجے میں بتایا تو منگلا سر ہلا کر رہ گیا۔ کچھ ثانیے خاموشی میں گزر گئے۔

''اچھا ایسا ہے اب کہ.......'' اچانک سر عظمت سے سر اٹھایا۔

''ہمارے پاس اصغر شاہ کی صورت میں ایک بہترین چوائس موجود ہے۔ تم ایسا کرو کہ ان کا اعتماد جیتنے کی کوشش کرو۔ جتنا ان سے قریب ہو سکتے ہو، ہو جاؤ۔ انہوں نے تمہارا کافی خیال رکھا ہے تو تمہارا پاس یہ اچھا بہانہ ہے کہ تم ایک دو دن میں شکریہ کے بہانے ان سے ملنے چلے جاؤ۔ ساتھ اکرام کے طور پر کوئی سوغات لے جانا۔ جیسا کہ تم نے بتایا کہ وہ میل ملاقات کو پسند کرتے ہیں، تو تمہارا ان سے ملنے جانا انہیں عجیب نہیں لگے گا بلکہ مجھے یقین ہے کہ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔''

''آپ نے بہت اچھی تجویز دی ہے۔ میں پرسوں ان سے ملنے چلا جاؤں گا۔ ان کا پتا تو مجھے یاد ہے۔'' منگلا نے جواب دیا۔

''بس آپ مجھے طریقہ کار بتادیجیے گا کہ میں کس انداز میں انھیں قائل کروں کہ انہیں محسوس بھی نہ ہو لیکن وہ بات کو سمجھ بھی جائیں۔''

''صبر صبر.....!!'' سر عظمت مسکرائے۔

''یہ بہت نازک کام ہے۔ اس میں جلد بازی نہیں چلتی۔ لوگوں کو ذرا بھنک بھی پڑ جائے تو جان کے لالے پڑ جاتے ہیں اس لیے خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ ابھی تو تم ان کا اعتماد جیتو، بعد کی بعد میں دیکھیں گے، لیکن انہیں کسی بھی صورت میں شک نہیں ہونا چاہیے کہ تمہارا کیا ارادہ ہے یا تمہاری حقیقت کیا ہے؟''

''جی بہتر سر.... ایسا ہی ہو گا۔'' منگلا نے سر ہلایا تھا۔

.....☆......

یہ قریب ہی نئی آباد ہونے والی ایک کالونی کا ایڈریس تھا۔ مقامی آبادی اس کالونی کو 'پراسرار کالونی' کہتی تھی کیونکہ کیونکہ یہاں سے بڑے امیر کبیر لوگ آکر آباد ہوئے تھے۔ ان کے بارے میں مقامی لوگوں کو کچھ زیادہ معلوم بھی نہ تھا۔

نوجوان پیڈل مارتے ہوئے اپنے سائیکل پر بیٹھا چلا جارہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ مطلوبہ پتے کے سامنے موجود تھا۔ یہ سفید ماربل کے بل دار ستونوں سے سجا ہوا ایک عالیشان گھر تھا، جس کے بلند قامت سیاہ آہنی

گیٹ کے ایک جانب سنہری پلیٹ پر نام درج تھا، ’رستم رئیس‘

’’اوہ...رستم رئیس... بھئی یہ تو شہر کے مشہور امیر کبیر آدمی کا محل نما گھر ہے۔‘‘نوجوان کچھ سوچ میں پڑ گیا: ’’مگر اِس کا اُس گاڑی والے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے بھلا؟ شاید یہ دوست ہوں یا پھر آپس میں رشتے دار.... چلو مجھے کیا.... میری بلا سے یہ جو بھی ہیں، مجھے اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔‘‘

اس نوجوان نے بے دلی کے ساتھ دروازے پر لگی گھنٹی بجادی۔ کچھ دیر بعد اس نے تیسری دفعہ گھنٹی بجانے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ ایک جھٹکے سے آہنی گیٹ کے ایک جانب بنی چھوٹی سی درز کو کسی نے ایک جانب ہٹایا اور سرخ ڈوروں والی آنکھوں نے باہر جھانکا۔

’’کون ہے...؟‘‘آواز میں کرختگی اور رعب تھا۔ نوجوان گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ ماحول میں پراسراریت چھائی ہوئی تھی۔

’’میں یاسر ہوں۔ مجھے عبدل نامی شخص نے بھیجا ہے۔ مجھے رستم سے ملنا ہے فوراً۔‘‘

نوجوان نے ایک ہی سانس میں تینوں جملے کہہ دیے تھے۔ اس کی بات سن کر گیٹ کے دوسری جانب کچھ ثانیے تو خاموشی چھائی رہی، پھر آہنی گیٹ میں بنے ذیلی دروازے کا کنڈا کھلنے کی آواز آئی۔ یاسر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اس بنگلے کی شان و شوکت سے پہلے ہی متاثر ہو چکا تھا۔ دروازہ کھلا تو اس نے سامنے ایک بڑے ڈیل ڈولے والے مرد کو پایا۔ اس کا رنگ پکا سانولا تھا۔ چہرے پر موجود بڑی اور سیاہ مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا وہ مرد یاسر کو مشکوک نظروں سے گھور رہا تھا۔

’’تمہارا نام کیا ہے..؟‘‘

’’بتایا تو ہے، یاسر...!! یاسر شمس۔‘‘ نوجوان نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا: ’’رستم صاحب کو جلدی بلاؤ۔ مجھے انہیں بہت ضروری پیغام دینا ہے۔‘‘

’’رستم صاحب بغیر طے شدہ میٹنگ کے کسی سے نہیں ملتے۔‘‘آدمی ٹس سے مس نہ ہوا۔ یاسر کو اب جھنجھلاہٹ اور بے زاری ہونے لگی تھی۔

’’بھاڑ میں جائے وہ عبدل اور یہ رستم! میں کیوں اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں‘‘!!

یاسر نے سوچا اور تنگ آکر جیب سے عبدل کا کارڈ نکال کر اس آدمی کی طرف بڑھایا۔

''اگر عبدل صاحب کو پتا ہوتا کہ ان کی گاڑی سے ایک بچے کا ایکسیڈنٹ ہو جائے گا تو وہ پہلے ہی تمہارے رستم صاحب سے میری میٹنگ بک کروا لیتے'' !!

''کیا کہا.....؟'' آدمی اب چونکا۔:''عبدل سر کا ایکسیڈنٹ؟ کب ہوا؟ ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ یہاں سے نکلے تھے۔''

اس کے چہرے کے تاثرات اب بالکل بدل چکے تھے۔ اس نے یاسر کے ہاتھ سے عبدل کا کارڈ پکڑا اور تیزی سے بنگلے کے اندر کی جانب لپکا۔ یاسر کچھ لمحے تو تذبذب میں رہا کہ وہیں کھڑا رہے یا اندر چلا جائے، پھر تجسس سے مجبور ہو کر اس نے ذیلی دروازے سے گیٹ کے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اس کے سامنے سفیر سنگِ مرمر کی بنی ہوئی روش تھی جس کے درمیان میں کالے سنگِ مرمر سے خوب صورت ڈیزائن بنا ہوا تھا۔

یاسر نے ایسی حسین روش اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ روش کے دونوں جانب مخملیں گھاس کے قطعے تھے جن کے اطراف میں گہری سبز رنگ کی دیو قامت جھاڑیاں تھیں جو چار دیواری سے بھی کچھ اوپر تھیں۔ کیاریوں میں مختلف رنگوں اور اقسام کے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

یاسر مبہوت ہو کر ابھی قدرت کے اس حسن کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اسے اپنے عقب میں کسی کے غرانے کی آواز آئی۔

......☆......

رات کے کھانے پر اصغر شاہ اپنے بچوں کے ساتھ ڈائننگ میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے جب انہوں نے اپنی نگہت بیگم کو آواز دی۔

''جی جی.... آرہی ہوں۔'' باورچی خانے سے ایک ہاتھ میں روٹی کی چنگیر پکڑے نگہت بیگم باہر آئیں۔ چنگیر میں بھاپ اُڑاتی ہوئی ایک روٹی موجود تھی۔ انہوں نے میز پر رکھا ہاٹ پاٹ کھول کر روٹی اس میں رکھ دی اور خود علی کے قریب رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"لاؤ بھئی.....بسم اللہ کریں۔" اصغر شاہ نے کھانے کی ابتدا کرتے ہوئے اپنی پلیٹ میں سالن نکالا۔ علی نے اشتیاق سے سالن کے ڈونگے کی جانب دیکھااور منہ بسور کر، بازو سینے پر باندھ کر بیٹھ گیا۔

"کیاہوا بیٹے؟" اصغر شاہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"بابا.... امی جی نے مسور کی دال بنائی ہے جو علی کو بالکل بھی پسند نہیں، تبھی منہ بسور کر بیٹھ گیا ہے۔"

ان کی بیٹی رابعہ نے ان کے ہاتھ سے سالن کاڈونگا پکڑتے ہوئے بتایا۔

"یعنی یہ منہ اور مسور کی دال...!" عمر نے علی کو چھیڑا تھا۔ وہ مزید خفا ہو گیا۔ اصغر شاہ اس کی خفگی دیکھ کر مسکرائے۔

"لیکن یہ دال تو بہت ہی لذیذ ہے بھئی۔ میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ میں روٹی کی جگہ چمچ سے کھالوں۔"

"جب میں اپنے بیٹے کو خود اپنے ہاتھوں سے لقمے بنا کر کھلاؤں گی تو میرا بیٹا بھی کھائے گا۔"

نگہت بیگم نے علی کو پچکارتے ہوئے کہا اور روٹی کا ایک لقمہ توڑ کر اس پر دال لگاتے ہوئے علی کی جانب بڑھایا۔ طوعاً و کرہاً علی کو منہ کھولنا پڑا۔

"پلیز امی جی.....! دال تھوڑی سی لگائیں ناں"!

"اچھا اچھا.....! یہ لقمہ تو کھالو، دوسرے لقمے میں دال کم لگاؤں گی۔"

امی نے لقمہ اس کے منہ میں ڈال دیا تھا۔ علی برے برے سے منہ بناتا ہوا لقمہ چبانے لگا۔

"علی تو ابھی تک چھوٹا منا ہے، امی اسے کھانا کھلاتی ہیں!" عمر نے ایک دفعہ پھر اسے چھیڑا تھا۔

"ابو جی! دیکھیں ناں بھیا کو...!" علی نے احتجاج کیا۔

"عمر.......!" اصغر شاہ نے مصنوعی تنبیہہ کے ساتھ عمر کو گھورا، تو وہ چہرہ جھکا کر ہنسنے لگا، رابعہ اور امی جان بھی مسکراتے ہوئے کھانا کھا رہی تھیں۔

"ہمیں لگتا ہے کہ بس مرغی اور گوشت میں ہی اصل مزا اور طاقت ہے لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس دال کے کتنے بے شمار فائدے ہیں۔"

اصغر شاہ نے کھانے کے دوران کہا تو سب ان کی جانب متوجہ ہو گئے۔ ''

یہ مسور کی دال آئرن اور پروٹین کا بہترین ذریعہ ہے۔ ہمارے بالوں کی جڑوں کو مضبوط کرتی ہے۔ اس دال میں پچیس فیصد پروٹین، ساٹھ فیصد کاربوہاڈریٹس ہوتے ہیں۔ پوٹاشیم، فاسفورس بھی کافی مقدار میں موجود ہوتے ہیں۔اس میں موجود وٹامن اے، بی اور ای نظر اچھی کرنے میں بہت مدد کرتے ہیں۔ ''

''ابو جی!!' رابعہ تعجب سے بولی: ''آپ کو یہ ساری باتیں کیسے پتا چلیں؟'' اس کا سوال سن کر اصغر شاہ اور نگہت بیگم ہنس پڑے۔

''کتابوں کے مطالعے سے بیٹے! یہ ساری معلومات کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ بس انہیں کھولنے اور پڑھنے کی دیر ہے۔ ''

اصغر شاہ نے جگ سے پانی گلاس میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''آپ اتنی کتابیں کیوں پڑھتے ہیں...؟'' علی نے معصومیت سے پوچھا تو سب ہنس پڑے۔ باتوں میں دھیان تقسیم ہونے کی وجہ سے اب وہ خود ہی آرام سے دال کے ساتھ روٹی کھارہا تھا۔

''کیونکہ مجھے کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔'' اصغر شاہ نے جواب دیا

''خبط کہیں، خبط...!'' نگہت بیگم نے فوراً اُن کی بات پکڑی تو وہ ہنس پڑے۔

''خبط کسے کہتے ہیں امی جی...؟'' عمر نے دلچسپی سے پوچھا۔ رات کے کھانے پر ہونے والی ہلی پھلکی سی گفتگو سبھی کو بہت اچھی لگتی تھی۔ دن میں تو اصغر شاہ بیٹھک میں کھانا کھاتے تھے۔

''بیٹا جی... !آپ کی امی کو میرے اس شوق سے تھوڑی سی کوفت ہوتی ہے۔'' اصغر شاہ نے مسکراتی نظروں سے نگہت بیگم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا: ''مجھے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے، بہت ہی زیادہ۔ میرا بس چلے تو میں ہر وقت بس کتابیں ہی پڑھتا رہوں''!!

''اف...!'' عمر نے گھبرا کر کہا تو سب ہنس پڑے۔

''آپ لوگوں کے ابو کو تورات کو مطالعہ کیے بغیر نیند ہی نہیں آتی!'' نگہت بیگم مسکرائیں۔

''واقعی...؟'' تینوں بچوں نے حیرت سے اصغر شاہ کی جانب دیکھا تو وہ بس مسکرا کر کھانا کھانے میں

مشغول رہے۔

''حالانکہ مجھے اتنی نیند آرہی ہوتی ہے، میں کہتی ہوں کہ لائٹ بند کریں، تو آگے سے مجھے کہتے ہیں کہ آپ بھی دس منٹ کوئی کتاب پڑھ لو''!

نگہت بیگم نے جس انداز میں کہا تھا، تینوں بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''اچھا، اس سے ایک مزیدار واقعہ یاد آیا مجھے۔'' اصغر شاہ نے ہاٹ پاٹ سے روٹی نکالتے ہوئے بتانا شروع کیا۔

''ایک دفعہ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ اس کے چچا کے گھر گیا۔ ان کا گھر گاؤں میں تھا جہاں بجلی ابھی نہیں پہنچی تھی۔'

سبھی ہمہ تن گوش تھے۔

''تو ہوا کچھ یوں کہ سارا دن تو کھیت وغیرہ اور دیگر معاملات میں گزر گیا۔ انہوں نے میرے لیے سونے کا انتظام ایک بیٹھک میں کیا ہوا تھا۔ میرا دوست تو گھر کے اندر کسی کمرے میں تھا۔ اب جب میں نے سونے سے پہلے اپنا بیگ چیک کیا تو اس میں کتاب نہیں تھی۔''

تینوں بچے اپنا اپنا کھانا روکے ان کا ماجرا سن رہے تھے۔ اصغر شاہ نے مزے سے ایک لقمہ منہ میں ڈال کر چبایا اور دوبارہ گویا ہوئے:

'' میں نے گاؤں کے لیے جلدی جلدی پیکنگ کی تھی، اس لیے کوئی کتاب لانا بھول گیا تھا، اور سمجھ رہا تھا کہ میں نے رکھ دی ہے۔ اُف... مت پوچھو کہ پھر کیا ہوا واہاں....''

''بتائیں ناں ابو جی......!'' رابعہ نے بے تابی سے کہا۔

''اچھا سنو پھر... کھڑکی کے باہر سے چاند کی ہلکی ہلکی سی روشنی کمرے میں آرہی تھی۔ پہلے تو میں سونے کی کوشش کرتا رہا لیکن مطالعہ ہی نہیں کیا تھا اس لیے نیند نہیں آرہی تھی۔ ذہن کو عادت جو نہیں تھی! شاید ایک گھنٹہ اسی کوشش میں گزر گیا! پھر تنگ آکر میں نے لالٹین جلائی اور کمرے کی تلاشی لینے لگا کہ شاید کہیں سے کچھ مل جائے پڑھنے کو.... الماریاں دیکھ لیں لیکن وہاں کپڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

اتنی رات گئے میں اپنے دوست کو جگا بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے پڑھنے کو کچھ دوتا کہ میں سو سکوں۔''

اصغر شاہ کہتے جارہے تھے اور بچے محویت سے حیران اور تجسس بھرے تاثرات کے ساتھ سنتے جا رہے تھے۔

'' پھر سوچو کہ میں نے کیا کیا ہوا گا؟''

''آپ نے دوبارہ لیٹ کر سونے کی کوشش کی ہو گی اور پھر سو گئے ہوں گے۔'' علی نے اپنا خیال پیش کیا۔

''اونہوں!'' اصغر شاہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''آپ دوبارہ لیٹ گئے ہوں گے لیکن آپ کو نیند نہیں آئی ہو گی اور صبح تک جاگتے رہے ہوں گے۔'' عمر نے کہا۔

''اونہوں....''!

''پھر آپ دروازہ کھول کر باہر گئے ہوں گے اور کسی سے کہا ہو گا کہ کچھ پڑھنے کو اخبار یا کتاب وغیرہ دے دیں۔'' رابعہ نے ابھی اپنا حصہ ڈالا تو اصغر شاہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہنس پڑے۔ نگہت بیگم مسکراتے ہوئے خاموشی سے ان سب کی باتیں سن رہی تھیں۔

''ارے بٹیا! وہ گاؤں تھا جہاں بجلی بھی نہیں تھی۔ اتنی رات گئے میں باہر نکلتا تو مجھے آوارہ کتے اور جن ہی ملتے، کوئی انسان نہیں۔!'' ان کا جواب سن کر سب ہنس پڑے۔

''میں نے لالٹین جلائی اور پھر کمر میں موجود پر چھتی پر ہاتھ مارنے لگا۔''

''پر چھتی...؟''

''جی، گاؤں میں دیواروں پر چھجے سے بنے ہوتے ہیں، سلیب سمجھ لو۔ ان کے اوپر سامان رکھا ہوتا ہے۔'' اصغر شاہ نے بتایا۔

''میں نے اس چھتی پر ہاتھ مارنا اور ٹٹولنا شروع کر دیا کہ مجھے کوئی سگریٹ کے پیکٹ کا ٹکڑا یا ردی کاغذ ہی مل جائے اور پھر آخر کار مجھے مل ہی گیا۔'' اصغر شاہ نے کچھ توقف کرتے ہوئے بچوں کی بے چینی کا مزا

لیا۔

" وہاں پر چھتی کے اوپر ایک پرانے اخبار کا ایک صفحہ بچھا ہوا تھا جس پر برتن رکھے ہوئے تھے۔ میں نے لالٹین سنبھالتے ہوئے اخبار کے اوپر سے برتن اٹھائے، انہیں ایک جانب رکھا اور اخبار کے اس صفحے کو لے کر اپنی چارپائی پر آبیٹھا۔ اس پانچ سال پرانے اخبار کو میں نے ابھی پانچ منٹ ہی پڑھا تھا کہ مجھے نیند کے جھونکے آنا شروع ہو گئے اور دس منٹ بعد میں گہری نیند سو چکا تھا!!! پھر صبح دوست نے ہی مجھے آکر جگایا۔"

اصغر شاہ کا ماجرا مکمل ہو چکا تھا۔ بچے جیسے ٹرانس سے باہر آئے۔

"یعنی پڑھائی کرتے ہوئے صرف بچوں کو ہی نہیں، بڑوں کو بھی فوراً نیند آنا شروع ہو جاتی ہے"!

رابعہ نے شرارت سے کہا تھا۔ سبھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

.....☆......

رجسٹریشن اور باقی کی ضروری کارروائی سے فارغ ہوتے ہوتے منال کو دو گھنٹے تو لگ ہی گئے تھے جبکہ اس کی نظروں کے سامنے بینش اور الوینہ قطار توڑتی ہوئی ایڈمن آفس چلی گئیں اور کچھ ہی دیر میں ہنستی مسکراتی ہوئی باہر نکل کر کینٹین کی جانب چل پڑی تھیں۔

"دونوں کسی امیر ماں باپ کی بگڑی ہوئی اولادیں لگ رہی ہیں۔" منال نے ان کو جاتا دیکھ کر دل میں سوچا تھا۔

ایڈمن آفس کی خواری سے فارغ ہو کر منال یونی ورسٹی کے مین گیٹ سے باہر آئی، تو اسے قریب ہی ایک دکان کے اندر پاؤں پسارے، چائے پیتا ہوا بابا اسحاق دکان دار سے گپ شپ لگاتا ہوا نظر آیا۔ دکان کے اوپر بڑے بڑے حروف میں 'فرید اسٹور' لکھا ہوا تھا۔ وہ وہیں چلی آئی۔ دکان دار نے اسے سر سے پاؤں تک عجیب نظروں سے دیکھا اور مسکرانے لگا۔

"السلامُ علیکم ابا... چلیں؟" اس نے دکان دار کی نظروں اور مسکراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے بابا اسحاق سے کہا۔

''وعلیکم السلام۔ چلو جی چلو پتری۔'' بابا اسحاق نے فوراً چائے کی پیالی ایک طرف رکھی اور دکان دار سے کہنے لگا۔

''لیکن فریدے! تُو میری بات ناں، لکھ کر رکھ لے۔ حکومت چلانا عورت کے بس کی بات نہیں ہے۔'' منال کو اندازہ ہو گیا کہ اس کے آنے سے پہلے بابا اسحاق اور دکان دار فرید کے درمیان گفتگو کا موضوع کیا تھا۔

''جانے دو چاچا۔ عورت کو ہلکا نہ لو۔'' فرید گو بابا اسحاق سے مخاطب تھا لیکن اس کی نظریں بدستور منال پر تھیں۔

''چل، فر دیکھیں گے یہ بے نظیر کیا کرتی ہے۔ پہلے حکومت تو بنا لے۔'' بابا اسحاق فرید کی طرف دو روپے کا ایک نوٹ بڑھاتے ہوئے بولا: ''لے پھڑ فر، چائے اور سموسے کے پیسے۔''

''او میں نے کہا چاچا جی! کیا کر رہے ہو؟ تسی مہمان ہو ساڈے۔'' فرید نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

''بلکہ دکان تو یہیں ہے، اور باجی کی یونی ورسٹی بھی۔ تو میں نے کہا، اگر آپ کو کبھی کسی شے کی ضرورت ہو تو بغیر شرمائے مجھے بتانا ہے۔''

آخری جملہ اس نے منال کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ منال نے اپنی چادر کو درست کیا اور اپنا ایک اٹیچی کیس اٹھانے لگی۔

''او میں نے کہا، چھوڑیں آپ! میں اٹھاتا ہوں۔''

فرید نے اس سے پہلے ہی اٹیچی کیس اٹھا لیا تھا۔ منال جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ فرید نے دوسرا اٹیچی کیس بھی اٹھا لیا۔

''او میں نے کہا، آجاؤ تسی۔'' اس نے دکان سے نکلتے ہوئے ان دونوں سے کہا تھا۔ بابا اسحاق نے چلتے چلتے اپنی کھیڑی کو بکل لگائی اور باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے منال بھی تھی جسے فرید سے کوفت ہو رہی تھی۔

دکان کے باہر کچھ قدم پر ہی ایک تانگہ کھڑا ہوا تھا۔

''او صابر اوئے! میں نے کہا، ادھر آجا۔ سواریاں بٹھانی ہیں۔'' فرید نے آواز دے کر تانگے والے کو بلایا تھا جو اس کا شناسا ہی لگ رہا تھا۔ تبھی اس کی آواز سن کر تیزی سے تانگہ بھگاتا ہوا ان کے قریب آگیا۔

''خیال رکھنا ان کا۔'' فرید نے سامان تانگے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''او میں نے کہا، وہ جو عورتوں والا ہاسٹل نہیں ہے لڑکوں کے سکول کے قریب، بس وہیں جانا ہے انہیں۔''

''جی، ٹھیک ہے جی۔'' تانگے والے نے سر ہلا کر جواب دیا تھا۔

''اور بات سن! ان کا کرایہ مجھ سے آکر لے لینا۔ سمجھو، میری اپنی برادری کے ہیں۔'' فرید نے کہا تو بابا اسحاق تانگے پر سوار ہوتا ہوتا رک گیا۔

''نہ نہ، کرایہ میں دے دوں گا۔ تو نے پہلے ہی مجھ سے چاء پانی کے پیسے نہیں لیے۔''

''او میں نے کہا چاچا، خیر ہے۔ تسی اپنے ہی ہو۔ اور اپنوں میں لین دین نہیں چلتا۔ چل صابر، انہیں خیال سے لے جا۔ گرمی تنگ کر رہی ہو گی۔'' فرید کی نظروں اور گفتگو کا محور ایک بار پھر منال تھی جو تانگے کی نشست پر بیٹھ چکی تھی۔ کچھ ہی لمحوں میں تانگہ روانہ ہو چکا تھا۔

''بڑا اچھا اور شریف منڈا تھا۔'' بابا اسحاق نے فرید کی تعریف کی تھی۔

''جی، کچھ زیادہ ہی شریف تھا۔'' منال منہ میں بدبدا کر رہ گئی۔

....☆....

یاسر نے فوراً پلٹ کر دیکھا اور خوف سے تقریباً اچھل ہی پڑا۔ اس کے پیچھے ایک جرمن شیفرڈ کتا کھڑا غرا رہا تھا۔ یاسر کا سانس ایک لمحے کے لیے اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ جہاں وہ کھڑا تھا، وہاں سے گیٹ کا فاصلہ کچھ قدم ہی تھا لیکن یاسر کو یقین تھا کہ اگر اس نے ہلنے کی کوشش کی تو اس کے گیٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی کتا اسے دبوچ چکا ہو گا۔

''ہش ہش...!! جیک! ہش..!'' اسی وقت اندر سے وہ آدمی باہر آیا اور اس نے بروقت جیک کو یاسر پر حملہ کرنے سے روک دیا۔ جیک فوراً اس کی طرف لپک کر دم ہلانے لگا تھا۔ اس آدمی کے پیچھے پیچھے ایک ہاتھ میں سگار پکڑے، کلف لگے کپڑے پہنے ایک اور شخص بھی باہر آیا۔

''کدھر ہے وہ....؟''اس کی متلاشی نظروں نے فوراً ہی یاسر کو دیکھ لیا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا: ''میں رستم ہوں، تمہیں یہ کارڈ کس نے دیا؟'

تحکمانہ انداز میں اس نے یاسر سے پوچھا تھا۔

''عبدل صاحب نے خود....ان کی گاڑی سے ایک بچہ ٹکرا گیا تھا۔ بچے کے لواحقین نے انہیں اور ان کی گاڑی کو روک رکھا ہے۔''

ابھی اس کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس شخص نے یاسر کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس جیپ کی طرف قدم بڑھا دیے جسے ایک ڈرائیور گیراج سے نکال کر ان کے قریب لے آیا تھا۔ کندھے پر ایک گن لٹکائے گارڈ نے بھاگتے ہوئے گیٹ کھولا۔ تب تک رستم جیپ میں بیٹھ چکا تھا۔

''مم....میری سائیکل......'' یاسر اپنے منہ میں منمنا کر رہ گیا اور جیپ میں گارڈ کے ساتھ بیٹھ کر راستہ بتانے لگا۔

....☆....

دو دن کے بعد منگلا اصغر شاہ کے گھر کے باہر موجود تھا۔ اطلاعی گھنٹی بجنے پر اصغر شاہ نے ہی دروازہ کھولا تھا۔

''ارے! تم آئے ہو...! آجاؤ اندر۔'' انہوں نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا تھا۔ منگلا مسکراتا ہوا ان کی دہلیز پار کر کے اندر آگیا۔

''السلامُ علیکم شاہ جی...''

''وعلیکم السلام....یقین کرو، میں تمہارا ہی سوچ رہا تھا۔ پوچھو کیوں..؟'' اصغر شاہ نے برآمدے میں کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں شاہ جی؟ مجھ ناچیز کو کیسے یاد کر رہے تھے؟'' منگلا نے حیرت سے پوچھا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

''تم نے بتایا تھا ناں کہ تم پڑھائی کے بعد کوئی کورس کر رہے ہو۔ کتنا کورس رہ گیا ہے تمہارا؟'' اصغر

شاہ نے دوسری نشست سنبھالتے ہوئے کہا۔

''بس دو مہینے اور لگیں گے۔ پھر مجھے سر ٹیفیکیٹ مل جائے گا۔'' منگلا کے لہجے میں تجسس تھا۔

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہو گئی ہے!'' اصغر شاہ طمانیت سے مسکرائے۔

'' دراصل ہمارے اسکول میں محمد فرقان صاحب استاد ہیں۔ انہوں نے کل ہی بتایا ہے کہ انہیں کچھ دن بعد استعفیٰ دینا ہے۔ انہوں نے قائداعظم یونی ورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا ہے۔ میں تمہارے آنے سے پہلے یہی سوچ رہا تھا کہ شوکت کو بھیج کر تمہیں بلوالوں اور تمہیں اس ملازمت کی پیشکش کروں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟'' ان کی بات سن کر حیرت اور خوشی سے منگلا کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔

''شاہ جی.... مجھے تو یقین نہیں آرہا۔'' خوشی کے مارے منگلا سے ٹھیک سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

''میں تو آج آپ سے ملنے اس لیے آیا تھا تاکہ اُس دن کے لیے شکریہ ادا کر سکوں۔ ابھی تو میں نے اُس کا احسان نہیں اُتارا، آپ ایک نئی عنایت کر رہے ہیں۔'' اصغر شاہ مسکرائے۔

''ارے بھئی! نہ اس دن تمہیں تھوڑا آرام دینا احسان تھا اور نہ یہ ملازمت تمہیں دے کر میں آج احسان کر رہا ہوں۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے اور یہ تو میں اپنی سہولت دیکھ رہا ہوں کہ اخبار میں ملازمت کا اشتہار دینے اور انٹرویوز کرنے سے بچ جاؤں گا۔ تم ایسا کرو، دو تین دنوں میں اپنی سی وی لے کر آجانا تاکہ اگر تم ہمارے معیار پر پورا اترے تو محمد فرقان صاحب جانے سے پہلے تمہیں کچھ چیزیں سمجھا دیں۔''

''جی جی ضرور... میں سی وی لے کر حاضر ہو جاؤں گا، ان شاءاللہ۔''

منگلا کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اچانک کچھ یاد آنے پر اس نے اپنی گود میں رکھا بیگ کھولا اور اس میں سے 'دیوانِ ساغر صدیقی' نکال کر اصغر شاہ کی طرف بڑھائی: ''یہ میں آپ کے لیے لایا تھا۔''

''واہ بھئی! بہت خوب...!!'' اصغر شاہ نے شوق سے کتاب پکڑی اور اس کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔

'' تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ مجھے مطالعے کا شوق ہے؟''

''اُس دن جس کمرے میں بیٹھ کر ہم نے کھانا کھایا تھا، وہاں ایک الماری میں بے شمار کتابیں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ بس اس الماری پر نظر پڑتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ آپ مطالعے کے شوقین ہیں۔'' منگلا نے بتایا تو اصغر شاہ ہنس پڑے۔

''تم نے بالکل درست اندازہ لگایا تھا۔ مجھے واقعی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔'' اصغر شاہ اب کتاب کی ورق گردانی کر رہے تھے۔

''مجھے خوشی ہے کہ آپ کو میرا دیا ہوا تحفہ پسند آیا۔'' منگلا مسکرایا۔

''کتاب کا تحفہ تو کسی بد ذوق کو ہی برا لگ سکتا ہے!'' اس وقت گیٹ پر زوردار سی دستک ہوئی اور پھر کچھ توقف کے بعد آواز آئی:

''اصغر شاہ صاحب...'' منگلا نے چونک کر گیٹ کی جانب دیکھا۔

''آجائیں بھئی عبدالکریم! گیٹ کھلا ہوا ہے۔!'' اصغر شاہ نے وہیں بیٹھے بیٹھے آواز لگائی تھی۔ ان کے کہنے پر عبدالکریم صاحب گیٹ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے بلال بھی تھا۔ سلام دعا کے بعد بلال نے اصغر شاہ سے پوچھا:

''انکل! عمر کہاں ہے؟''

''اندر ہے بیٹا...! جاؤ، تم لوگوں کا پروگرام آنے والا ہو گا ٹی وی پر۔''

اصغر شاہ نے کہا تو وہ ہنستا ہوا اندر بھاگ گیا۔ میاں عبدالکریم ان کے قریب رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ منگلا خاموشی سے آنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ عبدالکریم دبلے پتلے سے، باریش اور وجیہہ آدمی تھے۔ ان کی بچپن ہی سے اصغر شاہ سے دوستی تھی۔ ایک ساتھ پڑھے، کھیلے اور زندگی کے کئی سال ایک ساتھ گزارنے کے بعد بھی ان کی دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ انھوں نے سلام دعا کے بعد حیرت سے اصغر شاہ کو دیکھا:

''ان کا تعارف...؟'' عبدالکریم کا اشارہ منگلا کی جانب تھا۔

''میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ اسپتال سے واپس آتے ہوئے میری ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی

تھی؟ یہ وہی نوجوان ہے، منگلا۔''

اصغر شاہ نے جواب دیا تو منگلا خفیف سا مسکرایا۔ اسے علم ہو گیا تھا کہ اس کا پہلے سے غائبانہ تعارف ہو چکا ہے۔

''صحیح.....''عبدالکریم صاحب دھیما سا مسکرائے۔

''منگلا...! یہ عبدالکریم ہیں۔ میرے بہ گہرے دوست۔ ہر شام کر ہم دونوں اکھٹے چائے پیتے اور ہمارے بچے اکھٹے عینک والا جن دیکھتے ہیں اور پھر جنوں کی طرح آپس میں لڑتے ہیں!!''اصغر شاہ کی بات سن کر تینوں ہنس پڑے۔

''ارے بھئی مراد...! چائے کب تک پلاؤ گے؟ عبدالکریم آچکے ہیں!''اصغر شاہ نے آواز لگائی تھی۔

''بس، شاہ جی، آوی گئی چاء...'' باورچی خانے سے ایک ٹرے میں چائے کے تین کپ سجائے مراد نمودار ہوا تھا۔ اس شام کو برآمدے میں اصغر شاہ، منگلا اور عبدالکریم صاحب، ان تین نفوس کی دلچسپ محفل جمی تھی۔

.....☆......

بیڈ کے دائیں جانب الماری کے قریب دیوار پر لگے آئینے میں الوینہ نے اپنا جائزہ لیا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک وہ ڈھیلے ڈھالے سے لباس میں ملبوس، چہرے پر تکیہ رکھے بے زار سی لیٹی ہوئی تھی۔ بیڈ پر ہی ایک جانب واک مین پر میڈونا کے گانے لگے ہوئے تھے۔ واک مین میں اڑسے ہوئے ہیڈ فونز کا دوسرا سرا اس کے بائیں کان میں تھا۔ میڈونا کے یہ گانے اس کے پسندیدہ تھے لیکن اس وقت اس کے پورے وجود پر جیسے مردنی چھائی ہوئی تھی۔

کچھ دیر تو وہ تکیے سے چہرہ ڈھانپے، بے چینی کی حالت میں ایک پاؤں کو ہلاتی رہی، پھر تنگ آکر اس نے تکیہ دور پھینکا اور ایک ہاتھ سے جھٹکے کے ساتھ کان سے ہیڈ فون نکال کر بیڈ پر پٹخے۔ پھر خود بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ کھڑکی سے لڑکیوں کے ہنسنے بولنے کی مدہم سی آوازیں اندر آرہی تھیں۔ الوینہ نے کچھ لمحے تو ان آوازوں کو غور سے سننے کی کوشش کی، پھر اچانک بدمزہ ہو کر اٹھی اور

کھڑکی بند کر دی۔

چھت پر لگے پنکھے کی ہوا سے اس کے بال بار بار اس کے چہرے پر آرہے تھے۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو دیکھا۔ سرخ اور نیلے چیک پرنٹ والے شرٹ پاجامے میں، آنکھوں کے گرد پھیلے ہوئے کاجل اور مسکارے کے ساتھ آئینے میں کھڑی الوینہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"باہر سب ہنس بول رہے ہیں، تمہیں کیا مسئلہ ہے؟"

"مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" الوینہ نے آئینے کو جواب دیا۔

"تو پھر جاؤ تم بھی، زندگی کو انجوائے کرو۔ یہاں کیوں بیٹھی ہوئی ہو؟" آئینے نے پوچھا تھا۔

"کیونکہ میری زندگی میں کچھ ہے ہی نہیں جسے انجوائے کر سکوں۔"

اس نے آئینے کو جواب دیتے ہوئے اپنی آنکھ کے گرد پھیلے کاجل کو انگلی سے صاف کرنا چاہا۔

"زندگی خود بخود خوشگوار نہیں بن جاتی، اسے بنانا پڑتا ہے۔" آئینے نے نصیحت کرنا چاہی۔

"کتنی کوششیں کر چکی ہوں۔ زندگی خوش گوار بنتی ہی نہیں ہے۔"

کمرے میں کھڑی الوینہ اور آئینے میں نظر آتی الوینہ، دونوں کی آنکھوں میں نمی اتری تھی۔

"دوبارہ کوشش کر لو۔ تم اسی لیے ہاسٹل آئی رہنے کے لیے آئی ہو ناں تاکہ تمہارے ماحول میں کچھ تبدیلی آسکے۔ تو دیکھو، یہاں بہت لڑکیاں ہیں، شاید کوئی پُر خلوص لڑکی تمہیں مل ہی جائے، جیساکہ تم چاہتی ہو۔"

آئینے نے مدد کرنا چاہی۔ الوینہ نے گہرا سانس لیا۔ اچانک اس کی نظر آئینے کے اوپر لگی گھڑی پر پڑی جہاں پانچ بج رہے تھے۔

"اوہ..! پانچ بجنے والے ہیں! ساڑھے پانچ بجے شہروز نے آجانا ہے۔"!

الوینہ نے فوراً اپنے آنسو صاف کیے اور کمرے سے منسلک باتھ روم میں چلی گئی۔ آنسوؤں کی وجہ سے کاجل مزید پھیل گیا تھا۔

دس منٹ میں نہا کر وہ تازہ دم ہو کر باتھ روم سے باہر نکلی تھی۔ ایک ہاتھ میں پکڑے ہیئر ڈرائر سے

بال سکھاتے ہوئے وہ دوسرے ہاتھ سے مسلسل بالوں میں انگلیاں پھیل کرانہیں سلجھا رہی تھی۔ فلئیر پینٹ کے اوپر ڈینیم کی کھلی سی شرٹ پہنے الوینہ نے ہونٹوں پر ہلکا گلابی رنگ کا لپ گلوس لگایا، کانوں میں سلور رنگ کے آویزے پہنے اور اپنے اوپر پرفیوم کا سپرے کر کے ایک آخری تنقیدی نظر آئینے میں نظر آتے اپنے سراپے پر ڈالی۔

تازہ دھلے بالوں کو اس نے کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ کر وہ خود ہی بشاشت سے مسکرا دی۔ اب نظر آنے والی الوینہ آدھا گھنٹہ پہلے والی الوینہ سے یکسر مختلف اور تازہ دم لگ رہی تھی۔ آئینے نے بھی مسکرا کر اسے دیکھا۔ الوینہ نے الماری کھول کر اس میں سے اپنے کورٹ شوز نکالے اور انہیں پہننے لگی۔ اسی وقت ہاسٹل کے کمرہ نمبر گیارہ میں سامان رکھنے اور کچھ دیر بیٹی کے ساتھ وقت گزار کر بابا اسحاق نے ساہیوال واپسی کے لیے نکلنا چاہا تھا۔

"اچھا دھیے! رب راکھا۔ خیال رکھنا اپنا، ٹھیک ہے؟ پریشان نہ ہونا۔"

بابا نے گیٹ سے نکلتے ہوئے منال کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا تو منال کا دل بھر آیا۔

"جی ابا.... تم بھی اپنا بہت خیال رکھنا۔" اس نے آنسوؤں کو آنکھوں میں اترنے نہیں دیا، ورنہ ابّا پریشان ہو جاتے۔

ابّا کے جانے کے بعد واپس آکر وہ اپنے کمرے کی طرف جا ہی رہی تھی کہ اس کی راہ داری کے آخر میں بنے کمرہ نمبر اِکیس کا دروازہ کھلا اور وہاں سے نک سک سی تیار الوینہ باہر نکلی۔

"اتنی امیر کبیر ہو کر بھی یہ ایسے ہاسٹل میں رہ رہی ہے؟"

منال کو اسے وہاں دیکھ کر شدید حیرت ہوئی تھی۔ اپنی دھن میں مگن الوینہ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے پیچھے وائٹ مسک کی مسحور کن خوشبو چھوڑ گئی تھی۔

....☆....

سارا رستہ جیپ میں ایک بارعب سی خاموشی چھائی رہی تھی۔ یاسر کو جلتے ہوئے سگار کے دھویں سے گھٹن کا احساس ہو رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی بڑی مہم کا حصہ بنتا جا رہا ہے۔

عبدل کا گھبرانا اور امیر کبیر، بارسوخ سے رستم کا فوراً اس کی مدد کے لیے روانہ ہونا... یہ سب یاسر کو الجھا رہا تھا۔ جلد ہی وہ حادثے کی جگہ پر پہنچ گئے۔ مجمع اب قدرے چھٹ چکا تھا۔ ڈرائیور نے جیپ جائے وقوعہ کے قریب روکی اور گن مین نے تیزی سے اتر کر قریب ہی کھڑے ایک شخص سے پوچھا۔

"یہاں تھوڑی دیر پہلے ایک حادثہ ہوا تھا۔ اس کا کیا ہوا؟"

"جی جی، یہاں گاڑی نے معصوم سے بچے کو ٹکر ماردی تھی۔ میں اُدھر دکان کے باہر لگے نلکے پر وضو کر رہا تھا جب مجھے ایک زوردار آواز آئی۔" وہ شخص لمبی گفتگو کرنے کے موڈ میں تھا لیکن رستم کے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ اس نے اپنی جانب کا شیشہ نیچے کر کے گارڈ کو ہاتھ سے اشارہ کیا تو اس نے اس شخص کو ڈانٹا:

"لمبی کہانیاں نہ سنا۔ جو پوچھو ہے اس کا جواب دے۔ کدھر گئے ہیں یہ لوگ؟"

وہ شخص رستم کو دیکھ کر اور گارڈ کی ڈانت سن کر گھبرا گیا اور جلدی سے بولا:

''پولیس لے گئی جناب۔ بچہ تو ہسپتال میں ہے، وہ ایکسیڈنٹ والا بندہ تھانے میں ہے۔''

اتنا سنتے ہی گارڈ پھرتی سے جیپ میں بیٹھا اور ڈرائیور کو تھانے کی طرف چلنے کو کہا۔

''ٹھہرو...!'' رستم نے بارعب انداز میں کہا تھا: ''اترو تم....!'' اس کا اشارہ یاسر کی طرف تھا۔

یاسر چونک گیا۔ وہ تو بہت تسلی سے بیٹھا ہوا تھا کہ اس سارے قصے کا انجام دیکھ کر ہی جائے گا۔

''جج...جی...؟'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ گارڈ نے تیزی سے اتر کر یاسر کی طرف کا دروازہ کھولا اور اسے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

''لیکن جناب....وہ.....میری سائیکل.....'' یاسر نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

''کل آکر لے لینا۔'' رستم نے قیمتی نگینوں سے جڑی انگوٹھیاں پہنے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

یاسر کے باہر نکلنے کے بعد گارڈ واپس جیپ میں بیٹھ گیا اور جیپ روانہ ہو گئی۔

''عجیب لوگ ہیں.....!'' ان کے جانے کے بعد وہ شخص، جس نے انہیں تھانے کے بارے میں بتایا تھا، یاسر کے قریب آکر کہنے لگا۔

''عجیب تو واقعی ہیں!'' یاسر بڑبڑایا تھا۔

....☆....

''سر! اللہ تعالیٰ ہم پر بہت مہربان ہے!'' سر عظمت سے ملتے ہی منگلا نے کہا تھا۔ اس سے خوشی سنبھالے نہیں جا رہی تھی۔

''کیا ہوا منگلا...؟ بہت خوش ہو!'' سر عظمت نے چشمے کے اوپر سے اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھا۔

''سر جی...! میں آج پلان کے مطابق اصغر شاہ سے ملنے گیا تو انہوں نے مجھے اپنے اسکول میں ملازمت کی پیشکش کر دی۔''

منگلا نے خوشی سے بتایا۔

" ان کے اسکول کے ایک استاد جاب چھوڑ رہے ہیں،اس لیے انھوں نے مجھے جاب کی پیشکش کی ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی خبر ہے.... تمہاری وہاں خود بخود جگہ بن رہی ہے!" سر عظمت کے لہجے میں بھی خوشی تھی۔

"جی سر....! اور اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں نے اس جماعت میں شامل ہو کر بالکل درست فیصلہ کیا ہے۔ اللہ میرے لیے راہیں آسان کر رہا ہے تاکہ میں لوگوں کو سچائی کی طرف بلاؤں۔" منگلا جذباتی لہجے میں کہہ رہا تھا:

"مجھے اس جماعت میں آئے ابھی ایک سال ہوا ہے اور اللہ نے مجھے موقع فراہم کر بھی دیا کہ میں کسی کو سیدھے راستے کی طرف لے کر آؤں۔"

"اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ ہم نے سچائی کا راستہ اختیار کیا ہے۔ ورنہ اکثر لوگ تو بس گمراہی کے راستے پر چل رہے ہیں اور ہمیں یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ ہم انہیں بھی ہدایت کے راستے کی طرف لائیں۔"

سر عظمت نے منگلا کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا:

" چلو اب اپنے اگلے کام کی جانب توجہ کرو تاکہ کسی سرخرو ہو کر ہم اپنے لیے اور لوگوں کے لیے دنیا اور آخرت کی راحت کا سامان کر سکیں۔"

"جی سر.... بالکل... سر جی..!" منگلا نئے عزم کے ساتھ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔

.....☆......

شہروز کی مٹیالے رنگ کی Daihatsu Charade کینال روڈ پر فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے اندر کیسٹ پلئیر پر نازیہ حسن کا گانا اونچی آواز میں لگا ہوا تھا اور شہروز اور الوینہ اس کے سُروں کے ساتھ اپنے سُر ملا رہے تھے۔

"ڈسکو دیوانے.... آہاں.... آہاں....."

سڑک کے ایک جانب گھنے درختوں کی طویل قطار تھی اور دوسری جانب اگست کے ڈوبتے سورج کا عکس بی آر بی نہر کے پانی میں جھلملا رہا تھا۔ گاڑی کی سن روف ہٹی ہوئی تھی جہاں سے آتی شام کی ہوا میں الوینہ کے خوبصورت بال بار بار اس کی آنکھوں کے آگے آرہے تھے۔

''تمھیں ہاسٹل وارڈن کا کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گا؟'' شہروز نے پوچھا مگر ہوا اور گانے کے شور میں الوینہ تک اس کی آواز نہیں پہنچی تھی۔ شہروز نے سن روف بند کرنے کا بٹن دبایا، ساتھ ہی کیسٹ پلئیر کی آواز آہستہ کر دی۔

''اوہو، اونچی آواز میں چلنے دوناں۔ ایسے گانے اونچی آواز میں ہی سننا اچھا لگتا ہے۔''

الوینہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا، پھر منہ بناتے ہوئے والیم بڑھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن شہروز نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''ارے، میں پوچھ رہا ہوں کہ ابھی ہمیں کہیں بیٹھ کر ڈنر بھی کرنا ہے۔ واپس ہاسٹل پہنچتے پہنچتے رات کے آٹھ نو بج جائیں گے۔ تمہاری وارڈن کو کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گا؟''

''اوہ ایڈ من مائی فُٹ! اس سے کون ڈرتا ہے بھئی؟ اور وہ ہوتی کون ہے میرے لیے کوئی مسئلہ کھڑا کرنے والی!! ڈیڈی نے پہلے ہی اسے کہہ دیا ہے کہ وہ مجھے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ So I'm not worrying about her anymore.''

الوینہ نے ہاتھ بالوں میں پھیرتے ہوئے انہیں سیٹ کرنے کی کوشش کی۔

''اعلیٰ ہو گیا یہ تو!'' شہروز نے ایک گاڑی کو اوورٹیک کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے ہاسٹل میں جو رہنا شروع کیا ہے، وہ زبردست ہے۔ اس طرح ہم کبھی بھی، کسی بھی وقت مل سکتے ہیں۔''

''کبھی بھی، کسی بھی وقت...؟'' الوینہ ہنسی۔

''میں تو یہی چاہوں گا کہ کبھی بھی، کسی بھی وقت ہماری ملاقات ہوا کرے اور بار بار ہوا کرے۔''

شہروز نے معنی خیز لہجے میں اسے دیکھتے ہوئے کہا تو الوینہ کے چہرے پر ایک تاریک سایہ سا لہرایا لیکن

پھر اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

''وہ تم نے ایف ایس سی کی فئیر ویل پارٹی میں کیا شعر پڑھا تھا؟ قدر گم کر دیتا ہے ہر وقت کا ملنا۔''

اپنی طرف سے الوینہ نے بالکل صحیح شعر پڑھا تھا۔

''تم نے تو اچھے بھلے شعر کی ٹانگ ہی توڑ دی ہے۔'' شہروز اس کی شاعری پر ہنسا تھا۔

''امیر مینائی صاحب فرماتے ہیں:

گاہے گاہے کی ملاقات ہی اچھی ہے امیر

قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا

''بھئی ایک ہی بات ہے۔'' الوینہ نے ایک ادائے لاپرواہی سے ہاتھ ہلایا۔

''لیکن میرے دل سے تمہاری قدر کم ہو ہی نہیں سکتی، چاہے ہم ایک دوسرے کے ساتھ چوبیس گھنٹے گزاریں۔'' شہروز نے گھمبیر لہجے میں کہتے ہوئے اسٹیرنگ وئیل سے اپنا ہاتھ ہٹا کر الوینہ کی ران پر دھرے ہاتھ پر رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ کی حدت کو محسوس کر کے الوینہ کو اپنا آپ پگھلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

''چلو اب روڈ پر دھیان دو۔ کہیں ایکسیڈنٹ ہی نہ کروا لینا۔'' الوینہ نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا تو شہروز نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ واپس سٹیرنگ وئیل پر رکھ لیا۔ الوینہ نے ہاتھ بڑھا کر کیسٹ پلئیر کی آواز دوبارہ اونچی کر لی تھی۔

.....☆.....

''اتنی دیر کہاں لگا دی تم نے؟ تم تو گوشت خریدنے نکلے تھے؟'' یاسر گھر میں داخل ہوا ہی تھا کہ پودوں پر پانی کا چھڑکاؤ کرتی شبنم نے پوچھا۔

''گوشت...؟'' یاسر چونکا۔ پھر سر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''اوہ! وہ تو میرے ذہن سے بالکل نکل ہی گیا''!!

''کیا مطلب ہے کہ ذہن سے نکل گیا؟'' شبنم نے مگ ایک جانب رکھتے ہوئے اسے غصے سے گھورا۔

''باجی! یقین کریں، میں دکان کی طرف جا ہی رہا تھا کہ بس ایک معاملے میں پھنس گیا۔ اور اس کے

بعد میں بھول گیا۔"

یاسر نے بے چارگی سے کہا اور صحن میں رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اب میں کیا پکاؤں گی؟ دو گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہی تھی کہ تم گوشت لے کر آؤ تو میں بریانی پکاؤں۔ اتنا دل تھا میرا....اب کھانا تم رات کی بچی ہوئی چنے کی دال!" شبنم نے غصے سے مگ بالٹی میں پٹخا:

"اور.... تمہاری سائیکل کہاں ہے؟" شبنم کے پوچھنے پر یاسر کو دوبارہ سائیکل کی یاد ستائی۔

"وہ.....وہ ایک دوست کے پاس ہے۔ اسے ضرورت تھی۔ کہہ رہا تھا کہ کل مل جائے گی۔"

یاسر نے آنکھیں موند کر ایک ہاتھ سے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے بتایا۔

"مل ہی نہ جائے کہیں!" شبنم نے جل کر جواب دیا اور پاؤں پٹختی ہوئی اندر چلی گئی۔

"باجی! پلیز پانی پلا دیں۔ سچ میں بہت تھک گیا ہوں۔" یاسر نے وہیں سے آواز لگائی تھی۔ باجی کا جواب حسبِ توقع تھا!

"خود ہی اٹھ کر پی لو۔ میں کوئی نہیں دے رہی۔"

کرسی پر نیم دراز یاسر آنکھیں موندے، پیشانی مسلتا ہوا رستم اور عبدل کے بارے میں سوچ جا رہا تھا۔

.....☆.....

"ابا جان! ایک بات پوچھوں آپ سے؟" بلال اپنے والد کے ساتھ نماز پڑھ کر چہل قدمی کرتے ہوئے واپس گھر کی جانب جا رہا تھا۔

"جی بیٹے، پوچھو۔" عبدالکریم صاحب نے جواب دیا تھا۔

"آپ وعدہ کریں کہ ناراض نہیں ہوں گے۔"

بلال نے حفظِ ماتقدم کے طور پر پہلے ہی وعدہ لینا چاہا۔ عبدالکریم صاحب اُس کی اِس حرکت پر ہنس پڑے۔

"اچھا، وعدہ کرتا ہوں کہ ناراض نہیں ہوں گا۔ اب پوچھو۔"

''ابا جان!....'' بلال نے جھجکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔''جب اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی جنت اور جہنم بنا دی ہے اور انہیں علم ہے کہ کون جنت میں جائے گا اور کون جہنم میں، تو انہوں نے انسان کو بنایا ہی کیوں؟
'

اس کا سوال سن کر عبدالکریم صاحب مسکرا دیے۔ یہ سوال بچپن میں کئی دفعہ ان کے ذہن میں بھی آیا تھا۔

''آپ مجھے ایک بات بتائیں پہلے، اگر ایک برتن میں بہت گرم پانی ہو اور آپ کی امی جان آپ کو کہیں کہ اس برتن کو ہاتھ مت لگانا ورنہ ہاتھ جل جائے گا۔ اور پھر بھی آپ ہاتھ لگا دیں، تو قصور کس کا ہوا؟''

''میرا....'' بلال نے جواب دیا۔

''ظاہر سی بات ہے آپ کو تکلیف ہو گی، تو اس پر دوا بھی لگانا پڑے گی، ہو سکتا ہے ڈاکٹر کے پاس بھی جانا پڑے۔ یعنی آپ کے ایک عمل سے بتدریج ایک سلسلہ شروع ہو جائے گا، جسے chain reaction کہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ ہاتھ نہیں لگائیں گے، تو کس کی بچت ہوئی؟'' عبدالکریم صاحب نے بیٹے کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ظاہر ہے تب بھی میرا فائدہ ہوا....!'' بلال مسکرایا۔

''اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے پیغمبروں اور انبیاء کے ذریعے یہ بات بتا دی ہے کہ اللہ پر اور نبی ﷺ پر ایمان لائیں اور نیک عمل کریں تو انعام میں جنت ملے گی اور اگر ایمان نہیں لائیں گے تو جہنم میں جائیں گے۔ اللہ نے انسان کو عقل دی ہے تاکہ وہ عقل استعمال کر کے خود فیصلہ کرے کہ اس نے کہاں جانا ہے۔ وہ جو فیصلہ کرے گا، جو کام کرے گا، وہ اس انسان کو اس کی منتخب منزل تک لے جائے گا۔''

''لیکن.....'' بلال کے ذہن میں ابھی بھی کچھ الجھن باقی تھی۔

''ہمیں امتحان میں ڈالنے کی بجائے یا اس زمین پر بھیجنے کی بجائے اللہ تعالیٰ نے سیدھا جنت اور جہنم میں کیوں نہیں ڈال دیا؟''

''کیونکہ بیٹے....!'' عبدالکریم صاحب اپنے دونوں بازوؤں کو پیچھے باندھے چل رہے تھے۔ رات کا

اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن آسمان پر چودھویں کے چاند کی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔

"اگر ایسا ہو اور اللہ تعالیٰ انسانوں کا امتحان لیے بغیر ہی کچھ کو جہنم اور کچھ کو جنت میں ڈال دیں تو جہنم میں جانے والے احتجاج کریں گے کہ ہمیں موقع کیوں نہ دیا گیا؟ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ کی کلاس میں استاد کہیں کہ مجھے معلوم ہے کس نے سالانہ امتحان میں فیل ہونا ہے اور کس نے پاس...، تو میں امتحان لیے بغیر ہی فیل اور پاس کر دیتا ہوں، تو جو طلباء نالائق ہیں، وہ اعتراض کریں گے ناں کہ یہ تو ناانصافی ہے! کیا پتا ہم بھی پاس ہو جاتے.... بس اسی مثال سے سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عقل دے کر اس دنیا میں کیوں اتارا۔"

"یہ تو ایسے لگ رہا ہے جیسے یہ زندگی امتحان گاہ ہے اور ہمارے سالانہ امتحان ہو رہے ہیں۔ جو اس زندگی میں محنت کرے گا یعنی قرآن و سنت کے مطابق زندگی گزارے گا، وہ رزلٹ والے دن یعنی قیامت میں پاس ہو جائے گا اور جو اِس زندگی کو قرآن و سنت کے مطابق نہیں گزارے گا تو وہ یقینی طور پر قیامت کے دن فیل ہو جائے گا۔ ایسا ہی ہے ناں؟"

بلال کے لہجے میں اب اطمینان تھا کہ جو سوال اسے پریشان کر رہے تھے، ان کے تسلی بخش جواب اسے مل گئے تھے۔

"جی بیٹے! ایسا ہی ہے۔ شاباش... !آؤ اب دکان کی طرف چلتے ہیں۔ تمہاری ماں نے کہا تھا کہ ڈبل روٹی لانا مت بھولنا۔"

عبدالکریم صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا اور دونوں باپ بیٹا قریب ہی دکان کی جانب بڑھ گئے۔

.....☆......

"سنو منال، تمہارے پاس ٹوتھ پیسٹ ہے؟ میرا چوری ہو گیا ہے۔" یہ فاطمہ تھی، منال کی روم میٹ اور منال ہی کی طرح ایک لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والی لڑکی۔ اس دن بھی منال یونی ورسٹی جانے کی تیاری کر رہی تھی جب بمشکل جمائی کو روکتے ہوئے فاطمہ نے اس سے پوچھا۔ منال نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ لمبے بالوں کی چٹیا میں سے کچھ بال نکل کر الجھے ہوئے تھے۔ منال نے خاموشی سے

اپنا ٹوتھ پیسٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"لیکن تمہارا چوری کس طرح ہو گیا؟"

"یار، رات کو میں دانت برش کرنے کے بعد اپنا ٹوتھ پیسٹ وہیں باتھ روم میں بھول آئی تھی۔ اب دیکھا تو وہاں نہیں تھا۔ کسی لڑکی نے اٹھا لیا ہو گا۔"

فاطمہ نے بتایا۔

"لیکن پلیز، اسے واپس میری الماری میں رکھ دینا۔"

منال نے اس کی بے پرواہ طبیعت کو دیکھتے ہوئے اسے ہدایت دینا مناسب سمجھا۔ اس ایک ہفتے میں یہ فاطمہ کی تیسری چیز تھی جو وہ اپنی لاپرواہی کی سبب گم کر چکی تھی۔ ایک دفعہ یونی سے واپس آتے ہوئے راستے میں کچھ رقم گرا آئی تھی اور دوسری دفعہ 'ہسٹری آف انگلش لٹریچر' کی کتاب یونی ورسٹی کینٹین میں بھول آئی تھی۔ جب یاد آیا تب تک وہ کتاب وہاں سے اٹھائی جا چکی تھی۔ مجبوراً ایک سینیئر سے اس کی استعمال شدہ کتاب مانگنی پڑی۔

"ہاں ہاں، فکر نہیں کرو۔ اسے تو میں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھوں گی!" فاطمہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور باہر نکل گئی۔ منال دھیرے سے مسکرائی اور ناشتے کی غرض سے ڈائننگ ہال کی جانب بڑھ گئی۔ کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے کمرہ نمبر اکیس کی جانب دیکھا۔ وہ بند تھا۔

.....☆.....

یاسر بظاہر میدان کے گرد بنے سیمنٹ کے بلاک پر بیٹھا لڑکوں کا کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا لیکن اس کا ذہن ابھی بھی صبح کے واقعے کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ وہ کچھ کھویا کھویا سا لگ رہا تھا۔ اچانک اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا تھا۔

"یار...!! کس شہزادی کی یادوں میں گم ہو شہزادے؟" ذوالفقار اس کے برابر میں آکر بیٹھا تو وہ چونکا۔ پھر اس کی بات پر مسکرایا۔

"ہائے! ہمارے ایسے نصیب کہاں کہ کوئی شہزادی یا حسن پری ہماری یادوں میں اترے!" یاسر نے

مصنوعی آہ بھری تھی۔

''تیری نہ سہی، میری یادوں میں تو اترنے ہی والی ہے۔'' ذوالفقار نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ چونکا۔

''کیا مطلب...؟ سیدھی طرح بتا یار! تیرے تایا مان گئے؟'' یاسر جانتا تھا کہ ذوالفقار اپنے تایا جی کی بڑی بیٹی کو پسند کرتا ہے، تبھی اس کے گھر والوں نے پچھلے مہینے تایا جی کے گھر رشتے کی بات ڈالی تھی۔ تایا جی کو تو کوئی وعتراض نہیں تھا البتہ تائی جی کو ذوالفقار کی آمدنی پر اعتراض تھا۔

''مہینے کا دس ہزار کماتا ہے بس۔ اتنے میں میری بیٹی کا گزارا کیسے ہو گا وہاں؟''

تائی جی کی بس یہی ایک گردان تھا اور ان کی اسی گردان اور اعتراض کو دور کرنے کے لیے ذوالفقار اچھی ملازمت کی تلاش میں تھا۔

''انہوں نے ماننا ہی تھا!'' ذوالفقار نے بھی میچ دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تجھے بتایا تھا ناں کہ میری سٹیل مل میں نوکری لگ گئی تھی۔ بیس ہزار روپے ماہانہ کی تنخواہ۔ تائی جی کو جیسے ہی پتا چلا، فوراً ہاں کر دی۔'' اس دفعہ یاسر نے اس کے کندھے پر دھپ سے ہاتھ مارا۔

''مبارک ہو یار...! صحیح جوڑی بنی ہے تیری۔ جتنا تُو چالاک ہے، اُتنی ہی شبینہ بھابھی سیدھی سادھی ہیں۔ تجھے بھی سیدھا کر دیں گی۔''

محلے دار ہونے کی وجہ سے یاسر اپنے دوست ذوالفقار اور اس کے پورے خاندان کو جانتا تھا اور شبینہ کے ساتھ تو وہ لوگ بچپن ہیں پکڑن پکڑائی بھی کھیلتے رہے تھے۔ یاسر کی بات سن کر ذوالفقار خوب زور سے ہنسا تھا۔

''مجھے چھوڑ، تُو اپنی سنا۔ کن سوچوں ہیں گم تھا؟ اور یہ آج صبح اُدھر چورنگی پر کیا تماشا ہوا تھا؟ بڑے بھیا بتا رہے تھے کہ کسی گاڑی نے ٹکر شکر مار دی تھی بچے کو؟''

یاسر نے کچھ لمحے سوچا کہ ذوالفقار کو بتائے یا نہیں، لیکن پھر یہ سوچ کر کہ کوئی چھپانے والی بات تو ہے نہیں، اسے پورا ماجرا سنا ڈالا۔

''تو تجھے کیا چیز کھٹک رہی ہے؟ ایسے چھوٹے موٹے ایکسیڈنٹ تو ہوتے رہتے ہیں۔''

ذوالفقار کے پاؤں کے پاس گیند آکر گری تھی، اس نے گیند کو واپس لڑکوں کی طرف پھینکتے ہوئے یاسر کو کہا۔

''پتا نہیں یار، مجھے خود سمجھ نہیں آرہی کہ ایسا کیا ہے جو مجھے بے چین کر رہا ہے۔'' یاسر نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا: ''لیکن کچھ تو ہے... یار تُو یقین نہیں کرے گا، اس بندے رستم کی کوٹھی اتنی بڑی اور شاندار ہے کہ کیا بتاؤں، بلکہ کل میں نے اپنی سائیکل لینے جانا ہے وہاں، تُو بھی میرے ساتھ چلنا۔'

''چل ٹھیک ہے، میں چلوں گا۔ اب تو مجھے اپنا آپ عمران سیریز کا علی عمران لگ رہا ہے''!

ذوالفقار نے ہنستے ہوئے کہا تو یاسر بھی اس کے بازو پر مکا مارتے ہوئے ہنس پڑا۔

.....☆......

''سر! کیاآپ جارہے ہیں...؟''اسکول میں یہ بات پھیل چکی تھی کہ ٹیچر سر محمد فرقان اسکول سے جارہے ہیں۔ایک طالب علم فاخر نے سر سے پوچھا۔بلیک بورڈ کے سامنے کھڑے سر محمد فرقان مسکرائے۔

''بیٹھ تو جاؤ تم لوگ....!سب نے کل کے سبق کی تیاری کی ہے ناں؟''

''جی سر...!'' طلباء نے جواب دیا

''اب سبھی لوگ اپنی اپنی کتابیں کھول لیں۔'' سر کے کہنے پر ہر طالب علم نے اپنی کتاب کھول لی۔سر نے ایک کتاب کھولتے ہوئے کلاس کو متوجہ کیا،اچانک ایک طرف سے ہنسنے کی آواز آئی تو فرقان صاحب نے ڈانٹ پلائی:

''عمر...!کیا مسئلہ ہے تمھارا...؟'' سر کے گھورنے پر عمر کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا کھڑا ہوا گیا۔

''سوری سر جی...''عمر نے معذرت کی تو سر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔

''سر!آپ جارہے ہیں؟'' فاخر کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

''ہاں بھئی لڑکو!میں اگلے مہینے میں جارہا ہوں۔''

''سر!نہ جائیں ناں...!''لڑکوں نے احتجاج کیا تھا۔

''ویسے تو تم لوگ دعائیں مانگتے تھے کہ سر چھٹی پر چلے جائیں تاکہ پڑھنے کی بجائے تم موج مستی

کر سکو، اب کہہ رہے ہو کہ نہ جائیں''!

سر فرقان بھی استاد تھے! طلباء کی دعاؤں کی نوعیت سے بخوبی آگاہ! ان کی بات پر کلاس ہنس پڑی۔

''نہیں نہیں سر! ہم تو آپ کی صحت کے لیے دعا گو رہتے تھے۔'' نوید نے فوراً کہا تھا۔ وہ کلاس کا سب سے پڑھاکو لڑکا تھا۔

''سر، آپ کی جگہ کون آئے گا؟'' عامر نے پوچھا۔

''کوئی تو آئے گا بھئی۔ ابھی آپ لوگوں نے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ چلو بس اب باتیں بند کرو۔'' سر نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''آج ہم سیکھیں گے کہ زمین کس طرح اپنے مدار کے گرد گھومتی ہے۔'' ابھی سر مزید کہنے ہی والے تھے کہ مبشر بول اٹھا۔

''سر! پھر کیا آپ ہمارے ساتھ ٹرپ پر بھی نہیں جائیں گے؟'' سر نے اسے گھور کر دیکھا۔ سبھی طلباء سر کی جانب دیکھ رہے تھے۔

''آپ کا ٹرپ کب ہے؟''

''اگلے مہینے سر جی۔'' عزیز نے جواب دیا۔ کلاس کے باقی لڑکے باتوں میں مصروف تھے۔

''پھر تو ظاہر سی بات ہے کہ میں نہیں جا پاؤں گا۔'' سر مسکرائے۔ کلاس میں 'اوہ' کی آوازیں ابھریں۔

''سر! آپ نہیں جائیں گے تو ہمیں مزا کیسے آئے گا؟'' بلال نے افسردہ لہجے میں کہا تھا۔

''ارے بھئی لڑکو! کیا ہو گیا ہے؟؟'' سر نے حیرت سے کہا۔

''اتنے اُداس کیوں ہو رہے ہو؟ مجھے یقین ہے تم لوگوں کو مجھ سے بھی زیادہ اچھے ٹیچر ملیں گے۔ میں بھی تو دو سال پہلے ہی اس سکول میں آیا تھا۔ مجھ سے پہلے بھی تو تم لوگ خوش تھے ناں؟ میرے جانے کے بعد بھی خوش ہی رہو گے ان شاءاللہ۔''

''سر! آپ بہت اچھا پڑھاتے ہیں۔ آپ کی کلاس میں بہت مزا آتا ہے۔'' چھوٹے قد کا محسن بولا تھا۔

''سر! آپ ہمیں ہمارے لیول پر آکر سکھاتے ہیں۔ ورنہ سر جمیل سے ہم کچھ پوچھیں تو وہ چڑ جاتے ہیں کہ ہمیں یہ بات بھی نہیں پتا، حالانکہ ہمیں نہیں پتا تبھی تو سکول میں آتے ہیں۔'' زکریا نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ آج لڑکوں کا پڑھنے کا موڈ نہیں لگ رہا تھا۔ سر مسکراتے ہوئے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

''مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ لوگ مجھ سے مطمئن ہیں۔ ایک استاد کی سب سے بڑی کامیابی ہی یہی ہوتی ہے کہ اسکے طلباء کو اس سے تدریس کے سلسلے میں کوئی شکایت نہ ہو اور وہ بغیر کسی خوف کے اس استاد سے سیکھ سکیں۔ تم سبھی میرا فخر اور وقار ہو۔''

''سر! وقار یونس والا وقار....؟''

کلاس کے سب سے چلبلے لڑکے ریحان نے کہا تو کلاس کا اچھا بھلا جذباتی سا ماحول فوراً اڑن چھو ہو گیا اور سبھی ہنس پڑے۔

.....☆......

''الوینہ...!! یہ لڑکی کون ہے بیٹی....؟''

ڈیڈی نے ایک جانب دیکھتے ہوئے پوچھا تو کرسی کے بازو کی لکڑی کو اپنے ناخن سے کھرچتی الوینہ نے ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ وہاں منال گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی، اپنے سامنے ایک کتاب رکھ کر، ایک گھٹنے پر رجسٹر رکھے کچھ لکھ رہی تھی۔ سر پر اوڑھے دوپٹے سے بالوں کی کچھ لٹیں نکل کر اس کی شفاف گندمی رنگت والے ماتھے پر جھول رہی تھیں جنہیں وہ غیر ارادی طور پر بار بار کان کے پیچھے اڑس رہی تھی لیکن کچھ ہی لمحوں بعد کان کے پیچھے سے کھسکتی، پھسلتی ہوئی وہ لٹیں دوبارہ ماتھے پر جھولنے لگتیں۔

''منال ہے۔ میرے کمرے کے قریب ہی اس کا کمرہ ہے۔ میری کورس میٹ بھی ہے۔'' الوینہ نے بے دھیانی میں جواب دیا۔

''اوہ اچھا...!!'' ڈیڈی نے ہنکارا بھرا۔ نظریں بدستور منال پر جمی تھیں۔ الوینہ کو کوفت ہونے لگی۔

''مجھے کچھ پیسے تو دے دیں۔ ایک دو ہزار روپے۔''

"اس کے چہرے پر کتنی معصومیت ہے۔" ڈیڈی کے جواب پر الوینہ کو حیرت ہوئی۔

"ڈیڈی پلیز..." الوینہ نے اچھنبے سے کہا:

"ہر جگہ مت شروع ہو جایا کریں!" اس کی بات سن کر ڈیڈی نے قہقہہ لگایا۔

"کم آن الوینہ!! تم تو ایسے ری ایکٹ کر رہی ہو جیسے میں نے اس کی تعریف کر کے کوئی گناہ کر دیا ہے"!

ڈیڈی نے آخر کار نظریں منال سے ہٹا ہی لی تھیں۔

"مجھے آپ کا پتا ہے، تبھی کہہ رہی ہوں کہ پلیز۔" الوینہ کی نظروں میں التجا تھی۔

"اوکے اوکے....!!!" ڈیڈی نے آنکھیں گھماتے ہوئے جواب دیا۔

"کبھی کبھی تو تم مجھے بالکل اپنی ماں جیسی لگتی ہو۔ اب کیا میں کسی کے حسن اور معصومیت کی تعریف بھی نہیں کر سکتا؟" ڈیڈی نے بدمزہ ہوتے ہوئے جیب سے سگار نکالا۔ الوینہ ان کی بات کے جواب میں خاموش رہی اور بس کرسی کے بازو کی لکڑی کو کھرچتی رہی۔

"بہر حال، میں لاہور آیا تھا تو سوچا تم سے بھی مل لوں۔ تمہیں یہاں کسی قسم کا مسئلہ تو نہیں ہے؟" ڈیڈی نے سگار کو سلگاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ڈیڈی، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہے۔" الوینہ نے آہستگی سے جواب دیا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ ہاسٹل کے برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے باپ بیٹی اس کے بارے میں کیا باتیں کر رہے تھے، منال گھاس پر بیٹھی اپنی پڑھائی کرنے میں مصروف تھی۔

....☆....

دن سہ پہر کو یاسر ذوالفقار کی سائیکل کے پیچھے بیٹھ کر رستم کی کوٹھی کے سامنے پہنچ گیا تھا۔

"یہ تو واقعی بہت بڑی کوٹھی ہے۔ محل ہی لگ رہا ہے!" ذوالفقار نے چار دیواری کے عقب سے نظر آتی عمارت کو دیکھتے ہوئے تعجب سے کہا۔

"دیکھا، میں نے کہا تھا ناں! اور ابھی تو تم نے اندر سے اسے نہیں دیکھا۔ گھاس کے ایسے خوب

صورت قطعے ہین کہ انسان کا دل خوش ہو جائے۔'' یاسر نے اس کی سائیکل کے کیریئر سے اترتے ہوئے کہااور آگے بڑھ کر گیٹ پر لگی گھنٹی بجادی۔ کچھ دیر بعد کسی نے ذیلی گیٹ پر بنی درز میں سے باہر دیکھا۔

''اوہ اچھا، تم ہو.....!'' دیکھنے والا یاسر کو پہچان گیا تھا۔ کچھ ثانیے بعد ذیلی گیٹ کھلا اور اس میں سے وہی گارڈ باہر نکلا جو پچھلے دن جیپ میں ان کے ساتھ تھا۔اس گارڈ نے یاسر کی سائیکل پکڑی ہوئی تھی۔

''یہ لو اور فوراً یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔'' گارڈ نے حقارت والے لہجے میں سائیکل اس کی طرف تقریباً پھینکتے ہوئے کہا تو ذوالفقار کا خون کھول اٹھا۔

''تمیز سے بات کرو''!

''کیا کہہ رہا ہے؟'' گارڈ اپنی گن کو اس کی طرف سیدھا کرتے ہوئے بڑھا لیکن یاسر درمیان میں آ گیا۔

''کچھ نہیں۔ ہم جا رہے ہیں۔ چلو ذلفی...!'' یہ کہتے ہوئے یاسر نے زمین پر گری اپنی سائیکل اٹھائی اور دوسرے ہاتھ سے ذلفی کا رخ دوسری جانب موڑا۔ وہ ابھی بھی گارڈ کو گھور رہا تھا۔ دونوں اپنی اپنی سائیکلوں پر سوار پیڈل مارتے ہوئے وہاں سے روانہ ہو گئے۔

''تیری بولتی کیوں بند ہو گئی تھی اس کے سامنے؟'' ذلفی نے اب یاسر پر چڑھائی کی۔

''عقل کرو یار! کیوں اپنی شامت کو آواز دے رہے ہو''!

یاسر نے سائیکل چلاتے ہوئے چہرہ موڑ کر اپنے عقب میں دیکھا۔ گارڈ وگیٹ سے واپس اندر جا چکا تھا: ''تم نے ابھی رستم کو نہیں دیکھا۔ وہ ہوتا تو تمھیں کوئی رعایت نہیں ملنی تھی۔ وہیں کھڑے کھڑے گولیوں سے بھون دیتا۔''

''ایسے کیسے بھون دیتا...'' ذلفی سارا غصہ پیڈل پر نکال رہا تھا: ''اس کمینے کا انداز دیکھا تھا بات کرنے کا؟ اور سائیکل اس طرح پھینکی تھی جیسے ہم نے اس سے ادھار مانگا ہو۔'' جواب میں یاسر کچھ نہیں بولا۔ حقیقت یہی تھی کہ اسے بھی گارڈ کی حرکت بہت بری لگی تھی۔

''بات سن یاسر!'' کچھ دیر خاموشی کے بعد ذلفی نے کہا۔ ''تیرے پاس اس بچے کا کوئی اتا پتا ہے جس

کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا؟"

"اتنا پتا تو نہیں لیکن اتنا پتا ہے کہ اسے جنرل ہسپتال لے گئے تھے۔ کیوں؟" یاسر نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ تھانے یا ہسپتال جا کر پتا تو کریں کہ اس بندے عبدل کا کیا بنا؟ ابھی تک تھانے میں ہی ہے یار ستم نے اسے چھڑوا لیا ہے؟" ذلفی نے سائیکل کی گھنٹی بجاتے ہوئے سڑک کے تقریباً اوپر چلتے ایک راہگیر کو خبردار کیا۔

"چھوڑو یار....، ہمیں کیا پڑی ہے اس معاملے میں کودنے کی۔" یاسر نے جواب دیا تھا۔

"نہیں، اب تو مجھے بھی تجسس ہے کہ اتنی بڑی حویلی کا مالک ہمارے چھوٹے سے شہر میں کہاں سے آ گیا۔ میں تو معاملے کی تہہ تک پہنچ کر ہی دم لوں گا۔"

ذلفی کے لہجے میں عزم تھا۔ یاسر مسکرایا۔

"تم میں سچ میں علی عمران کی روح آگئی ہے"!

یاسر نے کہا تو ذلفی نے مسکراتے ہوئے اپنی سائیکل کا رخ جنرل ہسپتال کی طرف موڑ لیا۔ یاسر اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ دونوں جنرل ہسپتال کے سائیکل اسٹینڈ پر اپنی سائیکلیں کھڑی کر کے بچہ وارڈ کی جانب جا رہے تھے جب یاسر بولا:

"یار ذلفی! ہمیں وارڈ کے اندر جانے کون دے گا؟ مجھے تو بچے یا اس کے باپ کا نام بھی نہیں پتا۔"

"دیکھا جائے گا۔ کچھ نہ کچھ کر ہی لیں گے۔ تجھے پتا تو ہے تیرے اس بھائی کا دو نمبری کاموں میں خوب دماغ چلتا ہے!" ذوالفقار نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"وہ تو ہے!" یاسر بھی ہنسا، پھر سامنے نظر پڑتے ہی ٹھٹک کر رک گیا۔

"کمال ہو گیا! دو نمبری کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی"!

"کیوں، کیا ہوا؟" ذوالفقار نے نہ سمجھتے ہوئے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ وہاں ایک کینٹین سے لوگ نان کٹلس، چاول چھولے اور اسی طرح کی دوسری اشیاء خرید کر کھا رہے تھے۔

''وہ سامنے، نیلی قمیض شلوار میں بچے کا باپ ہے۔'' یاسر نے آنکھوں سے ایک شخص کی جانب اشارہ کیا جو ایک تھیلے میں کھانے پینے کا سامان اٹھائے ہسپتال کی جانب جا رہا تھا۔

''اوہ، چلو پھر اس کے پاس۔'' ذوالفقار نے یہ کہتے ہوئے تیزی سے اس شخص کی جانب قدم بڑھا دیے۔ یاسر اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

''لیکن اس سے بات کیا کریں گے؟''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔'' ذوالفقار نے جواب دیا تھا۔

....☆....

''میٹرک میں بھی فرسٹ ڈویژن اور کالج میں بھی! گڈ'' منگلا سی وی لے کر اصغر شاہ کے پاس پہنچ چکا تھا۔ وہ اس وقت اپنے سکول کے پرنسپل روم میں بیٹھے ہوئے تھے اور منگلا کی سی وی دیکھ رہے تھے۔

'' مشاغل میں کرکٹ....! بھئی، آج کل کے نوجوانوں کو تو کرکٹ کا جنون ہے۔ میرے اپنے بیٹے نے اپنے کمرے کی دیواروں پر وسیم اکرم اور عمران خان کے پوسٹر سجا رکھے ہیں۔'' اصغر شاہ نے بتایا تو منگلا ہنستے ہوئے کہنے لگا:

''بس جی، کہنے کو تو پاکستان کا قومی کھیل ہاکی ہے لیکن یہاں بچوں کے لیے پارک نہیں ہیں، ہاکی گراؤنڈ کہاں سے ملیں! لے دے کر بس کرکٹ ہی بچتی ہے جو ہر طبقہ آسانی سے کھیل سکتا ہے۔ تین اینٹوں یا کرسی کو وکٹ بنایا اور گلی میں کرکٹ میچ شروع۔''

''ہاں! ہم نے بھی اپنے بچپن اور جوانی میں بہت کرکٹ کھیلی ہے۔ بیٹ کے پیسے نہیں ہوتے تھے تو اماں کے کپڑے دھونے والے ڈنڈے کو بطور بیٹ استعمال کرتے تھے اور پھر اماں بے چاری اسے ڈھونڈتی رہتی تھیں!'' اصغر شاہ ہنسے تھے۔ بچپن کی یادیں خوبصوت ہوتی ہیں۔

''اسکول کے گیٹ سے داخل ہوتے ہوئے مجھے دائیں جانب کافی بڑا میدان نظر آیا تھا۔'' منگلا نے کہا تو اصغر شاہ نے سر ہلایا۔

''تم نے ہی تو کہا تھا کہ پاکستان میں بچوں کے لیے پارکس اور کھیلنے کے میدان ہیں، تو جب میں نے

اسکول تعمیر کروانا شروع کیا تو اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ بچوں کے لیے ایک میدان ضرور ہو جہاں بریک کے وقت وہ کھل کر کھیل سکیں۔ اور الحمدللہ، بچے اور ان کے والدین بہت خوش ہیں اس اقدام سے۔'' اصغر شاہ نے بتایا۔

''بہر حال، مجھے تمہاری سی وی بہت اچھی لگی ہے۔ تم اپنی طرف سے تیار رہنا۔''

''جی ٹھیک ہے شاہ جی۔'' منگلا نے جواب دیا۔

''ہوں....'' اصغر شاہ نے ہنکارا بھرا۔

کچھ روز بعد فرقان صاحب کا آخری دن ہو گا۔ پھر تم اسکول جوائن کر لینا۔ کیا خیال ہے؟''

''جی جی.... شاہ جی، ضرور۔''

منگلا نے خوش سے کہا تو اصغر شاہ اسے کام کی نوعیت، تنخواہ اور دیگر معاملات کے بارے میں تفصیل بتانے لگے۔

....☆......

ڈیڈی سے ملاقات کرنے سے پہلے الوینہ کا موڈ جتنا بہتر تھا، ان سے ملاقات کے بعد اتنا ہی خراب ہو گیا تھا اور اب وہ دوبارہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پردے برابر کیے، اوندھے منہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔

یونی ورسٹی شروع ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا اور اس ایک ہفتے میں کلاس میں موجود سبھی طلباء و طالبات ایک دوسرے سے مانوس ہو چکے تھے۔ اگر نہیں ہوئے تھے تو الوینہ سے... نہ جانے یہ اس کے حسن کا رعب تھا یا اس کی دولت کا کہ کوئی اس سے اول تو بات ہی نہ کرتا، اور اگر وہ خود کسی سے بات کرنے میں پہل کرتی تو اگلا بندہ اتنا گڑبڑا جاتا کہ ٹھیک سے اس سے بات ہی نہ کر پاتا۔ دو لڑکوں نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ ان کی دوستی کے پیچھے دولت کی غرض چھپی ہوئی ہے۔

''لوگوں کے عین درمیان میں، لیکن اکیلی!'' وہ اب سیدھی لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ ہجوم میں تنہائی اس کا بچپن سے مسئلہ تھا۔ لیکن بچپن میں اتنا محسوس نہیں ہوا تھا جتنا اب ہوتا تھا۔ وہ تین سال کی تھی جب ممی نے ڈیڈی کی دل پھینک فطرت سے تنگ آکر خلع لے لی تھی اور اپنی بیٹی کو آیا کے رحم و کرم پر چھوڑ

کر اپنی نئی دنیا بسا کر کینیڈا چلی گئی تھیں۔ رہے ڈیڈی تو انہیں ویسے ہی اپنی نجی محفلوں اور کاروباری مصروفیت سے فرصت نہیں ملتی تھی کہ اپنی بیٹی کی طرف توجہ دے سکیں۔ لے دے کر بس ایک آیا ہی تھی جو مارے بندھے اس کا خیال رکھتی تھی، اور خیال بھی کیا رکھتی تھی، بس:

''بے بی میڈم نے کھانا کھالیا؟' '

''بے بی میڈم! آئیں سکول کے لیے تیار کر دوں۔''

''بے بی میڈم! ملک شیک پی لیں۔''

جیسی ضروریات پوری کر کے وہ اپنی تئیں 'الوینہ بے بی میڈم' کا پورا خیال رکھتی تھی۔ اس کے نزدیک ایک بچے کو بس کھانے پینے اور اچھا لباس پہننے کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک بچے سے دوستی کون کرے!!

چھوٹی سی الوینہ اسکول میں جی بھر کر کھیلتی اور گھر آ کر بس اپنی گڑیا کر پکڑ کر کمرہ کمرہ جھانکتی رہتی کہ کوئی اس کے ساتھ کھیلنے والا مل جائے، اور پھر ایک دن ڈرائیور انکل نے اس سے دوستی کرلی۔ اسکول آتے جاتے ہوئے وہ اس سے کتنی ہی باتیں کرتے تھے، اسے چاکلیٹ دلاتے تھے، کبھی کبھی اس کے گالوں پر پیار بھی کر لیتے تھے اور ایک دن تو اسے اپنی گود میں بٹھا کر اس سے گاڑی بھی چلوائی تھی۔

الوینہ بے بی میڈم ڈرائیور انکل کی صورت میں ایک دوست کو پا کر خوش ہو گئی تھی لیکن پھر ایک دن ڈرائیور انکل نے دوستی کا مفہوم ہی بدل دیا تھا۔

ہاسٹل کے کمرہ نمبر اکیس میں بیڈ پر لیٹ کر چھت کو گھورتی الوینہ کے ذہن میں اکثر ماضی کی یہ ریل چلتی تھی اور اس کے ذہن کو جھنجلا کر رکھ دیتی تھی۔ اُس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ اضطرابی حالت میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا۔ دماغ سے ابھی بھی وہ منظر غائب نہیں ہوا تھا۔ الوینہ بے قرار ہو کر اٹھی اور باتھ روم میں چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر اپنے وجود کی وحشت کو کم کرنے لگی۔

....☆....

"السلامُ علیکم بچو!" اصغر شاہ ساتویں جماعت کے کمرے میں داخل ہوئے تو سارے لڑکے احتراماً کھڑے ہو گئے۔ اصغر شاہ کے پیچھے پیچھے منگلا بھی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ کلاس میں اس وقت سر لیاقت موجود تھے اور ریاضی کا پیریڈ چل رہا تھا۔

"وعلیکم السلام سر۔" سب لڑکوں نے بیک وقت جواب دیا تھا۔

"آپ بیٹھ جائیں سب۔" اصغر شاہ نے سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سر لیاقت نے بھی اپنی کرسی چھوڑ دی تاکہ اصغر شاہ اس پر بیٹھ جائیں۔

"نہیں لیاقت صاحب، آپ بیٹھیں۔ میں بس نئے ٹیچر کا ان بچوں سے تعارف کروانے آیا ہوں۔" اصغر شاہ نے سر لیاقت کو کہنے کے بعد لڑکوں کو مخاطب کیا۔ "یہ آپ کے نئے کلاس ٹیچر ہیں منگلا صاحب.... !آپ سبھی جانتے ہیں کہ سر فرقان کا پرسوں اسکول میں آخری دن تھا۔ آج سے منگلا صاحب نے ہمارے اسکول کو جوائن کر لیا ہے۔"

"جی ٹھیک ہے سر.... !" پوری کلاس نے یک زبان جواب دیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے امید ہے جس طرح آپ نے سر فرقان کو کسی بھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا، سر منگلا کو بھی نہیں دیں گے۔"

"یس سر!" سارے لڑکے شوق سے منگلا کو دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ کیسے استاد ہوں گے۔ ان دونوں کے جانے کے بعد بلال نے عمر کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"میں نے سنا تھا کہ لمبے قد والے لوگ بہت نرم دل کے ہوتے ہیں۔ مجھے لگ رہا ہے سر منگلا بھی بہت اچھے ہوں گے۔"

"دیکھتے ہیں۔" عمر نے بھی جواباً سرگوشی کی تھی۔ اچانک اس کے سر پر چاک کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا آ کر لگا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا تو سر لیاقت ان دونوں کو ہی گھور رہے تھے۔

"پتا ہے ناں کہ میری کلاس میں باتیں کرنا سختی سے منع ہے!" انہوں نے سخت لہجے میں کہا تھا۔ عمر اور بلال دبک کر بیٹھ گئے۔

سوموار سے منگلا نے سکول جوائن کر لیا تھا۔ وہ انسٹی ٹیوٹ کے قریب سے ویگن پکڑتا اور سکول سے دس منٹ دور اسٹاپ پر اتر جاتا۔ وہاں سے اسے پیدل چل کر آنا پڑتا تھا۔اس کے پاس چھٹی سے دسویں جماعت تک کی کلاسیں تھیں۔ کلاسوں کے علاوہ سکول کے دوسرے معاملات میں بھی وہ ہلکی پھلکی مدد کروادیا کرتا تھا۔ تبھی جلد ہی اس نے سب کے دلوں یں اپنے لیے جگہ بنالی تھی۔ بچوں میں بھی وہ خاصا مقبول ہو گیا تھا۔

اس دن ساتویں جماعت کی کمپیوٹر کلاس تھی۔

"السلامُ علیکم جوانو!" لڑکے کپیوٹر لیب میں اپنی اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے جب منگلا اندر داخل ہوا۔

"وعلیکم السلام سر!" سارے لڑکوں نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔ دوسرے بچوں سے، جن کی کمپیوٹر کلاس منگلا لے چکا تھا، وہ منگلا کی تعریفین سن چکے تھے۔

"پڑھائی تو ہوتی رہے گی، پہلے ایک سوال ہے میرے پاس آپ سب کے لیے۔"

منگلا نے تجسس پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ساری کلاس اس کی طرف مکمل طور پر متوجہ ہو گئی تھی۔

"Why did the computer keep sneezing?" اس نے سوال پوچھ کر پوری کلاس پر ایک نظر ڈالی۔ لڑکوں کی نظروں میں شوق اور چہرے پر الجھن کے تاثرات تھے۔ بچے آپس میں کھسر پھسر کرنا شروع ہو گئے۔

"کسی کو کوئی جواب سوجھا؟"

"نہیں سر....!! آپ بتائیں۔" عباد نے کہا تھا۔

"ارے بھئی! "!Because it had a virus منگلا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو پہلے تو ساری کلاس چونکی، پھر سمجھ آنے پر سبھی ہنس پڑے۔ انہوں نے منگلا کے بارے میں جتنی تعریفیں سنی تھیں، وہ سب سچ ثابت ہو رہی تھیں!

"سر جی! میرے پاس بھی ایک سوال ہے!" ریحان نے ہاتھ کھڑا کیا۔

’’پوچھیں۔‘‘ منگلا مسکرایا۔ وہ وائٹ بورڈ کے سامنے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا ہوا تھا۔
’’Why did the computer catch a virus?‘‘ ریحان نے شرارت سے پوچھا۔
’’یہ تو میرے سوال والا کمپیوٹر لگ رہا ہے!‘‘ منگلا ہنسا، پھر سوچنے کی اداکاری کرنے لگا۔ سب لڑکے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔ ’’اونہوں۔‘‘ منگلا نے سر کھجاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ’’میں نے ہار مان لی۔ تم بتاؤ جواب۔
’’Because it left its windows open!‘‘ ریحان نے ہنستے ہوئے بتایا۔ منگلا بھی ہنس پڑا۔
’’اچھا..! تو یوں میرے کمپیوٹر پر وائرس آیا تھا کیونکہ میں نے اس کی ونڈوز اوپن چھوڑ دی تھیں...! گڈ ون!‘‘
منگلا کھل کر ہنسا۔ یوں ہنستے مسکراتے، ہلکے پھلکے انداز میں کلاس کا آغاز ہو گیا تھا۔

.....☆......

منال کو ہاسٹل میں رہتے ہوئے دو ہفتے گزر چکے تھے اور ان دو ہفتوں میں اس کی اپنی روم میٹ فاطمہ سے بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ کمرہ نمبر سترہ کی نمرہ اور فوزیہ سے بھی دوستی تھی لیکن ان کے مضامین الگ تھے اس لیے ان سے بس ہاسٹل میں ہی ملاقات ہوتی۔
’’ارے.....ابا جی.......!!‘‘ ایک دن وہ یونی ورسٹی سے واپس آئی تو ہاسٹل کے گیٹ پر ہی اسے بابا اسحاق مل گئے جو اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ حیرت اور خوشی سے آگے بڑھی تھی۔
’’ہاں دھیے، میں...!‘‘ بابا کی آنکھوں میں بیٹی کو دیکھتے ہی چمک اتر آئی تھی۔ انہوں نے بیٹی کے سر پر پیار دیا۔
’’سب خیر تو ہے ناں ابا....؟ اماں ٹھیک ہے؟‘‘ منال نے ان کے ہاتھ کو پکڑتے ہوئے پوچھا۔ دل میں سو خدشات نے سر اٹھایا تھا۔

''ہاں ہاں دھی رانی! سب خیر ہے، سب چنگا اے!!'' بابا اسحاق اس کی فکر مندی محسوس کر کے مسکرائے۔

''تیری ماں بڑی اُداس ہو گئی اے! اسی نے مجھے بھیجا کہ جا کر منال کو لے آ.....تاکہ چھٹی ساتھ گزار لے''!

''سچ ابا.....!!''فکر مندی دور ہوئی تو اس کی جگہ خوشی نے لے لی۔

''آہو، چل اب جلدی کر۔ ٹیم تے نکلیے تے کل شامی ٹیم نال واپس آجایئے۔'' بابا اسحاق نے کہا تو منال بولی:

''لیکن ابا! تُو اندر تو آجا، پانی ہی پی لے۔ میں سامان رکھ کے ابھی آئی۔''

بیٹی کے کہنے پر بابا اسحاق ہاسٹل کے اندر ملاقات کے لیے بنے ایک کمرے میں جا کر بیٹھ گیا اور صافے سے اپنا پسینہ خشک کرنے لگا۔ منال اسے پانی کا گلاس پکڑا کر خود خوشی سے تقریباً بھاگتی ہوئی اپنی کمرے کے طرف بڑھ گئی۔ ہاسٹل میں دل لگنا اپنی جگہ، لیکن دل ابھی بھی گھر کے لیے مچلتا تھا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے باپ بیٹی کو خوشی بھرے لہجے میں باتیں کرتے ہوئے جاتے دیکھ کر الوینہ کی آنکھوں میں یاسیت اُتر آئی تھی۔

''باپ ایسے بھی ہوتے ہیں؟' '

مشقت بھرے چہرے اور قدرے خمیدہ کمر والے ایک باپ نے ایک کندھے پر اپنا صافہ اور دوسرے پر اپنی بیٹی کے سفری بیگ کا پٹار کھا ہوا تھا لیکن اس کی چال میں چستی تھی۔ جبکہ کالی زمین پر سفید کڑھائی والی سوتی چادر اوڑھے منال باپ کے قدم سے قدم ملا کر چلنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے دن بھر کی روداد سنا رہی تھی۔ الوینہ کی آنکھوں کے سامنے میرون رنگ کے چمڑے سے بنے شاہانہ سے صوفے پر بیٹھ کر سگار پیتے ڈیڈی آئے تھے۔

اسے لگا جیسے ڈیڈی کی انگلیوں میں جلتے سگار کا چبھتا ہوا دھواں اس کی آنکھوں میں اتر رہا ہو۔ اس نے ایک ہاتھ سے آنکھوں کو مسلتے ہوئے پردے برابر کر دیے۔ سڑک پر سے گرزتے باپ بیٹی کب کے وہاں

سے جا چکے تھے۔

.....☆......

''ہاہائے...! جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں اور میری بیٹی کا کیسا ماڑا سا منہ نکل آیا ہے'' منال کو دیکھتے ہی اماں خوشی سے اس کی طرف لپکی تھیں اور اسے سینے سے لپٹا کر پیار دینے کے بعد تشویش والی نظروں سے اب اسے دیکھ رہی تھیں۔ منال ہنس پڑی۔

''او سیانی لوکے..!'' ابا ان کی بات سن کر مسکرائے۔ وہ منال کا بیگ چارپائی پر رکھ کر خود بھی ڈھیلے انداز میں چارپائی پر بیٹھ گئے تھے اور اب اپنے بازوؤں کے سہارے اپنے آپ کو ٹیک دیے، ماں بیٹی کے پیار کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے: ''پہلے پانی تو پلادے، بعد میں باقی باتیں کرلینا۔''

''پانی کیوں، میں لسی پلاؤں گی ناں۔'' اماں نے آخری دفعہ منال کے سر پر ہاتھوں سے جما کر پیار دیا اور باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔ ''تھوڑی ہی دیر پہلے کمال برف کی یہ وڈی سل دے کر گیا ہے۔''

کمال کا نام سنتے ہی منال کی آنکھوں میں حیا اُتر آئی تھی۔

''اسے خبر ہوگئی تھی کہ میں منال دھی کو لینے جا رہا ہوں؟'' ابا نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''آہو...'' اماں نے باورچی خانے سے ہی جواب دیا:

''اس نے تیرا تانگہ بس سٹیشن پر بندھا ہوا دیکھ لیا تھا۔ تو شہر سے باہر تو تُو اب ایک ہی کام سے جاتا ہے ناں۔''

منال گو کمرے میں اپنی چادر کو تہہ کر کے دوپٹہ اوڑھ رہی تھی لیکن کان اس کے اماں ابا کی باتوں میں ہی لگے ہوئے تھے۔

''دیکھنا...! ابھی آجائے گا کسی بہانے سے۔'' ابا جی ہنسے: ''جیسے ہمیں کچھ پتا ہی نہیں ہے۔''

''ہاں تو اور بے چارہ کیا کرے!'' اماں ایک ہاتھ میں سٹیل کا جگ اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں سٹیل کے دو گلاس سنبھالے ہوئے باہر آئی تھیں۔ ''تُو نے ہی لارا لگایا ہوا ہے کہ پہلے منال ماسٹری کرلے، پھر ویاہ ہوگا۔ نہ تو اِس زمانے میں کمال کو رشتوں کی کمی تھوڑی ہے، پھر بھی شکر ہے کہ وہ اور ماسی بشیراں

انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ورنہ تو دبئی والے منڈوں کے پیچھے دس کڑیاں لگی ہوتی ہیں۔ اِدھر باپ بیٹی کے نخرے ہی نہیں ختم ہو رہے"!

عصر کے بعد کا وقت تھا اور کچے صحن میں پیپل کے درخت کی چھاؤں خوب مزا دے رہی تھی۔ اماں نے گلاسوں کو چارپائی کے بان پر ٹکاتے ہوئے منال کو آواز دی: "آجا منال! لسی پی لے پہلے"!

"آئی اماں!" منال نے جلدی سے دوپٹے کو سلیقے سے اوڑھا اور باہر نکل آئی۔ اماں نے ایک گلاس میں لسی ڈال کر اس کی طرف بڑھائی۔

"اماں! ابا کو دے ناں۔"

"پی لے بیٹی، پی لے! پہلے تُو جان بنا۔ ہاسٹل میں اللہ جانے کیسا کھانا ملتا ہے۔" ابا نے بھی فکر مندی دکھائی تھی۔ منال نے مسکراتے ہوئے گلاس تھام لیا۔ شکر، دہی اور دودھ کی بنی میٹھی جھاگ والی لسی کے اوپر برف کے دو بڑے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ منال لسی کا ٹھنڈا میٹھا مزا اپنے حلق میں اتارنے لگی۔

.....☆......

"بھائی صاحب...!" اس نے بچے کے باپ کو آواز دی تو اس نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔

"جی...؟"

"السلامُ علیکم... کیسے ہیں آپ...؟"

ذوالفقار نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو اس شخص نے نہ سمجھتے ہوئے اس سے مصافحہ کر لیا۔ اس کی نظروں میں الجھن اور اجنبیت تھی۔

"وعلیکم السلام...!! معاف کرنا بھائی، میں آپ کو پہچانا نہیں۔"

"کوئی بات نہیں بھائی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کا بیٹا اب کیسا ہے؟" ذوالفقار نے نہایت دوستانہ انداز میں پوچھا۔

"الحمد للہ، بہت بہتر ہے اب۔ شکر ہے اللہ کا۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"الحمد للہ، الحمد للہ...!" ذوالفقار نے ایسے کہا جیسے اسے بچے کی بہت فکر لگی ہوئی تھی۔

"ارے، ہم کھڑے کھڑے کیا باتیں کر رہے ہیں! اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو ہم کہیں بیٹھ جائیں؟ اصل میں ہمیں آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"

یاسر خاموشی سے ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔

"ضروری بات؟" اچانک وہ شخص کچھ محتاط سا ہو گیا: "کیا ضروری بات ہے؟ یہیں کر لیں۔"

"نہیں بھائی، ایسے کھڑے ہو کر تو ضروری بات نہیں ہو سکتی ناں! آپ ہمارے ساتھ آئیں، چائے پیتے ہیں۔ وہ سامنے چائے کی کینٹین ہے۔"

ذوالفقار نے نرمی سے کہا تو وہ شخص قدرے تامل کے بعد راضی ہو گیا اور ان دونوں کی معیت میں کینٹین کی جانب چل پڑا۔ لیکن چلتے چلتے وہ وقتاً فوقتاً کھوجتی نگاہوں سے اپنے گردو پیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ تینوں اس بات سے بے خبر تھے کہ کچھ فاصلے پر کھڑا ایک کسرتی جسم والا شخص ان کا تعاقب کر رہا تھا۔

"میرا نام ذوالفقار ہے اور یہ یاسر... ! آپ کا نامِ مبارک؟" ذوالفقار نے پوچھا تو اس کے انداز پر یاسر دل میں مسکرا دیا۔

"میں محمد وسیم ہوں۔" اس شخص نے ہاتھ میں پکڑا سامان کرسی کے قریب زمین پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ماشاء اللہ..." ذوالفقار اتنا کہہ کر کینٹین میں کام کرنے والے بندے کو تین چائے کا آرڈر دینے لگا۔ اس سے فارغ ہو کر دوبارہ وسیم کی جانب متوجہ ہوا۔

"ہم دونوں وہیں پر تھے جب آپ کے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ بلکہ اسے تو آپ پہچان ہی گئے ہوں گے۔" ذوالفقار نے یاسر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بچے سے باپ سے کہا۔ "عبدل کا پیغام لے کر یہی تو رستم صاحب کے پاس گیا تھا۔"

"جی جی، اب مجھے لگ رہا ہے کہ انہیں میں نے کل دیکھا تھا۔" وسیم نے یاسر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس اللہ کا کرم ہوا کہ آپ کے بیٹے کی جان بچ گئی۔ جان سے بڑھ کر تو کچھ بھی قیمتی نہیں ہے۔"

یاسر نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

''ہاں جی بالکل۔'' وسیم نے ہاں میں سر ہلایا۔ ''اور میں تو عام سا بندہ، محنت مزدوری کرنے والا۔ خرم.... میرا بیٹا...!! کل سے بستر پر پڑا ہے۔ آپ کو تو پتا ہے گورنمنٹ ہسپتال والے کہاں مریضوں کو ٹھیک سے دیکھتے ہیں، لیکن ایک بات ہے۔'' وسیم کہتے ہوئے میز پر آگے کی جانب جھکا، پھر دھیمی آواز میں کہنے لگا:

''عبدل صاحب دل کے اچھے آدمی نکلے، تبھی تو اپنی غلطی مان لی اور معافی کے طور پر ہمیں رقم بھی دی ہے تاکہ خرم کی اچھی دیکھ بھال ہو جائے۔ ورنہ آج کے دور میں کہاں کوئی اپنی غلطی مانتا ہے۔''

''اچھا...؟ انہوں نے رقم بھی دی؟ کتنی دی ہے...؟ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کیونکہ میرا بھائی نیوز رپورٹر ہے۔ تو ایسی خبریں وہ ہمیں بتاتا رہتا ہے کہ فلاں نے صلح کے لیے اتنی رقم دی تاکہ معاملہ اندر ہی نمٹ جائے اور تھانے کچہری کا چکر نہ لگے۔'' ذوالفقار نے بات بنائی۔

''اچھا اچھا....'' وسیم کو اس کے جواب سے کچھ تسلی ہو گئی۔ ''پچاس ہزار دیے ہیں انہوں نے۔''

''پچاس ہزار....؟'' یاسر اور ذوالفقار، دونوں ہی پچاس ہزار کا سن کر ہکا بکا رہ گئے۔ پھر ذوالفقار نے فوراً ہی اپنے تاثرات کو سنبھالا۔

''پچاس ہزار بالکل ٹھیک رقم ہے۔ اتنی ہی دینی چاہیے تھی۔ آپ کے بیٹے کو چوٹ بھی تو کافی لگی تھی۔''

''نہیں خیر، چوٹ تو اتنی زیادہ نہیں لگی۔'' وسیم صاف گو تھا۔ ''لیکن عبدل صاحب اور ان کے دوست رستم صاحب، دونوں نے ہی کہا کہ بیٹے کے علاج میں کوئی کمی نہ رہ جائے، اس لیے اتنی بڑی رقم دی۔ وہ تو کہہ رہے تھے کہ بیٹے کو پرائیوٹ ہسپتال لے جاؤں، وہاں کا سارا خرچہ یہ لوگ اٹھائیں گے۔ لیکن میں نے سوچا کہ یہیں ٹھیک ہے۔ کل تک ہسپتال سے فارغ ہو جائے گا ان شاءاللہ، تو پچاس ہزار رقم ہمارے کسی اور کام آجائے گی۔''

وسیم کا ذہن ایک متوسط پاکستانی طبقے کی نمائندگی کر رہا تھا۔

''جی بالکل ٹھیک سوچا ہے آپ نے۔'' ذوالفقار نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''ہے ناں...!'' وسیم خوش ہو گیا۔اسی اثناء میں کینٹین کے بندے نے ان کی میز پر چائے کے کپ لا کر رکھے تو تینوں نے اپنے اپنے کپ اٹھا لیے۔

....☆....

صبح اچھا بھلا موسم تھا، آسمان بالکل صاف تھا کہ اچانک نہ جانے کہاں سے ہوا کالے سیاہ، پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو گھیر گھار کر لے آئی اور سکول لگنے میں بس دس منٹ ہی باقی تھے کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اُس وقت منگلا ویگن سے اتر کر سکول کی جانب چلنا شروع ہو گیا تھا۔ اچانک شروع ہونے والی بارش سے وہ اپنا مناسب بچاؤ بھی نہ کر پایا۔

اسکول میں بھی بچوں کو فوراً ان کی کلاسز میں بھیج دیا گیا تھا اور اب بچے اپنی اپنی کلاس میں بیٹھے شرارتیں اور گپ شپ کرنے میں مصروف تھے۔ اساتذہ اسٹاف روم میں تھے۔ کچھ بچے اور اساتذہ، جو اپنے گھروں سے اسکول کے لیے نکل چکے تھے، ابھی بھی بارش میں بھیگتے ہوئے پہنچ رہے تھے کیونکہ اسکول شروع ہونے میں دس منٹ باقی تھے۔ باقی بچوں کے پاس چھٹی کرنے کا ایک معقول بہانہ آگیا تھا۔

''ارے! یہ کیا!!'' اصغر شاہ اسکول کے برآمدے میں کھڑے، پرنالے سے گرتے بارش کے پانی کو محویت سے دیکھ رہے تھے جب ان کی نظر سامنے سے آتے منگلا پر پڑی۔ وہ چونک اٹھے۔ منگلا بھاگتا ہوا ان کے پاس برآمدے میں آگیا۔ اس کے کپڑے بارش سے بُری طرح بھیگے ہوئے تھے۔

''السلامُ علیکم شاہ جی...!'' منگلا نے تھوڑا سا ٹھٹھرتے ہوئے کہا تھا۔

''وعلیکم السلام...! یہ کیا حال ہو گیا ہے منگلا؟'' اصغر شاہ تعجب سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"پتا نہیں یہ بارش کہاں سے اچانک آگئی"!

منگلا نے اپنے بالوں کو جھٹک کر پانی کے قطروں کو زمین پر پھینکا۔ پھر اپنی قمیض کا دامن نچوڑنے لگا۔اسی وقت سر سعید بھی اسکول میں داخل ہوئے اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے برآمدے میں ان کے پاس آگئے۔انہوں نے کپڑوں کے اوپر برساتی پہن رکھی تھی۔

"السلامُ علیکم شاہ جی..."!!

"وعلیکم السلام !آج تو سبھی کا برا حال لگ رہا ہے۔"اصغر شاہ نے کہا تھا۔

"میرا تو پھر بھی بہتر ہے، گھر سے نکلنے لگا تھا تو بارش شروع ہو گئی۔ فوراً واپس پلٹا اور برساتی پہن لی۔ منگلا کا حال تو بہت برا ہے"!

سر سعید نے منگلا کی جانب دیکھتے ہوئے افسوس سے کہا۔

"مجھے تو چالیس منٹ پہلے نکلنا پڑتا ہے۔جب گھر سے نکلا تو اس وقت بارش کا کہیں دور دور تک نام و نشان بھی نہیں تھا۔ ویگن سے اتر کر وہاں میں چلنا شروع کیا اور یہاں بارش شروع !"منگلا نے قمیض کو ہلا کر اسے کچھ سکھانے کی کوشش کی۔

"لگتا ہے کسی بچے نے آج کچھ زیادہ ہی دل سے دعا کی ہو گی کہ یااللہ ! بارش ہو جائے تا کہ سکول نہ جانا پڑے"!

سر سعید نے کہا تو تینوں ہنس پڑے۔

.....☆......

الوینہ بینش کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی تھی۔

"ابھی تو ہم شاپنگ کے لیے چلتے ہیں، پھر مووی نائٹ کریں گے۔اور کل فہد کی طرف باربی کیو پارٹی ہے۔"

بینش نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا تو الوینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"صلح ہو گئی اس سے ؟"الوینہ پسنجر سیٹ پر بیٹھ کر ہنسی۔

”سچ بتاؤں تو میں اور فہد تام اینڈ جیری ہیں۔ لڑے بغیر بھی مزا نہیں آتا لیکن زیادہ دیر ایک دوسرے سے ناراض رہ بھی نہیں سکتے“!

بینش نے ہنستے ہوئے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ الوینہ نے اس کی بات سن کر قہقہہ لگایا۔

”یار! مال میں نیلوفر شاہد کی نئی کولیکشن آئی ہے۔ وہ چیک کرتے ہیں۔“ الوینہ نے گول فریم والے سن گلاسز کو آنکھوں پر سیٹ کیا۔ ”اور تھوڑا سائیڈ والا شیشہ نیچے کر دو۔ بہت گرمی لگ رہی ہے۔“

کچھ ہی دیر میں بینش کی گاڑی میں وہ دونوں بوتیک کی جانب جا رہی تھیں۔ شاپنگ سے واپسی پر وہ بہت تھک چکی تھیں، اس کے باوجود بینش کے گیسٹ ہاؤس میں بستر پر دراز الوینہ کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ اس نے کروٹ بدل کر گھڑی کی جانب دیکھا۔ کمرے کی زیرو پاور لائٹ میں گھڑی پر صبح کے تین بج رہے تھے۔ مووی کو ختم ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے جس کے بعد دونوں اپنے اپنے کمروں میں چلی گئی تھیں، اور تب سے الوینہ بستر پر بس کروٹیں ہی بدل رہی تھی۔

”کیا مصیبت ہے!“ تنگ آکر وہ اٹھ کر بیٹھ ہی گئی۔ ذہن مسلسل لایعنی سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

”کوئی سوچ سکتا ہے کہ اتنی خوش باش نظر آنے والی لڑکی اندر سے کتنی بے چین ہے۔“

اس نے یاسیت سے سوچا تھا۔ اسے بینش کے ساتھ گزرا ہوا دن یاد آیا۔ شاپنگ، اس کے بعد ڈنر اور پھر فُل سینما سیٹ اپ کے ساتھ مووی۔ بظاہر ان کا دن کتنا بھرپور گزرا تھا۔ بہترین کھانا، بہترین تفریح، بہترین وقت، اس سے زیادہ بہترین کیا ہو سکتا ہے؟

”بہترین دوست....“ اس کے ذہن میں آیا: ”بہترین رشتہ، پرخلوص تعلق، کوئی ایسا جس سے کپڑوں، لڑکوں اور فیشن سے ہٹ کر بات کی جا سکے۔ دل کی بات... زندگی، فیشن، لڑکوں سے ہٹ کر بھی تو ہے۔ زندگی تو بذاتِ خود ایک موضوع ہے۔“

اُداسی اس کے اندر پھر اپنے پر پھیلا رہی تھی۔ وہ اکتا کر کمرے کے ایک جانب رکھے چھوٹے سے فریج کے پاس گئی اور اسے کھول کر اندر دیکھا۔ وہاں پانی اور جوس کی بوتلوں کے ساتھ ساتھ شراب کے کچھ کین بھی موجود تھے۔ الوینہ نے بے تاثر چہرے کے ساتھ ایک کین پر ہاتھ پھیرا۔ فرج کی خنکی میں کین

کے اوپر پانی کے کچھ قطرے نمودار ہو گئے تھے۔اس نے اپنی انگلی پر لگے ان قطروں کو جھٹکااور پانی کی بوتل نکال کر فرج بند کر دیا۔

''مجھے خوش ہونا چاہیے کہ میرے پاس سب کچھ ہے جس کا ایک عام انسان صرف تصور کر سکتا ہے۔''

اس نے بستر پر بیٹھ کر پانی کی ٹھنڈی بوتل کو اپنے گال پر لگاتے ہوئے آنکیں بند کر لیں۔ بوتل کی ٹھنڈک اسے عجیب سکون دے رہی تھی۔اچانک اس کی بند آنکھوں کے سامنے ہاسٹل کی کھڑکی سے نظر آتے، باتین کرتے گزرتے ہوئے باپ اور بیٹی آ گئے اور اس نے بے یقینی کے ساتھ آنکھیں کھول دیں۔ بینش کے گیسٹ ہاؤس میں نرم آرام دہ بستر پر بیٹھ کر نیند کی بجائے منال اور اس کے باپ کا آنکھوں میں اترنا... بات کچھ عجیب سی تھی۔

''میرے پاس بھی وہی سب کچھ ہے جو اس کے پاس ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ ہے، تو پھر میرے پاس وہ سکون کیوں نہیں ہے جو اس کے پاس ہے؟''الوینہ نے زود رنج ہو کر سوچا اور دو آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک کر گود میں رکھی پانی کی بوتل پر گر گئے۔

....☆....

''منگلا بھائی... !آپ کو شاہ جی اپنے دفتر بلا رہے ہیں۔'' منگلا ابھی ایک کلاس لے کر فارغ ہوا ہی تھا کہ چپڑاسی نے آکر اسے بتایا۔

''ٹھیک ہے، میں آرہاہوں۔'' منگلا نے کہا تھا۔کچھ دیر بعد وہ اصغر شاہ کے دفتر میں موجود تھا۔

''بیٹھو منگلا... ! کپڑے تو اب سوکھے ہوئے لگ رہے ہیں۔'' اصغر شاہ نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی شاہ جی، بارش کے بعد ایسی چمکیلی دھوپ نکلی کہ کپڑے جلدی ہی سوکھ گئے۔ شکر ہے اللہ کا۔'' منگلا نے بتایا۔

''آپ نے مجھے بلایا تھا۔ کوئی کام تھا مجھ سے؟''

''ہاں میں کچھ سوچ رہا تھا.....''اصغر شاہ گویا ہوئے۔

''تم جانتے ہو کہ میرے ڈیرے میں ایک کمرہ بطور مہمان خانہ بھی ہے۔ وہ آج کل خالی ہے۔ جس طرح آج بارش ہوئی ہے اور تم بھیگتے ہوئے آئے ہو، اس طرح تو تم بیمار پڑ سکتے ہو۔ یہاں تمہارے گھر والے بھی نہیں ہیں۔ میرے ذہن میں خیال آیا ہے کہ تم اگر اپنے فلیٹ سے یہاں میرے مہمان خانے میں منتقل ہو جاؤ تو؟ کیونکہ تمہارا کورس جو مکمل ہو گیا ہے۔ فلیٹ کا کرایہ بھی بچے گا اور لمبا سفر بھی... کیا خیال ہے؟''

''شاہ جی.....!''منگلا کو شدید حیرت ہوئی: ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ '

''کیوں کیا ہوا...؟ میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے کیا؟''اصغر شاہ بھی حیران ہوئے۔

''نن نہیں نہیں شاہ جی..... میرا مطلب یہ نہیں تھا۔''

منگلا نے فوراً کہا: ''آپ مجھے اپنے مہمان خانے میں قیام کرنے کی پیشکش کر رہے ہیں، یہ میرے لیے بہت بڑی اور اعزاز کی بات ہے۔ اس لیے مجھے اچانک سے شاک لگا تھا۔''

اس کی بات سن کر اصغر شاہ مسکرائے: ''تم ابھی نئے ہو، اس لیے مجھ سے اتنے واقف نہیں ہو۔ میرا مہمان خانہ ہمیشہ آباد رہتا ہے، الحمدللہ... تم سے پہلے بہت سے افراد وہاں قیام کر چکے ہیں۔ لوگ آتے ہیں، اپنے حساب اور ضرورت کے حساب سے کچھ دن قیام کرتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔ اللہ ان کی جگہ کوئی نیا مہمان بھیج دیتا ہے۔ کرم ہے مولا پاک کا۔''

اصغر شاہ نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا: ''تم آرام سے یہاں رہو۔ ساتھ ہی تو سکول ہے۔'' منگلا نے رشک بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔

''شاہ جی.. ! آپ مجھے کبھی کبھی انسان نہیں، کسی اور سیارے کی مخلوق لگتے ہیں! آج کے زمانے میں آپ جیسا بندہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

اصغر شاہ نے اس کی بات سن کر قہقہہ لگایا۔

''ارے! مجھے انسان ہی رہنے دو! مجھے دوسروں کے کام آکر خوشی ہوتی ہے۔ یہ بتاؤ کہ پھر کب

میرے مہمان خانے کو آباد کر رہے ہو؟''

''کل ہی آجاؤں؟ میرا وہاں بس تھوڑا سا ہی سامان ہے۔ یوں ویسے بھی آج کل رہائش ڈھونڈ رہا تھا۔ اگر آپ کے اسکول کی ملازمت نہ ملتی تو میں تو واپس اپنے شہر جا چکا ہوتا۔''

''اوہو! کل جو آنا ہے تو آج ہی آجاؤ۔ ابھی چھٹی ہوتی ہے تو کھانا کھا کر شوکت کے ساتھ گاڑی پر چلے جانا اور سامان لے کر آجانا۔''

اصغر شاہ نے تجویز دی تو منگلا کچھ گھبرا سا گیا۔

''نہیں شاہ جی! شوکت بھائی کو بلاوجہ تکلیف ہو گی۔ میرے پاس بس ایک بیگ ہی تو ہو گا کپڑوں کا، میں کل صبح لیتا آؤں گا۔''

''او بھائی....!'' اصغر شاہ کچھ زچ سے ہو گئے۔

''اگر کل بھی اسی طرح بارش ہو گئی تو سامان کو سنبھالو گے یا اپنے آپ کو...؟ اللہ نے ایک سہولت جب دی ہے تو اسے استعمال کرو! بلاوجہ کیوں اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالتے ہو؟ میں شوکت کو بتا دوں گا، وہ تمہارے ساتھ دوپہر کو چلا جائے گا۔'' انہوں نے حتمی انداز میں کہا تو منگلا انکار نہ کر سکا۔

''جی ٹھیک ہے شاہ جی، بہت شکریہ۔'' اس نے کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تھا۔

.....☆......

بابا اسحاق اپنے گھوڑے کو چارہ ڈال رہا تھا۔ ایسے میں جاوید گھر میں داخل ہوا تو اس نے آتے ہی کھانا مانگا.. بابا اسحاق حسب عادت اسے کچھ کام کاج کی ترغیب دیتے ہوئے اپنا لیکچر دینے لگا۔ اِدھر منال کی ماں نے منال کو مخاطب کیا:

''دھیے... تجھے اُدھر کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟ کیا کھاتی ہے؟ کپڑے کیسے دھوتی ہے؟ تیرے ساتھ جو لڑکی کمرے میں رہ رہی ہے، وہ منہ پھٹ تو نہیں؟''

رات نلکے کے پاس پیڑھی پر بیٹھی منال کھانے کے برتن دھو رہی تھی جب قریب چوکی پر بیٹھی اماں نے ایک ہی سانس میں کتنے ہی سوال پوچھ ڈالے۔ پہلے تو وہ ان کے سوال سن کر چونکی، پھر ان کی سادگی پر

ہنس پڑی۔

''اماں، سب ٹھیک ہے وہاں۔ بس ناشتہ خود بنانا ہوتا ہے، باقی دوپہر اور رات کا کھانا ہاسٹل والے دیتے ہیں۔''

''تو ناشتے میں تُو کیا کھاتی ہے؟ لگتا تو نہیں ہے کہ کچھ کھاتی ہے''!

اماں نے عمیق نگاہوں سے اس کی صحت کا جائزہ لیا۔ منال پھر ہنس پڑی، پھر برتنوں پر صابن والا کپڑا ملتے ہوئے بولی:

''اماں! صبح تو بس رس چائے لیتی ہوں۔ کبھی کبھی ڈبل روٹی کھا لیتی ہوں، پھر...''

ابھی وہ مزید کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ اماں سینے پر ہاتھ رکھ کر بے ساختہ بولیں:

''ہائے...! وہ سوکھی سڑی سی روٹی..! وہ کھاتی ہے تُو..؟ وہ تو نرا پھوک ہوتا ہے، اس سے تیرے اندر کون سی جان آتی ہوگی۔ کوئی پراٹھا نہیں ملتا وہاں تجھے۔؟''

''نہیں اماں...!'' منال مسکرائی: ''تُو جو وہاں نہیں ہوتی تو پراٹھا کون بنا کر دے''!

''تو تجھے وہاں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟''

اماں ایک بار پھر الجھی تھیں۔ اور منال کے لاہور جا کر پڑھنے اور ہاسٹل میں رہنے کے موضوع پر اماں کتنی ہی دفعہ اس سے اور ابا سے الجھی تھیں۔

''چل چھوڑ اماں...!'' برتن دھل چکے تھے۔ منال نے آخری پتیلی کو پلاسٹک کی برتنوں والی ٹوکری میں رکھا: ''اماں! تجھے پتا ہے، ہمارے ہاسٹل میں، میرے کمرے کے قریب ہی ایک کمرے میں ایک امیر زادی رہتی ہے''!

''اچھا...؟'' منال کی کوشش کامیاب رہی تھی۔ اماں کا ذہن اِس کی خوراک سے ہٹ کر اُس امیر زادی کی جانب ہو گیا تھا۔

'' ہاہائے....! اتنے پیسے کا کیا فیدہ جب ہاسٹل میں ہی رہنا اور سڑی ہوئی روٹی کھانا ہے تو.....''

''اماں! سن تو......!'' منال نے چڑ کر کہا: ''وہ اتنے فیشنی کپڑے پہنتی ہے جیسے گوریاں پہنتی

ہیں۔"

"ہاہائے!!!" اماں کی آنکھیں حیرت کے مارے پھیلتی جا رہی تھیں۔

"اور یونی ورسٹی میں اس کے لڑکے بھی دوست ہیں۔"

"ہاہائے....!!!" اماں نے تعجب سے اپنا ہاتھ اپنے کھلے ہوئے منہ پر رکھ لیا۔

"اور اس کا باپ جب اس سے ملنے آتا ہے تو پورا سیٹھ لگتا ہے، سیٹھ"!!!

"نہ تو تُو مجھے یہ بتا، کہ اتنے پیسے ہیں تو گھر پر کیوں نہیں رہتی؟ ہاسٹل میں کیوں رہتی ہے؟" اماں نے بھنویں سکیڑیں۔

"مجھے کیا پتا اماں! میری اس سے کبھی بات نہیں ہوئی۔" منال نے کندھے اچکا کر کہا اور برتنوں کی ٹوکری اٹھانے لگی۔ "وہ جب ہاسٹل میں ہوتی ہے تو اپنے کمرے سے باہر ہی نہیں نکلتی۔ جب بھی نکلتی ہے، خوب تیار شیار ہو کر، یہ ڈھیر سارا پرفیوم، خوشبو لگا کر نکلتی ہے اور کسی لڑکے کی گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہے۔

"ہاہائے....توبہ توبہ...." ٹوکری کو اپنی کمر کے ایک جانب ٹکائے اور اپنے بازو پر سنبھالے منال نے پلٹ کر اماں کو دیکھا تو مسکرا دی۔ اماں وہیں چوکی پر بیٹھی کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھیں۔

....☆....

"باس! وہ دونوں ہسپتال پہنچ گئے تھے۔ میں آپ کے کہنے پر بچے کے لیے پھل لے کر جا رہا تھا جب مجھے وہ دونوں نظر آئے۔ وہ بچے کے باپ سے باتیں کر رہے تھے۔" رستم عبدل کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا جب اس کے ایک کارندے گلو نے آکر اسے رپورٹ دی۔

"ہوں۔" رستم نے ہنکارا بھرا۔

"یہ کن لوگوں کی بات ہو رہی ہے؟" عبدل نے چونک کر پوچھا۔

"آپ ٹینشن نہ لیں۔ میں سب معاملات دیکھ رہا ہوں۔" رستم نے عبدل کو تسلی دی۔

"پھر بھی، مجھے بھی تو پتا چلے۔" عبدل کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

''وہ آپ نے جس کے ہاتھوں مجھے پیغام پہنچایا تھاناں، کیا نام تھا بھئی اس کا۔'' رستم اٹکا تو گلو نے فوراً لقمہ دیا۔

''یاسر....''!!

''ہاں ہاں، یاسر۔ بس اس کی اور اس کے دوست کی بات ہو رہی ہے۔''

''لیکن پتا تو کرو کہ وہ کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ کیوں اس معاملے میں گھس رہے ہیں۔'' عبدل نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''جوان خون ہے۔ اور جوانی میں تو دماغ ویسے بھی بہت جلدی خراب ہو جاتا ہے۔'' رستم نے یہ کہتے ہوئے گلو کی جانب دیکھا: ''ان کے بارے میں پوری رپورٹ مجھے رات تک مل جائے۔''

''اوکے باس۔'' گلو الٹے قدموں کمرے سے باہر نکل گیا۔

''خیال کرنا رستم، بات پھیلنی نہیں چاہیے۔ تمہیں پتا ہے ناں ہمارا کام کتنا نازک ہے؟'' اس کے جانے کے بعد عبدل نے رستم سے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں۔'' رستم نے پُر سوچ لہجے میں جواب دیا تھا۔

اِدھر تین دن سے ذوالفقار نظر نہیں آرہا تھا۔ یاسر کو ذرا تشویش ہوئی تو اس کے گھر پہنچ گیا۔ مین گیٹ کے باہر لگائی گھنٹی بجانے پر دروازہ ذوالفقار کی والدہ نے کھولا تھا، جنھیں دیکھ کر یاسر نے سلام کیا اور ادب سے پوچھا:

''خالہ جان،....!! کیا ذلفی گھر پر ہے؟''

''نہیں بیٹا...!! وہ تو کچھ دنوں کے لیے شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ تمہیں بتا کر نہیں گیا؟ '

مریم خالہ نے جواب دینے کے ساتھ ہی سوال پوچھ لیا تھا۔ یاسر کو حیرت ہوئی۔

''نہیں خالہ....!! مجھے تو کچھ نہیں بتایا۔''

''وہ تو پرسوں صبح سویرے ہی نکل گیا تھا۔ بس اپنے ابا کو یہی بتایا کہ اسے ملتان میں بہت اچھی نوکری کی پیشکش ہوئی ہے، اسی سلسلے میں فوراً جانا ہے۔ اللہ خیر کرے، اب تو میرا دل پریشان ہو رہا ہے۔'' مریم

خالہ نے پریشانی کے انداز میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھا تو یاسر فوراً کہنے لگا:

"آپ پریشان نہ ہوں خالہ...!! اگر وہ آپ کو بتا کر گیا ہے تو وہ ٹھیک ہی ہو گا۔ بلکہ مجھے یاد آیا، وہ کچھ دن پہلے مجھ سے ملا تھا تو تب وہ اپنی ملتان کی کسی نوکری کے بارے میں بات کر تو رہا تھا۔"

"اچھا...؟ تمہیں بتایا تھا اس نے؟" مریم خالہ کو کچھ تسلی ہوئی۔

"جی جی، بس مجھے یہ نہیں پتا تھا کہ اس نے اتنی جلدی جانا ہے۔ بہر حال، آپ پریشان نہ ہوں، میں اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس نے بتایا تھا کہ کب تک واپسی ہو گی؟ "

"کہہ رہا تھا کہ پانچ دن لگ جائیں گے۔ تین دن تو گزر گئے ہیں۔ خیر سے پرسوں واپس آجائے گا۔"

"جی، ان شاءاللہ...!! ٹھیک ہے خالہ، میں چلتا ہوں۔" ان کی گلی کا موڑ مڑنے سے پہلے ہی یاسر کی پیشانی پر تفکر کے بل پڑ چکے تھے۔ اس نے مریم خالہ سے جھوٹ بولا تھا، ذوالفقار نے اس سے ملتان کی کسی نوکری کا ذکر نہیں کیا تھا۔

....☆....

"شوکت بھائی! میں اپنا سامان لے کر آتا ہوں۔"

شوکی نے گاڑی فلیٹ کے سامنے روکی، تو منگلا نے اسے کہا۔ پھر کچھ ہی دیر میں وہ اپنا بیگ لے کر آگیا ۔ اب ان کا رخ انسٹی ٹیوٹ کی جانب تھا جہاں منگلا کا باقی سامان سر عظمت کے پاس رکھا ہوا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ کے دروازے پر پہنچ کر ایک بار پھر منگلا نے شوکت کو مخاطب کر کے کہا:

"آپ یہیں رُکیں میں اپنے باقی کا سامان انسٹی ٹیوٹ سے اٹھا لاؤں۔"

"بھئی میں بھی آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں ناں..." یہ کہتے ہوئے شوکت گاڑی سے نکل آیا۔ ایک لمحے کے لیے منگلا ٹھٹک گیا، پھر وہ دونوں عمارت کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دوسری منزل کی جانب بڑھ گئے۔

"اوہ...!! اللہ کرے شوکت کو ہمارے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو جائے۔"

منگلا نے ادارے کے دروازے کے باہر گھنٹی بجاتے ہوئے دل میں دعا مانگی۔ اسی وقت سلطان نے

دروازہ کھولا۔

''السلامُ علیکم سلطان...آجائیں شوکت بھائی...!'' منگلا نے سلام کرنے کے بعد دروازے کے ایک جانب ہو کر شوکت کے گزرنے کی جگہ بنائی تھی۔ شوکت دلچسپی سے ادارے کے سیٹ اپ کو دیکھ رہا تھا۔ شروع میں چھوٹا سا استقبالیہ سیکشن تھا، جہاں اپنے نام کا اندراج کروانے کے بعد آپ کو اندر جانے کی اجازت ملتی تھی۔ سلطان شاید استقبالیہ پر بیٹھتا تھا تبھی وہ جگہ اس وقت خالی تھی۔

''سر عظمت کہاں ہیں؟'' منگلا نے سلطان سے پوچھا تھا۔

''وہ اندر کلاس لے رہے ہیں، آپ چلے جائیں۔''

سلطان نے استقبالیہ پر اپنی نشست سنبھالتے ہوئے ایک بند دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ منگلا کی معیت میں اس دروازے کی طرف بڑھتا ہوا شوکت آنکھوں کا وہ اشارہ دیکھ پایا تھا جو سلطان نے منگلا کو کیا تھا، جس کا مطلب تھا کہ سب ٹھیک ہے۔ کمرے میں قالین بچھا ہوا تھا! سر عظمت ایک نوجوان کو کوئی سبق سمجھا رہے تھے۔ انھوں نے جب منگلا کے ساتھ کسی اجنبی کو دیکھا تو چونک کر ان کی جانب آ گئے۔

''سر! یہ شوکت عرف شوکی ہیں۔ میرے سامان اٹھوانے آئے ہیں۔''

''آیئے آیئے....آپ اور آپ کے شاہ جی کا غائبانہ تعارف تو ہمیں پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے۔ منگلا آپ دونوں کا بہت ذکر کرتا ہے۔'' دعا سلام کے بعد جب منگلا نے سر عظمت کو شوکت کے بارے میں بتایا تو انہوں نے بہت گرم جوشی کے ساتھ اس سے مصافحہ کیا۔ شوکت اس پذیرائی پر مسکرایا۔

''احمد! تم ذرا کلاس ٹیک اوور کرو، میں مہمان کے ساتھ اپنے آفس میں ہوں۔''

انہوں نے کسی سے کہا اور منگلا اور شوکت کو لے کر اپنے دفتر کی جانب بڑھ گئے۔ دفتر میں انھوں نے شوکت سے تھوڑی گپ شپ اور کمپیوٹر کورس کے بارے میں کچھ رہنمائی کرنے کے بعد وہ معذرت کرتے ہوئے منگلا کو لے کر آفس سے باہر نکل آئے تھے اور اب ایک دوسرے کمرے میں بیٹھے منگلا کی بات سن رہے تھے۔ شوکت کو کمرے میں چائے کے ساتھ کچھ دوسرے لوازمات بھجوا دیے گئے تھے۔

''سر...! میں تو گھبرا گیا تھا کہ کہیں شوکت بھائی کو شک نہ ہو جائے۔'' منگلا نے چھوٹتے ہی کہا تو سر

عظمت کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''میں دس سالوں سے مختلف جگہوں پر چوری چھپے اپنا ''کام'' کر چکا ہوں اور آج تک کسی کو شک نہیں ہوا تو اب کیسے ہو جاتا؟ میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوئی منگلا کہ میں اپنے نظریات کا پرچار پوسٹرز کے ذریعے کھلے عام کرتا پھروں۔ جو کام پردے کے پیچھے کرنے والا ہو، اس کی تشہیر کرنے کی کیا ضرورت ؟آئندہ بھی اگر کوئی تمہارے ساتھ آنا چاہے تو بغیر گھبرائے اسے لے آنا۔ آخر کو ہم یہاں کمپیوٹر سکھانے ہی تو بیٹھے ہیں۔'' اس بات پر دونوں ہنس پڑے تھے۔

''سر...!! اب تو میرے شب و روز وہیں گزریں گے، تو مجھے بتایئے کہ میں کس طرح شاہ جی کو اپنی طرف مائل کروں؟'' منگلا نے پوچھا۔

''دیکھو تو خدا تعالیٰ کس طرح ہماری راہ آسان کرتا جا رہا ہے! حالانکہ ہم نے تو کچھ بھی نہیں کیا! پہلے تمہاری شاہ جی سے جان پہچان ہوئی، پھر انہوں نے خود ہی تمہیں ملازمت کی اور اب رہائش کی بھی پیشکش کر دی!'' سر عظمت نے منگلا کا ہاتھ دبایا:

''اس کا مطلب ہے خدا تعالیٰ شاہ جی کو تمھارے ذریعے ہدایت دینا چاہتا ہے۔''

''جی سر جی....! اور مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ مجھے یہ سعادت مل رہی ہے۔'' منگلا کی آنکھوں میں جذبات کی وجہ سے نمی اتر آئی۔

''ابھی بس کسی نہ کسی طرح باتوں ہی باتوں میں ایہ باور کروانے کی کوشش کرو کہ تمہیں خدا نے ان کی خاص مدد کے لیے بھیجا ہے۔ کوشش کرو کہ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارو اور انہیں یہ یقین دلاؤ کہ اس کے لیے تم سے زیادہ مخلص اور خیر خواہ پوری دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ پھر کسی دن موقع پا کر اپنا اصل موضوع ہلکے پھلکے انداز میں چھیڑ دینا، لیکن اس طرح کہ انہیں پتا نہ چلے کہ تمہارا تعلق کس نظریے سے ہے اور تمہارا عقیدہ کیا ہے؟ بس ایسے ہی سر سری انداز میں اس موضوع پر بات کرنا۔ اگر انہوں نے آرام سے بات سن لی تو پھر ہم آگے کا لائحہ عمل طے کریں گے۔''

''اور اگر ان کا ردِ عمل سخت منفی ہوا تو...؟'' منگلا نے پوچھا۔

"تو بس پھر وہیں تبلیغ کے عمل کو روک دینا۔ اب اگر کوئی ہدایت کو قبول نہ کرنا چاہے، تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ یہ دیکھو....."

سر عظمت نے اپنے میز کے دراز سے سرخ رنگ کی جلد میں لپٹی ہوئی ایک کتاب نکالی، پھر انھوں نے بڑے جذب کے عالم میں کتاب کو اپنی پلکوں پر لگایا، چوما اور دوبارہ دراز میں رکھ کر اسے مقفل کر دیا۔ اس دوران منگلا نے بھی تعظیم سے سر جھکا دیا تھا۔

....☆....

"یہاں آرام سے رہو۔ بغیر کسی فکر کے۔ دوپہر کا کھانا میں ہمیشہ کسی مہمان کے ساتھ کھاتا ہوں۔ جب تک میں کھانے میں کسی کو شریک نہ کر لوں، مجھ سے کھانا نہیں کھایا جاتا۔ تم آگئے ہو تو میرا یہ مسئلہ بھی دور ہو گیا۔"

اصغر شاہ نے اسے مہمان خانہ دکھاتے ہوئے کہا۔ صاف ستھرا، سادا سا کمرہ تھا جس کے ساتھ اٹیچ باتھ روم تھا۔

"بہت شکریہ شاہ جی...." منگلا نے پر شوق نگاہوں سے کمرے کا طائرانہ جائزہ لیا۔

"سامنے ہی باورچی خانہ ہے۔ تم جب چاہو، وہاں چائے وغیرہ بنا سکتے ہو۔ چائے تو بنانی آتی ہے ناں؟ نہیں بنانی آتی تو مراد سکھا دے گا۔"

اصغر شاہ نے ہنستے ہوئے کہا تو منگلا بھی ہنس پڑا۔

"یہ ساری کتابیں آپ کی ہیں؟" منگلا نے تعجب کے ساتھ کمرے کے ایک جانب اشارہ کیا۔ وہاں لکڑی سے بنی تین بلند ایک الماریاں تھیں جن میں ترتیب کے ساتھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کے دوسری جانب دیوار سے منسلک دو شیلف پر بھی کتابیں تھیں۔ جواب میں اصغر شاہ مسکرائے۔

"ہاں بھئی، میری ہی ہیں۔ یہ میرا علمی خزانہ ہے۔ لوگ کپڑوں وغیرہ پر اپنا روپیہ خرچ کرتے ہیں، میں کتابوں پر کرتا ہوں۔ مطالعہ میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔"

منگلا رشک کے ساتھ کتابوں پر موجود عنوانات پڑھتا جا رہا تھا۔ وہاں مختلف موضوعات پر کتب

موجود تھیں۔ شاعری، افسانے، فلسفہ، تحقیق، مضامین.... ۔وہاں انگلش زبان میں کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ بھی موجود تھا۔

"آپ کا مطالعہ تو قابل رشک ہے.... میرے تو پھر مزے ہو گئے! مجھے بھی مطالعہ کرنے کا بہت شوق ہے۔ گھر والے مجھے کتابی کیڑا کہتے ہیں۔" منگلا ہنسا تو اصغر شاہ کھل کر ہنسے۔

"پھر تو خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے کتابوں کے دیوانے دو!" انہوں نے ایک الماری کھول کر اس میں سے دیوانِ غالب باہر نکالا۔ منگلا کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ غالب کیا خوب فرماتے ہیں:

وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی

عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

اُدھر وہ بد گمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے

نہ پوچھا جائے ہے اُس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے

شاہ صاحب ایک جذب کے عالم میں غالب کی غزل کے کچھ اشعار پڑھ رہے تھے۔ منگلا دلچسپی سے انہیں سن رہا تھا۔

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی! کیا قیامت ہے

کہ دامانِ خیالِ یار، چھوٹا جائے ہے مجھ سے

ابھی شاہ صاحب اگلا شعر پڑھنے ہی لگے تھے کہ شوکت اندر داخل ہوا۔

"شاہ جی... !عبدالکریم صاحب آئے ہیں۔"

"اچھا اچھا! انہیں باہر احاطے میں ہی بٹھاؤ، میں آرہا ہوں۔" اصغر شاہ نے دیوانِ غالب بند کرتے ہوئے کہا:

" اور ہاں، چائے بھی چڑھا دو۔ چائے کی چسکی کے ساتھ غالب کے اشعار بھی ہوں تو مزہ دوبالا ہو جاتا ہے"!

مسکراتے ہوئے انہوں نے دیوان کو بغل میں دبایا اور باہر کی راہ لی۔ پیچھے منگلا کتابوں کی ورق گردانی

میں مصروف ہو گیا۔

....☆....

منال اور بابا اسحاق بس اسٹینڈ پر کھڑے تھے جب کمال بھی وہاں پہنچ گیا۔ صاف ستھری، استری شدہ قمیض شلوار میں ملبوس، محنت کی چھاپ والی قدرے سانولی رنگت، لیکن تیکھے نقوش والا کمال دوسروں کے لیے تو عام سا انسان تھا لیکن منال کے لیے تو جیسے سارے زمانے میں اُس بندے جیسا وجیہہ کوئی نہیں تھا۔

"چاچا! خیر سے فیر لاہور جا رہے ہو... "!

منال نے ایک نظر اس پر ڈالی اور شرما کر ایک جانب سے چہرے کو چادر سے تھوڑا سا ڈھانپ لیا۔ اب اس کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ ہلکے بھورے رنگ کی آنکھیں اور لمبی پلکیں کسی کو بھی گھائل کرنے کو کافی تھیں اور اس پر مستزاد، منال نے اماں کی فرمائش پر سرمہ بھی لگایا ہوا تھا۔ سامنے والا بھی کمال تھا جو اُس وقت اِن بھوری رنگت والی آنکھوں کا اسیر ہوا تھا جب منال دسویں جماعت میں تھی۔

ایک سال کمال نے محبت کی اس یکطرفہ آگ میں اپنے آپ کو ہلکی آنچ پر پکایا تھا۔ وہ نوجوان تھا لیکن جذبات میں آ کر عقل کھو دینے والا نہیں۔ بخوبی جانتا تھا کہ زندگی کو صرف محبت کی نہیں، بھوک کی بھی طلب ہوتی ہے، بلکہ بھوک کی طلب تو ایسی قاتل ہوتی ہے کہ محبت بھلا دیتی ہے۔ تبھی اس نے منال کے گھر رشتہ بھیجنے سے پہلے اپنی مالی حیثیت کو بدلنے کی ٹھانی تھی۔

منال کی اماں کی لالچی طبیعت سے پورا گاؤں واقف تھا۔ کمال کو یقین تھا کہ اگرچہ وہ اتنا پڑھا لکھا نہیں، میٹرک کے بعد اس نے ووکیشنل کورس کیا تھا، لیکن اگر وہ اچھا کمانا شروع ہو گیا، تو منال کے ماں باپ کو رشتہ دیتے ہوئے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

اور ایسا ہی ہوا تھا۔ کسی طرح اس نے دبئی کا ویزہ لگوا لیا تھا اور اب وہاں ایک کمپنی کے ساتھ بطور الیکٹریشن کام کرتا تھا۔ جب اس نے اپنی ماں چاچی بشیراں کے ہاتھوں سب کے لیے بہترین سوٹ، پرفیوم، جنہیں اماں 'کھوسبو' کہتی تھی، اصلی گھی کی بنی ہوئی تین کلو برفی اور منال کے لیے الگ سے پانچ سو روپے بھیجے تو خصوصاً اماں کے پاس تو کوئی جواز ہی نہیں تھا انکار کرنے کا۔

انہوں نے ماسی بشیراں سے اپنی چپقلش کو ختم کیا اور کھلے دل سے اکلوتی بیٹی کے لیے آئے اس رشتے کو قبول کر لیا۔ ابا نے البتہ منال کے کہنے پر شرط رکھ دی تھی کہ پہلے پڑھائی مکمل ہو گی، پھر شادی ہو گی۔ اِدھر منال نے بی اے کیا، اُدھر اس کی کمال کے ساتھ منگنی ہو گئی۔

دو سال بعد شادی ہونا تھی جس کے لیے کمال دوبارہ محنت میں جت گیا تھا۔ ہر چار چھے مہینے کے بعد دو ہفتے کے لیے چھٹی پر آنا اس نے کم کر دیا کہ آنے جانے میں خرچہ ہوتا ہے۔ اب وہ سال میں بس ایک دفعہ آتا تھا دو ہفتے کی چھٹی لے کر۔ اس کا ارادہ تھا کہ شادی سے پہلے اتنا پیسہ بنا لے کہ شادی کے بعد اپنی دولہن کو چھوڑ کر دوبارہ دبئی نہ جانا پڑے۔

"اتنی موہنی صورت والی کو چھوڑ کر اتنا دور کیسے جا پاؤں گا؟ اور وہاں کام کس طرح کر پاؤں گا؟" کمال نے منگنی والے دن گلابی جارجٹ کا دوپٹہ اوڑھے منال کو کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے دل میں سوچا تھا اور دھیما سا مسکرایا تھا۔

"آہو پتر، لاہور ہی جا رہے ہیں۔"

ابا جی نے جواب دیا اور آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا سا بنا کر سڑک کے ایک جانب دیکھا۔ دور سے لاہور جانے والی ایک بس آ رہی تھی: "بھئی تُو یہاں کیسے؟"

"کسی سے ملنے آیا تھا چاچا جی...!! بس واپس جانے ہی والا ہوں۔ اوہ چاچا! بیگ تو مجھے دے دو۔

کندھا تھک جانا ہے۔" کمال نے منال کی طرف محبت کی ایک نظر ڈالتے ہوئے ابا سے سفری بیگ پکڑا۔

"جیتا رہ پتر! خوش رہ....!" ابا نے اسے دعائیں دی تھیں۔ تب تک بس ان کے قریب پہنچ گئی تھی۔ کمال نے ایک ہاتھ سے بیگ کو سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے بس کو رکنے کا اشارہ کیا۔

"بھائی صاحب! ان دو سواریوں سے کرایہ نہیں لینا۔ یہ میں دے رہا ہوں۔" اس نے کنڈیکٹر کو کہا تھا جو بس کے پائیدان پر ایک طرف جھول رہا تھا۔

"رہن دے کمال پتر........" ابا نے منع کرنا چاہا لیکن کمال نے ایک نہ سنی۔

"او جانیں دیں چاچا جی.... میں کوئی اور تھوڑی ہوں۔" کمال نے یہ کہتے ہوئے کنڈیکٹر کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔

"بھائی صاحب! زنانہ سواری ہے، زرا سائیڈ تے ہو جاؤ۔" کنڈیکٹر منہ بناتے ہوئے چھلانگ لگا کر بس سے اتر گیا تو منال نے جھجکتے ہوئے بس پر پاؤں رکھ دیا۔ ایک خالی نشست کی طرف جاتے ہوئے منال نے پلٹ کر کمال کی طرف دیکھا اور دھیرے سے اپنے دوپٹے کا پلو چہرے سے ہٹا کر ہلکا سا مسکرا دی۔ کمال کی ساری تھکن اڑن چھو ہو گئی تھی۔ ارد گرد موجود باقی پوری کائنات جیسے پل بھر میں غائب ہو گئی تھی۔

"بھاؤ جی! ٹکٹ کے پیسے دے دو۔"

اس خاموش گفتگو میں کنڈیکٹر نے مداخلت کی تھی۔ کمال نے چونک کر کنڈیکٹر کی طرف دیکھا اور پھر وہاں جہاں ایک لمحے پہلے اس کی پوری دنیا کھڑی تھی۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ منال نشست کی طرف جا چکی تھی۔ اس نے لمبا سانس خارج کرتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے اور گن کر کنڈیکٹر کو تھما دیے جنہیں پکڑتے ہی کنڈیکٹر چستی سے بس کے پائیدان پر پاؤں رکھ کر چڑھا اور بس روانہ ہو گئی۔

پیچھے کمال سڑک کنارے کھڑا اس بس کی اڑتی ہوئی دھول کو تب تک دیکھتا رہا جب تک وہ بس نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ پھر زیرِ لب مسکراتا ہوا واپس گاؤں کی جانب بڑھ گیا۔ وہ گاؤں سے جس کو ملنے آیا تھا، اس سے مل لیا تھا!

....☆....

''یار کدھر چلے گئے تھے تم؟ مجھے بتایا بھی نہیں؟'' ذوالفقار واپس آچکا تھا۔ یاسر کو وہ گھر کے دروازے پر ہی کھڑا مل گیا۔

''یہاں نہیں، چلو، پارک میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' ذوالفقار نے اسے بازو سے گھسیٹا اور دونوں گھر کے باہر کچھ قدم کے فاصلے پر بنے پارک کی طرف چل پڑے۔ یاسر حیران ہو رہا تھا۔

''بتاؤ تو سہی کہ کیا بات ہے؟'' جواب میں ذوالفقار کچھ نہیں بولا، بس خاموشی سے پارک کی طرف چلتا رہا تو یاسر بھی خاموش ہو گیا۔ دونوں پارک میں ایک قدرے سنسان کونے میں بنے بنچ پر بیٹھ گئے۔

''مجھے ملتان میں بہت اچھی نوکری مل گئی ہے۔'' بنچ پر بیٹھتے ہی ذوالفقار بولا۔

''بکواس نہ کر...!'' یاسر خفگی سے بولا:

''تُو مریم خالہ اور بہادر انکل سے جھوٹ بول سکتا ہے، مجھ سے نہیں۔ سچ سچ بتا کہ کہاں گیا تھا اور یہ پانچ دن لگا کر کہاں سے آیا ہے۔''

''تجھے بتا تو رہا ہوں کہ ملتان گیا تھا۔ تُو نے نہیں ماننا، تو نہ مان۔''

ذولفی کو ایک دم غصہ آگیا۔ یاسر کا بھی دماغ گھوم گیا۔ وہ اٹھ کر ذولفی کے عین سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

''ایسے کیسے بھئی؟ تُو نے مجھ سے کبھی ذکر نہیں کیا۔ ابھی ہفتہ پہلے تو تُو رو رہا تھا کہ نوکری نہیں مل رہی، تو اگلے ہی دن تجھے کیسے بیٹھے بٹھائے نوکری مل گئی، وہ بھی ملتان میں؟ تُو تو میرے ساتھ علی عمران بنا رستم کی جاسوسی کرتا پر رہا تھا۔ اگلے ہی دن ایسا کیا ہوا کہ تجھے ملتان سے بلاوا آگیا؟''

''ہاں، مل گئی نوکری تو کیا کرتا؟ تیرے انتظار میں بیٹھا رہتا کہ تجھے بتاؤں، پھر ملتان کے لیے نکلوں گا؟ تُو میرا باپ ہے کیا؟'' ذولفی بپھر کر سینہ تان کر اس سے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی بات اور لہجہ سن کر ایک لمحے کے لیے تو یاسر ہکا بکا رہ گیا۔ بچپن سے آج تک ذوالفی نے یاسر سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے ایک بھرپور گھونسہ ذولفی کے چہرے پر رسید کیا تھا۔

''تیری تو ایسی کی تیسی۔'' جواب میں ذولفی بھی اس پر پل پڑا تھا۔ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو چکے

تھے۔

"اوئے کیا کر رہے ہو بد بختو!!" پارک کے چوکیدار نے انہیں اس طرح لڑتے دیکھا تو بھاگتا ہوا آیا اور انہیں الگ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ شور سن کر ارد گرد موجود دو تین لوگ اور بھی آ گئے تھے۔ بڑی مشکل سے ان دونوں کو الگ کیا گیا تھا۔

"پاگل ہو گئے ہو کیا....؟" انکل ڈار نے دونوں کو ڈانٹا۔ وہ ان دونوں کو پہچانتے تھے: "بچپن کے یار ہو تم دونوں لیکن ایسے لڑ رہے ہو جیسے دشمن ہو"!

ان کی بات سن کر نفرت سے یاسر نے زمیں پر تھوکا۔

"بھاڑ میں گئی ایسی دوستی جہاں دوست دوست سے جھوٹ بولے۔"

اس کا جملہ سن کر ذولفی نے چوکیدار کی گرفت سے نکل کر دوبارہ یاسر پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن چوکیدار کی گرفت مضبوط تھی۔

"تُو ہو گا جھوٹا....."!!

"بس بس! بہت ہو گیا جھگڑا، چلو اپنے اپنے گھر اب۔"

عثمان صاحب محلے کے سب سے زیادہ بارعب انسان تھے۔ ان کے سامنے انکار یا مزید لڑائی جھگڑے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یاسر نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو انکل عثمان سے چھڑوایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے گھر کی جانب چل دیا۔ چلتے چلتے اس نے ذولفی کی جانب دیکھا تھا۔ غصہ، افسوس، دکھ، بے یقینی، ناراضی...! سبھی کچھ تو تھا اس کی آنکھوں میں۔ ہاں، بس نفرت نہیں تھی۔

.....☆.....

عبدالکریم اور اصغر شاہ احاطے میں آرام دہ موڑھوں پر بیٹھے، چائے پینے کے ساتھ ساتھ گپ شپ کر رہے تھے جب گیٹ سے عمر اور بلال اندر داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے منہ بسورتا ہوا علی بھی تھا۔

"ابو جی! پلیز...!! علی کو منع کریں۔ ہم گراؤنڈ میں کرکٹ کھیلنے لگتے ہیں تو یہ ضد شروع کر دیتا ہے کہ اسے بھی ساتھ کھلائیں۔"

عمر نے بیٹ زمین پر قدرے زور سے مارتے ہوئے جھنجھلائے لہجے میں کہا تھا۔

''تو اسے بھی کھلا لو... چھوٹا بھائی ہے تمہارا...'' شاہ صاحب نے بھائیوں کے مابین جھگڑے کو سلجھانا چاہا۔

''نہیں ابو جی....! میں نے اسے نہیں کھلانا۔ اسے ہوتا ہے کہ بیٹنگ میں پہلی باری بس اسے ہی ملے!'' عمر سخت جھنجھلایا ہوا تھا۔

''اور اگر یہ پہلی گیند پر آؤٹ ہو جائے تو مانتا ہی نہیں ہے۔ بیٹ اٹھا کر بھاگ جاتا ہے۔''

بلال نے بھی عمر کی ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ عبدالکریم صاحب کا بیٹا اور عمر کا ہم عمر تھا۔ ہر شام دونوں باپ بیٹے شاہ صاحب کے گھر آتے تھے۔ عبدالکریم صاحب کی شاہ صاحب کے ساتھ محفل جمتی تھی اور بلال کی عمر سے گہری دوستی تھی۔ علی البتہ ان کے درمیان گھسنے کی کوشش کرتا تھا۔

''علی بیٹے...!!'' شاہ صاحب نے مسکراتے ہوئے علی کو تنبیہی انداز میں پکارا تو منہ بسورتا علی فوراً آنکھوں میں آنسو لے آیا۔

''بھیا بہت زور سے باؤلنگ کرواتے ہیں ابو جی... میں انہیں کہتا بھی ہوں کہ دو ٹھپے والی بال پھینکیں لیکن وہ اتنی زور سے بال پھینکتے ہیں کہ میں کھیل ہی نہیں پاتا اور آؤٹ ہو جاتا ہوں۔'' اس کے معصومیت بھرے شکوے پر عبدالکریم صاحب بے ساختہ ہنس پڑے۔

''خبردار!! جو اب علی کو کسی نے تیز باؤلنگ کروائی تو! سنا تم دونوں نے؟ اسے دو ٹھپے والی بال کروانی ہے۔'' شاہ صاحب نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بارعب انداز میں عمر اور بلال سے کہا۔ پھر علی کی جانب دیکھتے ہوئے بولے،

''اور اگر دو ٹھپے والی بال سے بھی آپ آؤٹ ہو گئے تو پھر تم نے بیٹ کو اٹھا کر بھاگنا نہیں ہے، انہیں ان کی باری دینی ہے۔ ٹھیک ہے؟''

ان کی بات سن کر علی نے اثبات میں سر ہلایا اور عمر سے بیٹ لے کر بولا:

''اب سے دوبارہ میچ شروع ہو گا۔ اور اب اگر میں آؤٹ ہو گیا تو پکا وعدہ، آپ کو باری دوں گا۔''

"چلو دیکھتے ہیں۔" عمر نے کڑے لہجے میں کہا اور تینوں احاطے سے باہر نکل گئے۔

"دیسی مرغوں کی طرح لڑتے ہیں یہ!" ان کے جانے کے بعد شاہ صاحب نے کہا تو دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

.....☆.....

فہد کی پارٹی میں سلکی گاؤن کے نیچے کیپری ٹراؤزر پہنے الوینہ کسی ریاست کی شہزادی لگ رہی تھی۔ پارٹی میں شناسا اور اجنبی، سبھی لوگ تھے جن میں لڑکے اور لڑکیاں سبھی شامل تھے۔

"فہد کا سوشل سرکل تو بہت بڑا ہے۔ میں تو سمجھی تھی کہ بس ہم پانچ چھے لوگ ہی ہوں گے۔"

الوینہ نے کوک کا گھونٹ بھرا اور بینش سے کہا۔ سورج زوال کی طرف گامزن تھا اور جاتے جاتے آسمان پر نارنجی رنگ پھیلاتا جا رہا تھا۔ گھاس کے قطعوں پر سجے میزوں پر ویٹرز سیخوں سے تازہ گرم بوٹیاں اور سیخیں اتار کر لا رہے تھے اور کھانے والے قہقہوں اور موسیقی کی سنگت میں کھا رہے تھے۔

"مجھ سے پوچھو تو اس نے ہر طرح کا گند ہی بھرا ہوا ہے اپنے سوشل سرکل میں!" بینش نے نیپکن سے ہونٹوں کے کنارے صاف کرتے ہوئے منہ بنایا۔ "اُس لڑکی کو دیکھو۔" اس نے ایک جانب آنکھوں سے اشارہ کیا تو الوینہ نے اس کی نظروں کے تعاقب میں ایک لڑکی کو دیکھا جس کی جسامت تھوڑی سی موٹی تھی اور اس موٹاپے پر بھی اس نے چست پینٹ چڑھائی ہوئی تھی۔

"کوئی فیشن سینس ہونی چاہیے انسان میں! بالکل بھینس لگ رہی ہے!" بینش نے حقارت سے کہتے ہوئے تمسخر اڑایا تھا۔ الوینہ نے دوبارہ اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ کہیں سے بھی ویسی نہیں لگ رہی تھی جیسی بینش کو نظر آ رہی تھی۔ الوینہ نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

"چھوڑو، ہمیں کیا۔ آؤ، وہاں چلتے ہیں۔ وہ جگہ زیادہ خوب صورت ہے۔ یہاں کوئلوں کا سارا دھواں ہماری طرف آ رہا ہے۔"

"یو آر رائٹ! چلو۔" یہ کہہ کر بینش اٹھنے لگی لیکن اچانک ہی ایک لمبے قد کی لڑکی ہاتھ میں سلگتی ہوئی سگریٹ پکڑے وہاں آئی تھی۔

"او! ہائے بینی...!!" آتے ہی اس نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا اور بینش کی طرف بڑھی۔ بینش نے بھی "ہیلو شانزے!! تم کب آئی واپس؟" کہتے ہوئے شانزے سے چہرہ مس کیا تھا۔ دونوں باتین کرنے میں مگن ہو گئی تھیں۔ الوینہ کی شانزے سے کوئی جان پہچان نہیں تھی، اس لیے وہ ایکسکیوز کرتی ہوئی سرخ گلابوں سے لدی ایک جھاڑی کی جانب چل دی۔

ارد گرد موجود افراد چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں گپ شپ میں مصروف تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور اب آسمان پر پھیلی مدہم سی روشنی پر رات کا اندھیرا حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ ارد گرد لگی ہوئی لائٹیں جل چکی تھیں۔ ان کی ٹمٹماتی روشنی میں سلگتے کوئلوں کی چنگاریاں بہت خوب صورت منظر پیش کر رہی تھیں۔

"کاش شہروز تم یہاں ہوتے تو ہم دونوں کتنا انجوائے کرتے!" اس نے ایک گلاب کو نرمی سے چھوتے ہوئے سوچا تھا۔

"آپ اس گلاب سے زیادہ خوب صورت، نازک اور مہک رہی ہیں۔"

اچانک کسی نے عقب سے اس کے بالکل نزدیک آکر کہا تھا۔ وہ خوف سے اچھل کر پیچھے مڑی تھی۔

وہاں گرے شارٹس کے اوپر گہرے سبز رنگ کی ٹی شرٹ پہنے ایک نوجوان کھڑا معنی خیز انداز ہیں مسکرا رہا تھا۔ اس کے بال اسپائکس انداز میں کھڑے ہوئے تھے اور کہیں کہیں سے سنہرے رنگ میں ڈائی تھے۔ گلے میں سونے کی چین لٹک رہی تھی اور آنکھوں میں سرخ ڈورے سے تیر رہے تھے۔ الوینہ اس نوجوان کو کچھ دیر پہلے فہد کے ساتھ کھڑا ہوا دیکھ چکی تھی۔ لیکن اُسے یہاں دیکھ کر حیران تھی۔

"تھینکس......" اس نے بے رخی سے جواب دیا اور دوبارہ گلابوں کو دیکھنے لگی۔

"یہ پھول اور آپ.... دونوں کو دیکھتے ہی چھونے کو دل مچلتا ہے....May I.....؟"

کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنا دایاں آرام سے ہاتھ الوینہ کے چہرے کی طرف بڑھایا تھا۔

"Stop it!!!....!!!" الوینہ نے غصے سے اس کے ہاتھ کو روکا۔

" Don't you even dare to touch me"

اس نے غراتے ہوئے کہا تھا۔ نوجوان پہلے تو ٹھٹک کر رکا، پھر طنزیہ انداز میں ہنسنے لگا۔

''پھول کے ساتھ بھی کانٹے ہوتے ہیں، تمہارا غصہ بھی کانٹے جیسا ہی ہے۔ چبھنے والا لیکن مزا ہے۔اس میں بھی مزا ہے۔''

اس نے اس انداز میں سر ہلایا جیسے الوینہ کے غصے سے محظوظ ہو رہا ہو۔ الوینہ نے اس کے سینے پر دونوں ہاتھ مار کر اسے ایک طرف کیا اور غصے سے سرخ چہرہ لیے بینش کی طرف بڑھ گئی جو ابھی بھی شانزے سے گپ شپ میں لگی ہوئی تھی۔

''I am leaving.'' الوینہ نے بس اتنا کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی گیٹ کی طرف چل دی۔

''What happened Alvina?'' بتاؤ تو سہی کیا ہوا؟''

پیچھے بینش نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن الوینہ سنی ان سنی کرتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی۔

....☆....

منگلا کو اصغر شاہ کے مہمان خانے میں رہتے ہوئے دو دن ہو گئے تھے۔ مہمان خانے اور باورچی خانے کا یہ سیٹ اپ اصغر شاہ کے ذاتی گھر سے بالکل مخالف رخ پر تھا اس لیے ان کی خانگی زندگی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔

''یہاں رہتے ہوئے کوئی مسئلہ یا کسی بھی قسم کی کوئی تنگی ہو رہی ہو تو مجھے بتاؤ۔'' اسکول سے چھٹی ہو چکی تھی اور اب اصغر شاہ مہمان خانے میں منگلا کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے جب انہوں نے اس سے پوچھا۔

''شاہ صاحب! کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟'' منگلا شرمندہ سا ہو گیا۔

''میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ میری کون سی نیکی اللہ کو پسند آگئی جو اُس دن سڑک پر آپ نے مجھے لفٹ دی اور مجھے یہاں لے آئے۔ مجھے تو اپنا آپ خوش قسمت ترین لگ رہا ہے جو مجھے آپ کی صحبت میں رہنے کا اتنا اچھا موقع مل رہا ہے۔'' اس کے لہجے میں ممنونیت تھی۔

''بس یہ اللہ کا فضل ہے۔ تمہارا دانہ پانی یہاں لکھا تھا، اس لیے تم یہاں پہنچ گئے۔'' شاہ صاحب مسکرائے۔

""اچھا یہ بتاؤ، تم نے ابھی تک مری دیکھا ہے؟""

""نہیں شاہ جی...! ابھی تک دیکھا تو لیکن وہاں جانے کا شوق بہت ہے۔"" منگلا نے جواب دیا تھا۔

""ٹھیک ہے پھر، ہماری بڑی کلاسوں کا ٹرپ جا رہا ہے مری، ہفتے کے دن۔ تم بھی چلو۔""

""میں....؟"" منگلا نے خوشی سے پوچھا۔

""ہاں بھئی، یہ شرارتی ٹولے ایک دو ٹیچرز سے سنبھالے نہیں جانے!"" اصغر شاہ ہنسے۔

""ہم دو دو کلاسز لے کر جاتے ہیں۔ ہفتے کو نویں اور دسویں جماعت کا ٹرپ ہے اور اتوار کو ساتوں آٹھویں کا۔ تم کس دن جانا چاہو گے؟""

""کسی بھی دن لے جائیں شاہ جی۔ چاہیں تو دونوں دن لے جائیں۔"" منگلا نے شرارت سے کہا تو اصغر شاہ مسکرائے۔

""چلو پھر تم اتوار کے دن چلنا، ساتویں آٹھویں جماعت کے ساتھ۔ ویسے بھی عمر اور بلال سے تمہاری اچھی دوستی ہو گئی ہے۔ کل عمر مجھے بتا رہا تھا کہ شام کو وہ تمہیں بھی کرکٹ کھیلنے کے لیے لے گئے تھے۔""

اس بات پر منگلا ہنس پڑا۔

""جی شاہ جی...!! بس زبردستی ہی لے گئے، لیکن سچ پوچھیں تو اتنے عرصے بعد کھلے میدان میں کرکٹ کھیلی تو بہت مزا آیا۔""

""اچھی بات ہے۔ کھیل بھی زندگی میں ہونے چاہئیں۔"" اصغر شاہ مسکرائے۔ ""۔ فی الحال تو یہ بتاؤ کہ میری لائبریری سے کوئی کتاب پسند آئی؟ ' '

""کوئی ایک کتاب...!"" منگلا ہنسا۔ ""میرے لیے انتخاب کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ میں ممتاز مفتی صاحب کی 'لبیک' اٹھاؤں یا پھر کرنل صاحب کی 'بجنگ آمد'۔ پھر قرعہ فال ابنِ انشاء کے 'چاند نگر' کے نام نکلا۔ حالانکہ میں یہ کتاب دو دفعہ پہلے بھی پڑھ چکا ہوں لیکن ہر دفعہ اس کی شاعری نیا لطف دیتی ہے۔""

""بے شک! ابنِ انشاء کا کلام ایسا ہی ہے کہ جب بھی اسے پڑھا جائے، نئے سرے سے لطف آئے۔""

شاہ صاحب نے اثبات میں سر ہلایا تو منگلا جھجکتے ہوئے بولا:

''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ابنِ انشاء کا کلام پیش کروں؟ یہ میری پسندیدہ نظموں میں سے ایک ہے۔''

''ہاں ہاں، ضرور۔''

شاہ صاحب نے پُر شوق لہجے میں کہا تو منگلا مسکرایا۔ پھر بہترین تحت الفظ میں آواز کے زیر و بم کے ساتھ ابنِ انشاء کا کلام پڑھنے لگا:

کہاں گیا تھا گھڑی دو گھڑی میں لوٹ آیا
شبِ فراق کا تارا رکاب میں لایا
اُداس شام ابھی کتنی رات باقی ہے؟
یہ آج کون سی تاریخ تھی مہینے کی
مہِ تمام سرِ آسماں ابھر آیا
مہِ تمام ابھی کتنی رات باقی ہے
سنو سنو، وہ کسی دور کے محلے میں
ادائے خاص سے ہے پہرہ دار چِلایا
کسی کا نام ابھی کتنی رات باقی ہے

''واہ! کیا کہنے... بہت خوب بھئی...''!

شاہ جی آنکھیں موندے، سرور کے عالم میں سر دھن رہے تھے اور کمرے میں منگلا کی آواز میں ابنِ انشاء کی نظم گونج رہی تھی۔

......☆......

منال نے ہاسٹل کے کمرے میں سامان رکھتے ہوئے ایک تھیلا میز پر رکھا۔

''اس میں کیا ہے؟'' فاطمہ نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا تو منال مسکرادی۔

''اماں نے دیا ہے۔'' اس نے تھیلا کھول کر اسٹیل کا بنا ہوا ایک ٹفن نکال۔ اسے کھولا تو کمرے میں

فوراً آلو کے پراٹھوں کی خوشبو پھیل گئی۔

''آئے ہائے ہائے....!'' فاطمہ تیزی سے بستر سے اتری تھی: ''کیا غضب کی خوشبو ہے بھئی!!!''
اس نے ٹفن میں ہی ہاتھ ڈال کر پراٹھے سے ایک لقمہ توڑا اور منہ میں ڈال لیا۔

''اماں کو فکر ہو گئی ہے کہ میں ناشتہ نہیں کرتی ٹھیک سے، تو انہوں نے میرے لیے یہ پراٹھے بنا دیے کہ صبح ناشتے میں کھا لینا۔'' منال نے بتایا۔

''لیکن.....'' فاطمہ کے منہ میں دوسرا لقمہ جا چکا تھا:

''یہ تو تین پراٹھے ہیں۔ تو ان میں سے میرے لیے ایک ہے یا دو...؟'' اس نے شرارت سے کہا تو منال ہنسی۔

''ایک میرا، ایک تمہارا اور ایک ہم دونوں کا آدھا آدھا''!

''تمہاری اماں زندہ باد...!!'' فاطمہ نے نعرہ لگاتے ہوئے تیسرا لقمہ توڑ لیا۔

''یہ اماں نے کل صبح ناشتے کے لیے بھیجے تھے، ابھی کھانے کے لیے نہیں!'' منال نے اسے گھورتے ہوئے ٹفن کو بند کرنا چاہا۔

''صبح تک کا انتظار کون کرے جب کمرے میں ان کی خوشبو پھیلی ہو!!'' فاطمہ نے ہنستے ہوئے ٹفن کھولنا چاہا۔ ''پلیز کھانے دو ناں!! بہت مزے کے لگ رہے ہیں! تم خود تو اپنے گھر سے ہو آئی ہو، میں نے یہ چھٹی ہاسٹل میں ہی بور ہوتے ہوئے گزاری، اب تو کچھ مزا کرنے دو''!

اس نے مسکین سی شکل بنائی تو منال ہنس پڑی۔

''اچھا بھئی! لے لو.... کھا لو، بس میرا حصہ چھوڑ دینا۔''

''ہوں ہوں...'' فاطمہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بے فکر رہنے کا اشارہ کیا۔ منہ میں پراٹھے کا ایک بڑا سا لقمہ جو ٹھونس چکی تھی۔

....☆....

ذلفی نے ان آنکھوں سے اپنی نظریں چرا لیں۔ سب اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے تھے۔ وہ وہیں تھک کر بنچ پر بیٹھ گیا اور بنچ کی اس جگہ ہاتھ رکھ دیا جہاں کچھ دیر پہلے یاسر بیٹھا ہوا تھا، اس کا بچپن کا دوست یاسر جس کے نچلے ہونٹ سے ذلفی کے مکے کی وجہ سے تھوڑا سا خون نکلا تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو یاسر....!! میں جھوٹا ہوں۔" اس نے بینچ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یاسر کو وہیں بیٹھا ہوا محسوس کیا تھا:

" میں ملتان نہیں گیا تھا۔ میں اپنے یار کو بتائے بغیر کہیں بھی کیسے جا سکتا تھا...."

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے دونوں بازووں کو اپنے گھٹنوں پر رکھا اور قدرے جھک کر گھاس کو یک ٹک باندھے دیکھنے لگا۔ اس کے دماغ میں کچھ دن پہلے کا منظر چل رہا تھا جب شام کے وقت دکان سے نکلتے ہوئے اسے ایک شخص نے روکا تھا:

"بات سنیں" !

"جی فرمایئے؟" ذلفی کے لیے وہ چہرہ اجنبی تھا۔

"آپ ذوالفقار صاحب ہیں؟" اس شخص نے نہایت شائستہ انداز میں پوچھا تھا۔

"جی ہاں....آپ کون....!!؟"

"آپ مجھے نہیں پہچانتے۔ میرا نام غوری ہے۔ مجھے ایک کام کے سلسلے میں کسی نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اگر آپ کے پاس کچھ وقت ہو تو کیا آپ میرے ساتھ چل سکتے ہیں؟" اس کی پیشکش پر ذوالفقار نے کچھ لمحے سوچا۔

"کس سلسلے میں...؟"

"یہ تو آپ کو وہاں جا کر ہی پتا چل سکے گا۔ مجھے بس اتنا علم ہے کہ ہمارے باس کو آپ جیسے محنتی لوگوں کی ضرورت ہے۔ وہ آپ کو بہت اچھی تنخواہ اور دیگر مراعات دیں گے۔"

"اچھا....!!" تنخواہ اور مراعات کا سوچ کر ذلفی اس کے ساتھ جانے پر تیار ہو گیا تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد گاڑی ایک شاندار عمارت کے سامنے رکی تھی۔ گاڑی اور عمارت دیکھ کر ذلفی پہلے ہی کافی مرعوب ہو چکا تھا۔

"اگر مجھے یہ جاب مل گئی تو میرے تو دن ہی پھر جانے ہیں!" اس نے دل میں خوش ہوتے ہوئے سوچا۔

"آجائیں، باس آپ کا ہی انتظار کر رہے ہیں۔" غوری نے گاڑی سے نکلتے ہوئے کہا تو اس کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹا تھا۔

بنچ پر سر جھکائے بیٹھے اور نیچے گھاس پر رینگتے ایک کیڑے پر نظریں جمائے ذلفی کی سوچیں اس عمارت میں پہنچی ہوئی تھیں۔ عمارت کے اندر اے سی چل رہے تھے۔ ذلفی کو بے اختیار جھرجھری سی آ گئی۔ سفید ماربل کے چمکدار فرش پر پاؤں جما جما کر چلتے ہوئے اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ پھسل ہی نہ جائے۔

"خوش آمدید مسٹر ذولفقار....!!" غوری نے ایک دروازہ کھولا تو سامنے ایک میز کے عقب میں بیٹھے، شاندار سوٹ میں ملبوس شخص نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ جھجکتا ہوا آگے بڑھا اور میز کے سامنے دھری ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اے سی والے کمرے میں بھی گھبراہٹ کی وجہ سے اسے پسینے آ رہے تھے۔

"السلامُ علیکم سر...."!!

"وعلیکم السلام...آپ پریشان لگ رہے ہیں! ریلیکس ہو جائیں! پریشانی کی کوئی بات نہیں

ہے۔"ادھیڑ عمر شخص نے نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو ذوالفقار دھیرے سے مسکرایا۔ گھبراہٹ ابھی بھی کم نہیں ہوئی تھی۔ غوری قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

"آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ آپ کو یہاں کیوں بلوایا گیا ہے۔"

"جی......!!"ذلفی نے سر ہلایا۔

"آپ کی حیرانی بجا ہے۔"ادھیڑ عمر نے یہ کہتے ہوئے اپنے سامنے رکھی ایک فائل کھولی اور اس میں سے ایک کاغذ نکال کر ذلفی کے سامنے رکھ دیا۔ ذلفی کاغذ پر نظر ڈالتے ہی حیران رہ گیا۔ وہ اسی کی سی وی تھی۔

"یہ.....یہ.....یہ آپ کے پاس کہاں سے آئی؟' '

"ہمارے پاس مختلف اداروں کا کانٹریکٹ ہوتا ہے۔ ان کے پاس سی ویز آتی ہیں اور ان میں سے جو ہمارے مطلوبہ معیار پر پوری اترے، وہ ہم لے لیتے ہیں۔ جیسے آپ نے کہیں ملازمت کے لیے اپنے یہ کوائف بھیجے ہوں گے جو ہمیں موصول ہو گئے۔"

اس کا جواب سن کر ذلفی کو قدرے تسلی ہو گئی۔ ورنہ وہ ابھی تک حیران ہی تھا کہ ان لوگوں کو اس کے بارے میں کیسے پتا چلا کہ وہ ملازمت کی تلاش میں ہے۔

"آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ ہمیں آج کل اپنی کمپنی کے لیے آپ جیسے ہی کسی فرد کی تلاش تھی۔ اگر آپ کی سی وی ہمیں نہ ملتی تو ہم کسی اور کو رکھ لیتے۔"ادھیڑ عمر نے فائل ایک جانب رکھتے ہوئے کہا تو ذلفی جلدی سے بولا،

"نہیں نہیں سر، آپ کو کہیں اور دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ مجھے جاب کی نوعیت بتائیں، میں ان شااللہ آپ کی توقعات پر پورا اتروں گا۔"اسے ڈر لگا کہ ایسی شاندار ملازمت کا سنہری موقع کہیں اس کے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ ادھیڑ عمر اس کی بے صبری دیکھ کر مسکرایا۔

"کام کی نوعیت تو غوری صاحب آپ کو سمجھا دیں گے۔ لیکن اس سے پہلے ایک ضروری بات ہے۔ آپ کو ہر ماہ تیس ہزار روپے تنخواہ ملا کرے گی۔ موٹر سائیکل اور اس کے پٹرول کے پیسے بھی ملیں

گے....اور اگر آپ کا کام پسند آیا تو آپ کو پہلے دوسرے شہر اور پھر دوسرے ملک بھی بھیجا جائے گا۔"

"کک.....کیا؟" ذلفی پر ایک دفعہ پھر حیرت کا پہاڑ ٹوٹا تھا۔ اتنی بہترین تنخواہ اور ساتھ میں موٹر سائیکل....اور پھر بیرون ملک..؟اس نے تو آج تک اسلام آباد تک نہیں دیکھا تھا اور یہ اسے بیرون ملک بھیجنے کی بات کر رہے ہیں!!!

"لیکن ایک شرط ہے!" ادھیڑ عمر کے چہرے پر اب سنجیدگی تھی۔

"وہ کیا...؟"

"آپ نے اس جاب کے بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کرنی۔ رازداری ہماری پہلی اور آخری شرط ہے۔" ذلفی کو ان کی شرط سن کر حیرت ہوئی۔

"تو پھر میں گھر والوں سے کیا کہوں گا؟"

"آپ انہیں بس اتنا بتا سکتے ہیں کہ آپ کو مینیجر لیول کی جاب مل گئی ہے۔ لیکن آپ کے کام کی نوعیت کیا ہوگی، آپ کی تنخواہ، مراعات وغیرہ....اس کے بارے میں آپ کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔"

"یہ تو اتنی مشکل شرط نہیں ہے۔ ویسے بھی حسد کرنے والے بہت جلدی نظر لگا دیتے ہیں۔ مجھے کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔" ذلفی نے دل میں سوچا، پھر مسکراتے ہوئے اس شخص سے کہنے لگا،

"مجھے آپ کی یہ شرط منظور ہے۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"شاباش...!آپ عقل مند انسان ہیں۔ مجھے امید ہے آپ ایسا ہی کریں گے لیکن....!!" اس نے کچھ لمحے کا توقف کیا: "میں آپ کو یہ بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر آپ نے کسی کو بتایا۔ تو نتائج کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔ اس سلسلے میں ہم کوئی نرمی نہیں برتتے...."!!

اس کے لہجہ اچانک اتنا سرد ہو گیا تھا کہ ذلفی کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑتی محسوس ہوئی۔

"نہیں..میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔"

"گڈ.....!" پھر ادھیڑ عمر غوری کی جانب مڑا: "آپ انہیں لے جائیں اور انہیں کام کی ساری

تفصیلات بتادیں۔"

"جی بہتر...!!" غوری نے اٹھتے ہوئے کہااور ذلفی کو اپنے پیچھے آنے کا کہہ کر دفتر سے باہر نکل گیا۔

ذلفی ابھی بھی نظریں گھاس پر جمائے بظاہر کیڑے کو دیکھ رہا تھا جو اب ایک مرے ہوئے کیڑے کو اٹھا کر ایک پتے کے اوپر سے گزرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ غوری اسے اپنے دفتر میں لے آیا تھا اور وہاں کام کی نوعیت سمجھانے اور کچھ کاغذات پر ذلفی کے دستخط لینے کے ساتھ ہی یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ اسے کل صبح سے لے کر کچھ دنوں کے لیے شہر سے قدرے ہٹ کر ایک فارم ہاؤس میں قیام کرنا ہوگا جہاں اس کو مکمل ٹریننگ دی جائے گی۔ لیکن بات وہی....رازداری شرط ہے!

ذلفی اتنی بہترین نوکری کا موقع کیسے جانے دیتا! وہ تو ایسی نوکری کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔ گھر والوں کو یہی بتایا کہ ملتان جا رہا ہے۔ اس کے ذہن میں اس فارم ہاؤس میں گزرے چار دن یاد آرہے تھے جہاں کام کے سلسلے میں تھوڑی بہت ٹریننگ تو تھی ہی لیکن ماحول انتہائی بولڈ تھا۔

شروع میں ذلفی کو تو ٹھیک ٹھاک قسم کا شاک لگا تھا کہ پاکستان کے کسی شہر میں ایسا ماحول بھی مل سکتا ہے جو اس نے اس سے پہلے کسی تھرڈ کلاس انڈین یا انگلش فلم میں ہی دیکھا تھا۔

وہ جوان تھا اور ادائیں اور ترغیب اس کے سامنے بچھ رہی تھیں....وہ کب تک اپنے آپ کو روک کر رکھتا۔

وہ چار دن اس نے ہر لحاظ سے بھرپور انداز میں گزارے تھے اور اب اسے اس مزے اور خوشگوار ماحول کی ایسی لت لگ گئی تھی کہ گھر آنے کے بعد بھی اس کا وجود بے چین تھا۔ ان شب و روز کے مناظر پارک کے ایک کونے پر رکھے بینچ پر سر جھکا کر بیٹھے ذلفی کی نظروں کے سامنے گزر رہے تھے اور اس کے پورے وجود میں ایک بار پھر جیسے چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں.....اسے اُس ماحول کی دوبارہ طلب ہو رہی تھی۔

....☆....

ساتویں اور آٹھویں جماعت کا دو کوسٹرز پر مشتمل ٹرپ مری کی طرف رواں دواں تھا۔ سبھی طالب

علم بہت خوش تھے۔ کچھ شرارتی لڑکے تو زیادہ ہی چہک رہے تھے۔ دراصل دوران سفر ماحول ہی ایسا بنا دیا گیا تھا۔ اور تو اور اساتذہ بھی ان کے ساتھ بھرپور انداز میں لطف اندوز ہو رہے تھے۔

”منگلا سر...! وہ دیکھیں نیچے کتنی گہری کھائی ہے“!

عمر نے شرارت سے منگلا کو ڈرانا چاہا تو اس نے کھڑکی سے نیچے جھانکا اور پھر فوراً ہی گھبرا کر پیچھے ہو گیا۔ عمر اور بلال اس کی اس حرکت پر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ جب سے منگلا مہمان خانے میں منتقل ہوا تھا، اس کی عمر اور بلال کے ساتھ اچھی خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔

”سر جی! کوئی گانا ہو جائے...!“ لڑکوں نے سر احسان سے فرمائش کی تھی۔

”ہاں احسان بھائی، اپنے آواز کا جادو تو جگائیں آج...“ دیگر اساتذہ نے بھی اصرار کیا۔ اصغر شاہ ڈرائیور کے برابر والی نشست پر بیٹھے بظاہر سامنے دیکھتے ہوئے ان کی باتیں سن رہے تھے اور محظوظ ہو رہے تھے۔

”اچھا بھئی، سناتا ہوں۔ سوچنے دو مجھے۔“

”سوچنا کیسا احسان بھائی! وہی گانا سنائیں ناں جو آپ کل اسٹاف روم میں گنگنا رہے تھے۔“

سر رئیس نے کہا تھا۔ سر احسان پہلے تو کچھ ہچکچائے، پھر موج میں آکر جگر مراد آبادی کی غزل گانا شروع کر دی:

آدمی آدمی سے ملتا ہے　　　دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

بھول جاتا ہوں میں ستم اس سے　　　وہ کچھ اس سادگی سے ملتا ہے

لڑکوں کی سمجھ میں کہاں یہ غزل آسکتی تھی بھلا...! اس لیے وہ تو بس اس بات کے مزے لے رہے تھے کہ آج اساتذہ، اساتذہ نہیں، بلکہ ان کے دوست لگ رہے تھے، البتہ اساتذہ اس غزل پر داد دیتے ہوئے سر دھن رہے تھے۔

آج کیا بات ہے کہ پھولوں کا　　　رنگ تیری ہنسی سے ملتا ہے

آدمی آدمی سے ملتا ہے　　　دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

کوسٹر مری کی پہاڑی پر بنی تنگ اور خطرناک سی سڑک پر چلتی جا رہی تھی۔ اس کے اندر اب سر

احسان کے سر کے ساتھ دو مزید اساتذہ نے اپنے سُر ملا دیے تھے۔ دھیرے دھیرے لڑکے سر گوشیوں میں باتیں کرنا شروع ہو گئے تھے اور منگلا اپنے چکراتے سر کو تھامے اس کوشش میں تھا کہ اس کے ذہن سے یہ بات نکل جائے کہ سڑک کی دوسری جانب گہری کھائی ہے!

سفر خیر و عافیت سے گزرا۔ مری کی سیر کرتے ہوئے انھیں احساس ہی نہ ہوا کہ دن کیسے اور کتنی جلدی گزر گیا۔ سبھی نے ایک بھرپور دن گزارا تھا۔ شام ہو رہی تھی اور واپسی کا وقت تھا، جب اچانک وہ ہوا جس کا کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا۔ اسکول کی طرف سے کیمرے کا بندوبست بھی کیا گیا تھا تاکہ اس یادگار ٹرپ کی تصویریں محفوظ کر لی جائیں۔

''سر.... ! تمام اساتذہ کے ساتھ آپ کا ایک گروپ فوٹو ہو جائے؟'' سر ذیشان نے کہا تھا۔

''ہاں ہاں.... ضرور.... !'' اصغر شاہ نے فوراً حامی بھری: ''کہاں کھنچوانا ہے؟''

''یہاں ٹھیک ہے۔ عقب سے پہاڑ نظر آئیں گے تو اچھا لگے گا۔''

سر ہاشمی نے سڑک کے کنارے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تجویز دی تھی۔ وہاں لکڑی سے بنی حفاظتی گرل لگی ہوئی تھی۔ سبھی اساتذہ نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور وہاں ایک ترتیب سے کھڑے ہو گئے۔ اتفاق ہی تھا کہ منگلا کو اصغر شاہ کے برابر میں جگہ ملی تھی۔

''نوید! ہماری اچھی سی ایک تصویر تو لینا۔'' سر ذیشان نے نوید کو بلایا تھا۔

''اوکے سر....'' اس نے کیمرہ پکڑتے ہوئے کہا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے تصویر کھینچ لی۔

''اب رِیل دھلے گی تبھی پتا چلے گا کہ تم نے کسے کاٹا ہے اور کس کی آنکھیں بند آئی ہیں۔''

سر ذیشان نے آگے بڑھ کر نوید سے کیمرہ لیا تو نوید دانت نکالتا ہوا کوسٹر کی جانب بڑھ گیا۔ اصغر شاہ ابھی تک گرل سے اپنے آپ کو ٹکائے کھڑے تھے جب اچانک انہیں سہارا دینے والی لکڑی ٹوٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی اصغر شاہ بھی پیچھے کی جانب گرنے لگے۔

''پکڑو.... !'' ان کے منہ سے بے ساختہ پکار نکلی تھی۔ منگلا نے فوراً لپک کر ان کا ہاتھ تھام کر انہیں پہاڑی سے نیچے گرنے سے بچایا ورنہ اتنی عمودی پہاڑی سے اگر کوئی نیچے گرتا تو اس کا زندہ بچ جانا ناممکنات

میں سے تھا۔ باقی افراد بھی فوراً ان دونوں کی جانب لپکے تھے۔ منگلا نے ان کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام کر انہیں اوپر کی جانب کھینچ لیا۔

''اللہ خیر!!'' سر رئیس نے فکر مندی سے کہا۔

''شاہ جی...! آپ ٹھیک ہیں؟'' اصغر شاہ اس اچانک افتاد سے بری طرح لرز گئے تھے۔ وہ وہیں ایک جانب بیٹھ گئے۔ سر احسان نے پانی کی بوتل ان کے ہونٹوں سے لگائی تھی۔ دو تین گھونٹ پینے کے بعد اوسان بحال ہوئے تو انہوں نے منگلا کی جانب دیکھا۔ وہ ان کے پاس ہی اکڑوں بیٹھا ہوا تھا اور ان کا ہاتھ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پر مضبوطی سے اپنا ہاتھ رکھ کر پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا تھا،

''شکریہ منگلا...! بہت بہت شکریہ..! تم نے مجھے بچالیا۔''

''شاہ جی! کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔'' منگلا نے یہ کہتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔

مری سے خیریت کے ساتھ واپسی ہو گئی تھی۔ بقیہ سفر میں کوئی بدمزگی یا کسی قسم کا حادثہ نہیں ہوا لیکن سبھی پریشان تھے اس لیے کوسٹر میں خاموشی رہی۔ سب کو اپنی اپنی منزل پر اتار کر کوسٹر اپنے اڈے کی جانب روانہ ہو گئی تھی۔ منگلا بھی اپنے کمرے میں تھا اور لیٹنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ منگلا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو سامنے اصغر شاہ کھڑے تھے۔

''شاہ جی! آپ...؟'' منگلا حیران ہوا: ''سب ٹھیک ہے ناں؟''

''ابھی بھی اس لمحے کا سوچ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

اصغر شاہ ذہنی طور پر پریشان تھے۔ منگلا نے انہیں کمرے میں آنے کی دعوت دی۔

''اگر تم وہاں میرے پاس نہ ہوتے، باقی اساتذہ کی طرح کوسٹر کی جانب جا چکے ہوتے تو میرا کیا ہوتا منگلا؟ میری تو لاش بھی شاید نہ ملتی۔''

اصغر شاہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ منگلا نے فوراً آگے بڑھ کر ان کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''نہیں شاہ جی! ایسانہ کہیں.... جو نہیں ہوا اسے سوچ بھی کیوں رہے ہیں؟ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے آپ کو بچانے کا وسیلہ بنایا۔ شاید اللہ نے مجھے آپ کی طرف بھیجا ہی اس لیے ہے تاکہ یں آپ کو ہر لحاظ سے بچا سکوں۔'' اس نے ذومعنی بات کی تھی لیکن اصغر شاہ نے اپنی پریشانی کی وجہ سے اس کی بات پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد اصغر شاہ اپنے گھر چلے گئے تھے۔

اور منگلا بستر پر طمانیت سے لیٹا ہوا مسکرا رہا تھا۔ اسے اصغر شاہ کے مزید قریب ہونے کا خود بخود موقع مل گیا تھا۔ اب اگلے مرحلے کی باری تھی۔

.....☆.....

الوینہ نے بینش اور فہد کی تلاش میں آرٹس کیمپس کے گراؤنڈ میں نظریں دوڑائیں لیکن وہ دونوں کہیں نظر نہیں آئے۔ صبح سے اس کی بینش سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اور وہ بینش کو رات فہد کی پارٹی میں ہونے والی بدمزگی کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔

''جب اسے ڈھونڈنا چاہو تو ملتی نہیں ہے، ویسے ہر وقت ساتھ ہوتی ہے!'' الوینہ نے کوفت سے سوچتے ہوئے سن گلاسز کو آنکھوں پر ٹکایا اور اپنے بالوں میں دایاں ہاتھ پھیرتے ہوئے اکاؤنٹنگ ڈیپارٹمنٹ کی طرف چل دی جہاں شہروز کی کلاس ختم ہونے ہی والی تھی۔

''شہروز......!'' ذہن میں یہ نام آتے ہی الوینہ کے لبوں پر مسکراہٹ سی دوڑی تھی۔ کالج میں دونوں ہم جماعت تھے اور دونوں ہی پڑھائی میں ایک جتنے نکمے... ! کلاس میں بیک بنچ پر بیٹھ کر شرارتیں کرتے نہ جانے کب دونوں ایک دوسرے کے دلوں میں دھڑکنے لگے تھے۔ تب الوینہ کی پھپھو لاہور یں رہتی تھیں اور وہ ان کے گھر مقیم تھی۔

پتھریلی روش پر چلتے ہوئے الوینہ کو بی اے میں فئیرویل کا وہ دن یاد آیا جب تھرڈ ائیر کے لڑکوں اور لڑکیوں نے شرارت کرتے ہوئے شہروز کو لکڑیوں کے تختوں سے بنی ایک jail Hear sweet میں بند کر دیا تھا اور الوینہ کو اسے چھڑانے کے لیے ایک ہزار روپیہ دینا پڑا تھا جو اس نے بہت خوش دلی سے دیتے ہوئے اپنے محبوب کو جیل سے آزاد کروالیا تھا۔

''اس بندے کی خاطر تو میں اپنا سب کچھ دے دوں!'' اس نے دل میں مسکراتے ہوئے سوچا، تبھی ایک مانوس آواز میں اپنا نام سن کر وہ چونک کر رک گئی۔ آواز پیلے پھولوں سے ڈھکی ایک جھاڑی کے عقب سے آرہی تھی۔ وہ فہد کی آواز تھی۔

''کم آن یار! ثاقب نے بس الوینہ کے حسن کی تعریف کی تھی، دیٹس اِٹ...

I don't know why she overreacted so much!

الوینہ کے کان کھڑے ہوگئے۔ وہ وہیں جھاڑی کے پاس خاموشی سے کھڑی ہوگئی۔

''آئی نو....!'' بینش نے جواب دیا تھا۔ ''میں تو شانزے کے ساتھ Catch up کرنے میں بزی تھی جب الوینہ آئی۔ وہ اتنے غصے میں تھی کہ میں سمجھی، پتا نہیں کیا ہوگیا ہے۔''

''مجھے الوینہ بالکل مِس فٹ سی لگتی ہے تمہارے ساتھ۔'' فہد کے لہجے میں ناگواری تھی: ''تمہیں اندازہ نہیں ہے ثاقب نے اُس کی اِس حرکت کا کتنا بُرا منایا تھا۔

Infact, he felt so insulted by Alvina's behaviour that he didn'y stay much longer and left early''

''ہوں...'' بینش نے بس ہنکارا بھرا۔ الوینہ کو اس کی خاموشی پر شدید حیرت ہوئی۔ اسے الوینہ کے حق میں کچھ تو بولنا چاہیے۔

''نیکسٹ ٹائم پلیز...، اسے میری کسی بھی پارٹی میں مت لے کر آنا۔ عجیب ہی لڑکی ہے، اسے تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ ثاقب جیسا برٹش ٹائیکون اسے اپروچ کررہا تھا۔ الٹا اس نے سب کے سامنے ثاقب کی انسلٹ کردی۔'' فہد کا موڈ ٹھیک نہیں ہورہا تھا۔

''آئی ایم سوری یار، آئندہ اسے نہیں لاؤں گی۔ اسٹوپڈ سی لڑکی ہے وہ، ہماری سوسائٹی میں موو کرنے کے اسے ٹھیک سے manners ہی نہیں ہیں۔ اچھا تم تو اپنا موڈ ٹھیک کرو ناں''!

بینش نے لاڈ سے کہا تھا۔ الوینہ پہلے تو کچھ لمحے بت بنی کھڑی رہی۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ جسے وہ اپنی بہترین سہیلی سمجھتی ہے، وہ پیٹھ پیچھے اس کے بارے میں یہ رائے رکھتی ہے۔ دوستی کا ایک ستون تھا

جو اس لمحے دھڑام سے زمیں بوس ہو گیا تھا۔ وہ اپنی اندرونی کیفیت کو سنبھالتے ہوئے ان کے سامنے آگئی۔

"اوہ الوینہ تم!! میں تمہارے پاس ہی آنے والی تھی!" بینش نے اسے دیکھتے ہی بشاشت سے کہا تھا۔

"میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر...." اس نے بینش کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

"اور تم پر بھی........" اب غصے سے اس کی انگلی کا رخ فہد کی طرف تھا: "ساتھ ساتھ تمہارے اُس لفنگے دوست پر بھی.....اور تم لوگوں کی سو کالڈ mannered society پر.......!!!" اتنا کہہ کر وہ رکی نہیں تھی، تیز قدموں اور دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ وہ یونی ورسٹی گیٹ کی جانب بڑھی تھی۔

....☆....

"ایک کو تو قابو کر لیا ہے، دوسرے کو کس طرح کرو گے؟" عبدل نے فون پر رستم سے پوچھا تھا۔

"اس کا بھی کچھ سوچتا ہوں، ویسے اس کے بارے میں ساری معلومات مل گئی ہیں مجھے۔ بدھو سا ہے، جذباتی سا۔ دوسروں کی باتوں میں فوراً آ جانے والا۔" رستم نے جواب دیا تو عبدل نے کچھ سوچتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

"ہوں.... یسے لوگوں کو اپنا بنانا قدرے آسان ہوتا ہے.... تم ایسا کرو کہ....." عبدل رستم کو اپنا منصوبہ بتانے لگا تھا۔

"آپ فکر نہ کریں، جیسا آپ نے کہا ہے، ویسا ہی ہو گا۔" عبدل نے اپنی بات مکمل کی تو رستم نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ جواب دیا تھا

.....☆.....

فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اپنے فوٹو کاپی نوٹس کو فائل میں ترتیب سے لگاتے ہوئے منال کی نظر سامنے سے آتی الوینہ پر پڑی تھی۔ اسے الوینہ کا چہرہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ وہ سرخ ہو رہا تھا، آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں، اور ہونٹ دانتوں تلے دبے ہوئے تھے، جیسے ضبط کر رہی ہو۔ منال کی رفتار خود بخود

آہستہ ہو گئی۔ وہ اُس لڑکی کو روک کر پوچھنا چاہ رہی تھی کہ کیا بات ہے، لیکن الوینہ کی امارت کا سوچتے ہی اس نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔

''امیر لوگوں کے مسئلے بھی چونچلوں کی طرح ہوتے ہیں۔ لڑکوں اور آسائشوں کے گرد گھومنے والے۔''

منال نے دل میں سوچا تھا۔ اسی وقت الوینہ نے تیز تیز چلتے ہوئے زور سے اپنا ہاتھ فٹ پاتھ کے ایک جانب بنی دیوار پر مارا تھا۔ منال کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ جس طاقت سے الوینہ نے اپنا ہاتھ دیوار پر مارا تھا، منال کے حساب سے اسے ضرور بہت درد ہوا ہو گا لیکن الوینہ کے چہرے پر درد کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔

''آپ.... آپ۔ ٹھیک تو ہیں ناں؟'' الوینہ اس کے پاس سے گزر رہی تھی جب ایک بار پھر منال کا اس سے پوچھنے کو دل چاہا لیکن الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ وہ وہیں رکی الوینہ کی پشت کو دیکھ رہی تھی کہ اچانک الوینہ نے فٹ پاتھ سے سڑک پر قدم رکھ دیے۔ ٹریفک سگنل کو سبز ہوئے کچھ ثانیے ہی گزرے تھے اور موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں کا بہاؤ تیزی سے سڑک سے گزر رہا تھا۔

''الوینہ... !!'' منال تیزی سے پکارتے ہوئے اس کی طرف بھاگی تھی۔ الوینہ کی ایک موٹر سائیکل سے ٹکر ہونے ہی والی تھی کہ منال نے لپک کر اس کا بازو پکڑا اور اسے فٹ پاتھ کی طرف کھینچ لیا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے فٹ پاتھ پر گرنے ہی والی تھی کہ منال کے سہارے نے اسے گرنے سے روک دیا۔

''یہ کیا کرنے لگی تھیں آپ...؟''

منال نے پریشانی سے پوچھا تھا۔ الوینہ سنبھل کر اب کھڑی ہو چکی تھی۔ کچھ لمحے تو وہ ڈبڈبائی نظروں سے منال کو دیکھتی رہی، پھر وہیں فٹ پاتھ پر اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

منال کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ الوینہ سے کیا پوچھے اور کیسے تسلی دے؟ یہ سب کچھ اچانک ہی ہو گیا تھا اسے ہاسٹل لے آئی تھی اور اب وہ دونوں منال کے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ الوینہ کسی حد تک اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی۔ فاطمہ یونی ورسٹی میں ہی تھی۔

''میں تو آپ کو بس... پانی ہی دے سکتی ہوں۔'' منال نے ہچکچاتے ہوئے پلاسٹک کے ایک گلاس میں پانی الوینہ کی طرف بڑھایا تھا جسے اس نے ٹوٹی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ پکڑ لیا اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

''تھینکس...'' خالی گلاس منال کی جانب بڑھاتے ہوئے الوینہ نے کہا تھا۔ منال گلاس کو میز پر رکھ کر خود ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ دوسری کرسی پر الوینہ بیٹھی ہوئی تھی جو حسبِ عادت کرسی کے بازو کی لکڑی کو اپنے ناخن سے کھرچ رہی تھی۔ کچھ وقت اسی خاموشی ہیں گزر گیا۔ منال کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا بات کرے، یا بات کا آغاز کس طرح کرے، جب کہ الوینہ، وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی۔

''اہم....'' منال نے ہمت پکڑی اور گلے کو ہلکا سا کھنکھارتے ہوئے الوینہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانا چاہی۔

''وہ... میں پوچھنا... چاہ رہی تھی.... کہ آپ ٹھیک ہیں؟'' الوینہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے نروس ہو کر اپنے ماتھے پر آئی لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑسنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''تمہاری لائف میں اتنا سکون کس طرح ہے؟'' جواب کی بجائے الوینہ کی طرف سے سوال آیا تھا۔ منال نے ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھا۔

''کیا مطلب....؟''

''تم اتنی مطمئن کس طرح ہو اپنی لائف، اپنی زندگی سے....؟ تمہیں اس زندگی سے کبھی وحشت محسوس نہیں ہوئی؟ '

الوینہ عجیب سے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

''نن..... نہیں..... وحشت کیوں ہونی ہے؟ یہ زندگی اتنی پیاری سی ہے۔'' منال ہلکا سا مسکرائی۔

''میری تو نہیں ہے۔'' الوینہ کی آنکھوں میں دوبارہ نمی اتر رہی تھی: ''میری زندگی میں تو وحشت ہی وحشت ہے۔ وحشت اور ویرانی۔''

منال نے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھی اس لڑکی کو دیکھا جس کے ہاتھوں کی جلد اتنی ملائم تھی کہ موم کا

گمان ہوتا تھا، اس کی مخروطی انگلیوں کے کونوں پر سلیقے سے کٹے ناخنوں پر میٹ شید کی نیل پالش لگی ہوئی تھی، ایک انگلی پر سلور رنگ کی انگوٹھی پر غالباً نازک سا ہیرا کمرے کی کھڑکی سے آتی دھوپ میں جگمگ کر رہا تھا، اس نے کالے پلازو پر سرخ رنگ کی کاٹن کی شرٹ پہنی ہوئی تھی جس کے گلے کے ایک جانب کالی کڑھائی سے کچھ ڈیزائن بنے ہوئے تھے۔

''اس لڑکی کو زندگی سے وحشت ہوتی ہے؟ ناقابلِ یقین...!'' منال نے الوینہ کے کانوں میں لٹکتی بالیوں کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

''میری زندگی میں بظاہر تو سب کچھ ہی ہے۔'' الوینہ افسردگی سے مسکرائی۔ اس کی نظریں کرسی کے بازو پر جمی تھیں جہاں بہت ہلکی سی کھرچن کا نشان تھا: ''لیکن حقیقت میں کچھ بھی نہیں ہے۔ تم بھی کہتی ہوگی کہ میں کیا عجیب باتیں کر رہی ہوں''!

اس نے نظر اٹھا کر منال کو دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر الوینہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''آپ مجھ سے کھل کر بات کر سکتی ہیں۔''

''تم نے مجھے وہاں سڑک پر مرنے کیوں نہیں دیا؟ یقین کرو، اگر میں وہاں مر جاتی تو میری ڈیتھ سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑنا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے میرے زندہ رہنے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''ایسا مت کہیں آپ.... آپ کے والدین ہیں، دوست ہیں۔''

''کون سے والدین...؟ اور کون سے دوست...؟'' الوینہ نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے منال سے نظریں چرا لیں۔ اسے ڈیڈی کے جملے یاد آ گئے تھے جو انہوں نے منال کے بارے میں کہے تھے۔

''میرے پیرنٹس کو میری چاہت نہیں ہے، اور میرے دوستوں کو میں مسِ فٹ اور اسٹوپڈ لگتی ہوں...اور تم لوگ.....'' الوینہ نے دوبارہ منال کی جانب دیکھا۔ ''تم لوگوں کو میں بہت مغرور اور بگڑی ہوئی امیر زادی لگتی ہوں.... ہے ناں؟'' اس کے سوال پر منال گڑبڑا سی گئی جبکہ حقیقت یہی تھی جو الوینہ نے بیان کی تھی۔ منال نے الوینہ کو ہمیشہ 'بگڑی ہوئی امیر زادی' کے طور پر ہی یاد کیا تھا۔

''نن.... نہیں.....ایسی بات نہیں ہے....آپ خود ہی ہم سے دور رہتی ہیں۔''

''یو آر رائٹ..... ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔''الوینہ نے یاسیت سے سر ہلایا:''میں غلط جگہ پر خلوص ڈھونڈ رہی تھی۔ لیکن آج مجھے پتا چل گیا ہے کہ لوگوں کے خلوص کو ان کی مالی حیثیت سے نہیں ناپا جا سکتا۔اس سو کالڈ ایلیٹ سوسائٹی میں کتنا خلوص ہے، یہ آج میں بہت اچھی طرح جان گئی ہوں۔''الوینہ کے لہجے میں نمی اتر رہی تھی۔

''لیکن آپ کو میرے خلوص پر کوئی شک نہیں ہونا چاہیے الوینہ...''!!

منال نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا تھا۔الوینہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔وہ نرم سی،اپنائیت بھری مسکراہٹ لیے الوینہ کو ہی دیکھ رہی تھی۔ جواب میں الوینہ نے بھی دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر مسکراہٹ سے جواب دیا تھا۔

....☆....

یاسر عشاء کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا تھا اور اب اپنی سوچوں میں مگن گھر کی طرف چل رہا تھا کہ اچانک ایک پولیس وین اس کے پاس آکر رکی۔

''کدھر جا رہا ہے تو...؟''

یہ کہتے ہوئے ایک سپاہی وین سے نکلا اور یاسر کو گدی سے پکڑ کر وین میں پھینک دیا۔ حیران پریشان سا یاسر اس افتاد پر، بھائی۔ بات سنو.... بات تو سنو... کہتا رہ گیا۔ پولیس وین اسے لیے آگے بڑھ چکی تھی۔راستے میں بھی یاسر نے اپنی صفائی دینے اور اپنا قصور پوچھنے کی کوشش کی لیکن آگے سے چہرے پر ایک طمانچے کے ساتھ اسے خاموش کروا دیا گیا تھا۔

''ہور بادشاہو..!آ گئے ہو خیر سے؟'' تھانے پہنچ کر سپاہیوں نے اسے بازو سے پکڑ کر وین سے باہر نکالا اور تھانے دار کے سامنے لا کھڑا کیا۔ کالے توے جیسی رنگت والا تھانے دار اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے اپنی موٹی مونچھوں کو تاؤ دینے لگا تھا۔اس کے بائیں گال پر جبڑے کی ہڈی کے عین اوپر ایک کالا مسہ اس کے مزاج کی کرختگی کو مزید نمایاں کر رہا تھا۔

''سر جی...! میرا قصور کیا ہے؟'' یاسر گھبرایا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

''اوئے قصور کے بچے...! ڈاکے ڈالتے ہو اور اوپر سے پوچھتے ہو کہ قصور کیا ہے؟'' اس کے سوال پر تھانے دار غصے سے میز پر دونوں ہاتھ مارتے ہوئے دھاڑا تھا۔ یاسر سہم کر دبک سا گیا: ''سیدھا طرح بتا کہ مال کدھر چھپایا ہے؟''

''سر...!! آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے کوئی ڈاکا نہیں ڈالا..!!'' یاسر نے کمزور آواز میں کہا تھا۔ جواب میں اس کے پیچھے کھڑے ایک سپاہی نے اس کی گدی پر ایک جھانپڑ رسید کیا تھا۔ یاسر اپنی گدی سہلا کر رہ گیا۔

''اوئے تم بتاؤ۔!'' تھانے دار ایک سپاہی کی طرف مڑا۔ ''پولیس انسپکٹر سکندر علی خان کو کوئی غلط فہمی ہو سکتی ہے؟''

''نہیں سر جی۔'' سپاہی نے کڑک آواز میں جواب دیا تھا۔

''تم بتاؤ...!!'' تھانے دار نے پھسلتی ہوئی پینٹ کو توند پر چڑھاتے ہوئے دوسرے سپاہی کا رخ کیا۔

''نہیں سر جی....ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔'' دوسرے سپاہی نے بھی فوراً کہا تھا۔

''تو اِس مامے دے پتر کو لگتا ہے کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے اور میں کسی اور کے دھوکے میں اسے پکڑ لایا ہوں...!'' تھانے دار نے اپنی گول آنکھوں کو گھماتے ہوئے طنزیہ لہجے میں یاسر کی طرف دیکھا تھا۔ یاسر کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ کسی بڑی مصیبت میں پھنس چکا ہے۔

''سر جی! اسے رات کو میرا مہمان بنائیں۔ میں اس کی ایسی اچھی مالش کروں گا کہ صبح تک اس کی ساری غلط فہمی دور ہو جائے گی۔''

پہلے سپاہی نے پیشکش کی تھی۔

''لل.....لیکن.....!!'' یاسر نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن تھانے دار نے تیزی سے اس کے سر کے بالوں کر پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔

''ابھی بھی مِن مِن کر رہا ہے؟ بڑا دم ہے تجھ میں بھئی! ورنہ پولیس انسپکٹر سکندر علی خان کے سامنے تو بڑے سے بڑے مجرم کا پِتّہ پانی ہو جاتا ہے۔'' درد اور ذلت کے احساس سے یاسر کی آنکھو میں آنسو آ گئے تھے۔

''سر جی! بہت بڑا فراڈیا ہے یہ... پہلے ڈاکا ڈالا اور پھر اپنے آپ کو معصوم دکھانے کے لیے مسجد چلا گیا۔ مسجد کے باہر سے پکڑ کر لا رہے ہیں اسے۔''

ایک سپاہی نے لقمہ دیا۔

''نہیں.....!!'' یاسر نے پھر کچھ کہنا چاہا تھا۔

''اوئے ہم نے بھی بڑے بڑے فراڈیوں کو سیدھا کیا ہے۔ تھانے دار اپنی کرسی کی جانب بڑھا۔ تبھی یاسر کے ذہن میں ایک خیال آیا۔

''میں اپنے گھر فون کر سکتا ہوں؟ میرے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔'' اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

''اتنی جلدی کیا ہے؟ ہمیں بھی میزبانی کرنے کا شرف بخشیں ناں..!'' تھانے دار نے دوبارہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔ یاسر کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس مشکل سے کیسے باہر نکلے۔

''اوئے گلزار! اسے لے کر جا اور لاک اپ نمبر سات میں بند کر دے۔ صبح دیکھیں گے اس کے ساتھ کیا کرنا ہے۔'' تھانے دار نے بے زار لہجے میں ایک سپاہی سے کہا تھا۔

''لل.... لیکن سر....!!'' یاسر نے مزاحمت کی کوشش کی تھی۔

''زیادہ پہلوان نہ بن اوئے! سیدھی طرح چل...'' گلزار نے اس کا گریبان پکڑ کر کھینچا تھا۔ جھٹکے سے یاسر کی قمیض کے دو بٹن ٹوٹے اور گریبان کھل گیا۔

''چلتا ہے یا چار پانچ ڈکیتیاں تیرے کھاتے میں اور ڈال دوں؟'' تھانیدار نے گرج دار آواز مین یاسر کو ڈپٹا تھا: ''تیرا ایسا تگڑا کیس بناؤں گا کہ پوری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑتا رہے گا! چپ چاپ

بات مان لے اب.... چل شاباش“!

تھانے دار نے کہا تھا۔ گلزار یاسر کو جھانپڑ رسید کرتے ہوئے کمرے سے باہر لے گیا۔

”او سہیل! ایک کڑک دوپتی تو پکڑ لا.... سر میں درد شروع ہو گیا ہے۔“ یاسر نے اپنے عقب میں تھانے دار کی آواز سنی تھی جو وہ دوسرے سپاہی سے کہہ رہا تھا۔

....☆....

اصغر شاہ ڈیرے پر بکائن کی چھاؤں میں بیٹھے، ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ ٹکائے، دونوں بازوؤں کے سہارے اپنے سامنے اخبار پھیلائے پڑھ رہے تھے۔ جمعرات کو آدھے دن کی چھٹی کی وجہ سے سبھی سکول سے جلدی فارغ ہو گئے تھے۔

"کوئی خاص خبر شاہ جی ــــــــ؟" منگلا نے ان کے برابر میں رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں بھئی، وہی پرانی خبریں، سیاست دانوں کے آپس کے جھگڑے، عوام کے مہنگائی کے رونے، امریکہ کی چالاکیوں کا احوال، افغانستان میں شکست پر روس کی آئیں بائیں شائیں۔"

"اور ضرورتِ رشتہ کے اشتہار...۔!" منگلا نے لقمہ دیا تو اصغر شاہ ہنس پڑے۔

"اب ہماری عمر کہاں ضرورتِ رشتہ کے اشتہار کھنگالنے کی ــــــ، ہاں اپنی جوانی میں ضرور یہ کام کیا تھا۔"

"آپ کا زمانہ اچھا تھا شاہ جی۔ اس وقت اتنی شرائط نہیں ہوتی تھیں۔ اب تو لوگ رشتے کی بات چلانے سے پہلے مسلک دیکھتے ہیں کہ اگلا بندہ ہمارے مسلک کا ہے یا نہیں، اگر تو ہمارے مسلک کا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ کافر ہے کافر۔" منگلا نے تلخی سے کہا تھا۔ اصغر شاہ نے اخبار پڑھتے ہوئے بس ہنکارا بھرا۔

"شاہ جی!" منگلا نے انہیں پکارا۔ "ویسے کیا آپ بھی مسلکی چکروں میں پڑتے ہیں؟" اصغر شاہ نے

سوال سن کر چونک کر اسے دیکھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے؟" ان کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ منگلا گھبرا سا گیا۔

"مجھے.... مجھے تو نہیں لگتا کہ آپ ایسی باتوں کو اہمیت دیتے ہیں ورنہ یوں اپنے دروازے اور دستر خوان ہر کسی کے لیے نہ کھولتے۔" اصغر شاہ نے اس کا جواب سن کر زیرِ لب مسکراتے ہوئے اخبار کو تہہ کر کے ایک جانب رکھا اور اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"دیکھو بھئی، میں سیدھا سادا سا بندہ اور عام سا مسلمان ہوں۔ کون کافر ہے کون نہیں، یہ تو مولوی حضرات جانیں۔ مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ کوئی مسلمان ہے یا نہیں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے، ارے بھئی وہ انسان تو ہے ناں!! اسی کی رعایت دے دے بندہ۔"

"صحیح کہہ رہے ہیں شاہ جی! بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔" منگلا کے لہجے میں تھوڑا سا جوش عود آیا: "کچھ شدت پسند لوگوں نے کسی مسلک، کسی فرقے کو کافر قرار دیے بغیر نہیں چھوڑا۔ حالانکہ سبھی ایک اللہ پر یقین رکھتے ہیں اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو نبی مانتے ہیں۔"

"بس لوگوں کی تنگ نظری ہے۔ اور کیا کہے انسان۔" اصغر شاہ نے کہا۔

"میں تو کہتا ہوں کہ جب تک انسان کا مطالعہ وسیع نہیں ہوتا، اس کا دماغ اور ذہن نہیں کھلتا۔ اور جب دماغ ہی نہیں کھلے گا تو تنگ نظری تو ہونی ہی ہے! بندہ اپنے مسلک کا تو مطالعہ کرے ہی لیکن اگر دوسروں کے مسلک کے بارے میں بھی پڑھ لیا جائے تو پھر پتا چلتا ہے کہ مولویوں نے بس ایسے ہی اپنا کام چلانے کے لیے ان باتوں کو نمایاں کیا ہوا ہے جو اختلافی ہیں، حالانکہ زیادہ تر باتوں میں اتفاق ہی ہوتا ہے۔"

"اسی لیے میں دوسرے مذاہب، دوسری اقوام اور دوسرے عقیدوں کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ ذہن کھل جائے تو پھر وسعتِ قلبی حاصل ہوتی ہے۔"

"مجھے آپ کی باتین سن کر بہت خوشی ہو رہی ہے شاہ جی...!!" منگلا کے لہجے میں بھی خوشی تھی: "مجھے لگتا ہے میں اس موضوع پر آپ سے بلا جھجک بات کر سکتا ہوں۔ پہلے مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ برا نہ

مان جائیں۔''

''نہیں، مجھے تو اس طرح کی گفتگو پسند ہیں۔ نئی باتیں پتا چلتی ہیں اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ تم بتاؤ، کس کے بارے میں بات کرنی ہے؟''ان کا سوال سن کر منگلا کچھ ثانیے تو رک کر فیصلہ کرتا رہا کہ اسے بات کرنی بھی چاہیے یا نہیں، پھر ہلکا سا مسکراتے ہوئے سرگوشی بھرے انداز میں بولا:

''بس یہی عقائد و نظریات کے بارے میں...''

ابھی منگلا کچھ خاص قسم کے عقائد و نظریات کے بارے میں بتانے ہی لگا تھا کہ اسی وقت ظہر کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ منگلا اور اصغر شاہ دونوں ہی خاموش ہو گئے۔ منگلا نے کن اکھیوں سے اصغر شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے جذب کے عالم میں آنکھیں بند کیے، اذان کا جواب دے رہے تھے۔ منگلا کا دل آنے والے وقت کا سوچ کر زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ ماتھے پر پسینے کے کچھ قطرے نمودار ہو گئے تھے۔

''صلی اللہ علیہ وسلم.....''اذان کے اختتام پر دعا اور درود پڑھنے کے بعد اصغر شاہ نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور منگلا کی طرف متوجہ ہوئے۔

''ہاں بھئی، کیا کہہ رہے تھے تم...؟''

''میرا خیال ہے شاہ جی...!! یہ وقت موزوں نہیں ہے، تھوڑی ہی دیر میں جماعت شروع ہو جائے گی۔ اگر آپ کو برا نہ لگے تو ہم ظہر کی نماز کے بعد اس موضوع پر بات کریں؟''منگلا نے تجویز دی تھی۔

''ہاں...!! ظہر کے بعد زیادہ بہتر رہے گا۔ ابھی تو نماز کی تیاری کرنی ہے۔ میں وضو کر لوں، پھر مسجد چلتے ہیں۔''

اصغر شاہ نے اٹھتے ہوئے کہا تو منگلا بھی کھڑا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے شاہ جی....!!''اپنے کمرے میں آکر منگلا نے دروازہ بند کیا اور اپنے سامان میں سے کچھ پمفلٹس نکال کر انہیں غور سے پڑھنے لگا۔ اس کے اصل کام کا وقت اب شروع ہو چکا تھا۔

....☆....

رات کو فاطمہ اپنا ٹوتھ برش اور منال کی ٹوتھ پیسٹ لے کر باتھ روم گئی ہوئی تھی کہ جب کسی نے

ہلکی سی دستک دے کر دروازہ کھولا تو کرسی پر بیٹھ کر ایک ناول پڑھتی منال نے چونک کر سر اٹھایا ،تو دروازے پر الوینہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ دوپہر کے واقعے کے برعکس اس وقت وہ بہت مطمئن اور تازہ دم سی لگ رہی تھی۔

"Hello Neighbour!" اس نے بے تکلفی سے کہا اور اندر آکر دھپ سے منال کے بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک گفٹ باکس تھا۔

"ہیلو....." منال نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"دوپہر کو میں اپنے مسئلے میں ہی اتنا گم تھی کہ تمہارا شکریہ بھی ادا نہ کر پائی۔" یہ کہتے ہوئے الوینہ نے ہاتھ میں پکڑا گفٹ باکس اس کی جانب بڑھایا:

" یہ میری طرف سے، ہماری دوستی کا پہلا تحفہ !!

"شکریہ...!! لیکن اس کی ضرورت نہیں تھی۔" منال نے ناول ایک طرف رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا مطلب ضرورت نہیں تھی؟" الوینہ نے تیکھی ابروؤں کو اوپر چڑھایا: "تحفہ ضرورت تھوڑی ہوتا ہے، تحفہ تو تحفہ ہوتا ہے، اس بات کا اظہار کہ مجھے تم اچھی لگی ہو، اس لیے میں تم سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔ چلو اب پکڑو اسے.....!" الوینہ نے کچھ تحکمانہ، مان بھرے لہجے میں کہا تو منال نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے تحفہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"بہت دعائیں...... تھینکس..."!!

"نو تھینکس! مجھے یہ فارمیلیٹیز سخت ناپسند ہیں۔ دوستی میں ایسا کچھ نہیں چلتا.... سمجھی آپ....؟" الوینہ نے جس انداز میں انگلی اٹھا کر اسے کہا، منال کو ہنسی آگئی۔

"کل ملتے ہیں پھر یونی میں فرینڈز....!!" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا تو منال نے بھی مسکراتے ہوئے اس سے مصافحہ کر لیا۔

"جی، فرینڈز...."!!

''گڈ...''!

الوینہ کے جانے کے بعد کچھ دیر تو منال گفٹ باکس کو ایسے ہی دیکھتی رہی، پھر اس کا ریپنگ پیپر اتارنا شروع کیا۔

کالے رنگ کے ڈبے کے اندر مختلف جگمگاتے ہوئے نگوں سے سجا ایک ایک خوب صورت، نازک سا لیکن مہنگا کڑا اپنی جھب دکھا رہا تھا۔ اگلے روز صبح جب دونوں یونیورسٹی کے لیے تیاری کر رہی تھیں تو اچانک فاطمہ چونک پڑی۔

''ارے....!'' منال نے یونی ورسٹی جانے کی غرض سے فائل اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو قریب ہی کنگھی کرتی فاطمہ نے جھٹ اس کا بازو پکڑ لیا۔ منال کے بازو میں الوینہ کا دیا ہوا تحفہ جگمگا رہا تھا۔

''واہ....!! کتنا پیارا کڑا ہے!!'' فاطمہ کے لہجے میں ستائش تھی۔ منال مسکرائی۔ اس نے فاطمہ سے الوینہ کے آنے کا ذکر نہیں کیا تھا۔

''شکریہ.... شکریہ''!!

''ہائے منال! یہ تو بہت ہی زیادہ پیارا ہے۔ کتنے کا لیا؟ بہت مہنگا ہو گا۔'' فاطمہ نے کڑے کو منال کی کلائی پر گھمایا۔

''کسی نے تحفہ دیا ہے، ورنہ اتنا مہنگا کڑا میں کیسے خرید سکتی ہوں۔'' منال نے نرمی سے اپنے بازو کو فاطمہ کی گرفت سے چھڑوایا۔

''اتنا مہنگا کڑا...؟ کہیں کسی لڑکے وڑکے کا چکر تو نہیں شروع ہو گیا؟'' فاطمہ نے عینک کے پیچھے کھوجتی نظروں سے منال کو دیکھا۔

''نہیں نہیں... میں اتنی گھٹیا حرکت کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ یہ مجھے الوینہ نے دیا ہے۔'' منال نے یہی مناسب جانا کہ فاطمہ کو سچ بتا دے۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں فاطمہ اپنی طرف سے کچھ غلط اخذ کر کے ہاسٹل میں بات نہ پھیلا دے۔

''الوینہ نے...؟'' منال کی بات سنتے ہی فاطمہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل سی گئیں۔ ''تمہارا

مطلب ہے الوینہ، یہ کمرہ نمبر اکیس والی نک چڑھی سی الوینہ نے؟؟؟'' منال نے اثبات میں سر ہلایا اور فائل سینے سے لگا کر کمرے سے نکلنے لگی۔ اسے اب فاطمہ کی تفتیش سے الجھن ہو رہی تھی۔

''واہ بھئی! لوگوں کے تو ایک ہفتے میں ہی بڑے بڑے لوگ دوست بننے لگ گئے ہیں، ایک ہم ہیں، کوئی ہمیں منہ ہی نہیں لگاتا۔'' فاطمہ نے مصنوعی آہ بھری تھی۔ اپنے پیچھے کمرے کا دروازہ بند کرتی منال مسکرا کر رہ گئی۔

....☆....

رات تھانے میں یاسر کی ٹھیک ٹھاک 'سیوا' کی گئی تھی۔ صبح سویرے دوبارہ اسے تھانے دار کے سامنے اس حالت میں پیش کیا گیا کہ جگہ جگہ سے اس کی شرٹ پھٹی ہوئی تھی اور نچلا ہونٹ مار کی ضرب سے ایک جانب سے سوجا ہوا تھا۔ پشت پر پڑنے والے چھتر کی وجہ سے وہ قدرے لڑکھڑا کر چل رہا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں، نہ جانے ان کی سرخی کا سبب نیند کی کمی تھا یا ذلت کی تکلیف، یا پھر قصور نہ ہونے کے باوجود قصور وار ٹھہرائے جانے کی اذیت۔

''ہاں بھئی گلزار! یہ بولا کہ نہیں....؟'' تھانے دار صاحب اپنی میز پر حلوہ پوری کا ناشتہ کھولے بیٹھے تھے۔

''نہیں سر جی....! بس یہی کہتا رہا کہ یہ چور نہیں ہے۔''

حلوہ پوری کی خوشبو سے گلزار کی بھوک بھی چمک گئی تھی۔ ساری رات یاسر کے ساتھ مغزماری میں گزری تھی۔

''ہوں.... دیکھتا ہوں میں...'' تھانے دار نے تیل میں تربتر پوری کا بڑا سا لقمہ اپنے منہ میں ڈالتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ یاسر وہیں فرش پر ایک جانب کھڑا کراہ رہا تھا۔ اس کی کلائیوں پر ہتھکڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔

'' یا تو پھر گلزار! تیرے اندر جان نہیں رہی یا پھر اس کے اندر تجھ سے زیادہ جان ہے۔'' اس نے انگلیاں چاٹ کر یاسر کی طرف اشارہ کیا۔

''نہ سر جی! میں نے تو ابھی پھر بھی اس کا لحاظ کیا ہے، سنگل پسلی لڑکا ہے، میں نے سوچا کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو نوی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔آپ اجازت دیں تو پھر دیکھیں، میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ابھی تو میں نے کچھ کیا ہی نہیں ہے''!

گلزار کی نظر چنوں سے بھرے ہوئے اس لقمے پر تھی جو تھانیدار اپنے منہ کی جانب لے کر جا رہا تھا۔یاسر اس وقت اتنا نڈھال تھا کہ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ کون کیا کھا رہا ہے یا کیا کہہ رہا ہے،اسے بس گھر جانا تھا۔اسی وقت تھانے دار نے بڑا ساڈکار لیا۔

''الحمدللہ...! چل فر ایسا کر گلزار...!اسے کچھ چائے شائے پلا اور خود بھی کچھ کھا پی لے، بلکہ یہ حلوہ پوری لے جا اور پیٹ بھر اپنا۔اس کے بعد پھر سے شروع ہو جانا....پچاس ہزار روپے کی ڈکیتی ہے، کوئی عام بات نہیں ہے۔مجھے اوپر رپورٹ دینی ہے اور اس سے مال بھی نکلوانا ہے۔''

''جی سر جی! آپ فکر ہی نہ کریں....اس کے تو بڑے بھی اگل دیں گے کہ مال کہاں چھپایا ہوا ہے۔''

گلزار نے جلدی سے آگے بڑھ کر میز پر رکھی حلوہ پوری او چنے کا سامان اٹھایا تھا:''اور اس کی بھی میں صیحح سے کٹ لگواتا ہوں تو پھر....''ابھی گلزار نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک کوئی تھانے دار کے کمرے میں داخل ہوا۔

''السلامُ علیکم سکندر صاحب.....!''یاسر کو وہ آواز کچھ جانی پہچانی سی لگی تھی۔سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس نے بمشکل سر اٹھا کر آواز کی جانب دیکھا اور حیران رہ گیا۔وہاں عبدل کھڑا تھا۔

''وعلیکم السلام جی!'' تھانے دار نے چائے کا کپ اپنے سامنے رکھا اور عبدل کو گھورا۔اس کی آنکھوں میں ناشناسائی تھی۔

''میں وہی جس کی گاڑی ایک بچے سے ٹکرا گئی تھی.....آپ کو یاد آیا؟''عبدل کی نظر ابھی تک یاسر پر نہیں پڑی تھی۔

''اوہ ہاں، اچھا اچھا! یاد آگیا۔'' تھانے دار نے لمبی سی سُڑکی کی ساتھ چائے کا گھونٹ بھرا:''اب

ہمارے لائق کوئی خدمت جناب؟''

''نہیں نہیں... کیسی بات کررہے ہیں آپ!'' عبدل نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا:

''بلکہ میں آپ کے لیے کچھ ہدیے لے کر آیا تھا۔ آپ نے بہت خیال رکھا تھا میرا۔'' اس کے ساتھ ہی عبدل نے ایک بھاری بھرکم ساشاپر تھانیدار کی طرف بڑھایا جسے اس نے ندیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے فوراً پکڑا تھا۔

''ویسے اس کی کیا ضرورت تھی جناب....؟ ہمارا تو فرض ہے.... خدمت آپ کی۔''

تھانے دار نے شاپر کے اندر جھانکتے ہوئے مروتاً تکلف نبھانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

''اور آپ کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے سکندر صاحب!'' اچانک عبدل کی یاسر پر نظر پڑی تھی: ''یہ....؟ یہ یہاں کیا کررہا ہے..؟''

''او جی...!! آپ جانتے ہیں اسے؟'' تھانیدار نے دوبارہ باآواز بلند چائے کی چسکی لی تھی۔

''جی جی....'' عبدل نے یاسر کے چہرے کو بغور دیکھا: ''یہ وہی تو ہے جسے میں نے اپنے دوست کا کارڈ دے کر بھیجا تھا، جب مجھ سے وہ حادثہ ہوا تھا۔'' عبدل نے کہا تو یاسر نے درد کرتے سر کو اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اسے وہاں سے نکلنے کی کوئی امید نظر آئی تھی۔

''اوہ اچھا....!!'' تھانے دار نے سر ہلایا۔ گلزار اپنی جگہ الگ بے چین تھا کیونکہ اس کا ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

''میں نے..... کچھ نہیں کیا......'' یاسر نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔

''آپ اسے کیوں پکڑ لائے ہیں..؟ اس نے کیا کیا ہے؟'' عبدل نے پریشان لہجے میں تھانیدار سے پوچھا۔

''او جناب! اس پر ڈکیتی کا الزام ہے! کل دوپہر کو گلشنِ جوہر کی ایک کوٹھی میں ڈکیتی کی واردات ہوئی تھی۔ وہاں کے مالک مکان نے ڈکیت کا جو حلیہ بتایا تھا، یہ اُس حلیے پر پورا بیٹھتا ہے۔ اوپر سے یہ کل تھا بھی اسی علاقے میں۔ ساری نشانیاں اسی کی طرف اشارہ کرتی ہیں جی....بس اسی لیے پکڑ کر لے

آئے۔ابھی تواس کی ٹھیک سے خاطر مدارت نہیں کی۔ایک واری لما پا کے سیوا ہو گی تو خود ہی بول پڑے گا۔"

تھانیدار نے غصیلی آنکھوں سے یاسر کو گھورتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں نہیں جناب...!آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔میں اس لڑکے کو جانتا ہوں، یہ بہت شریف گھرانے کا لڑکا ہے۔یہ ایسا کام نہیں کر سکتا۔"

عبدل کے لہجے میں یقین تھا۔یاسر کی ہمت بندھی۔

"انہوں نے مجھے کل رات سے یہاں بند کیا ہوا ہے۔ساری رات مارتے رہے ہیں مجھے....اور مجھے گھر بھی فون نہیں کرنے دیا۔"

یاسر نے اٹکتے ہوئے کہا تو عبدل نے تاسف سے تھانے دار کی جانب دیکھا:

"ایسا تو نہ کریں ناں آپ..... تھانے دار صاحب! یہ تو غلط طریقہ ہے"!

"جناب...! ہماری بھی مجبوری ہے۔نوکری کا سوال ہوتا ہے۔اوپر والے جب ہم سے رپورٹ مانگتے ہیں تو پھر ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ہمیں اس بندے کو اٹھانا ہوتا ہے جس پر ہمیں زرا سا بھی شک ہو۔" تھانے دار کڑک دار لہجے میں بولا۔

"لیکن میں اس لڑکے کی ضمانت دیتا ہوں۔ یہ بے گناہ ہے۔" عبدل نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا تو تھانے دار سوچ میں پڑ گیا۔

"ٹھیک ہے عبدل صاحب! اگر آپ اس کی ضمانت دے دیں تو ہم اسے رہا کر دیتے ہیں۔" تھانے دار کی بات سن کر یاسر نے انتہائی حیرت اور مشکور آنکھوں سے عبدل کی طرف دیکھا تھا جو اب تھانیدار سے اس کے حوالے سے معاملات طے کر رہا تھا۔یاسر کا یہی خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ عبدل اس کے باپ تک اطلاع پہنچا دے گا اور اس کے باپ کسی نہ کسی طرح اسے تھانے سے نکلوا دیں گے، لیکن یہاں تو عبدل خود اس کی ضمانت کروا رہا تھا!

تھانے سے فراغت کے بعد عبدل نے یاسر کو اپنی گاڑی میں بٹھایا اور ساتھ والی مارکیٹ سے اس کے

لیے جوس لینے چلا گیا۔ کچھ دیر میں وہ واپس آیا، یاسر نے جوس اور بسکٹ لیے تو اسے کچھ ہوش آیا۔ عبدل نے اسے نرم لہجے میں کہا:

''پہلے تم میرے ساتھ میرے گھر چلو، وہاں اپنا حلیہ درست کرو، پھر اپنے گھر فون کر کے بتادینا کہ تم خیریت سے ہو۔'' گاڑی چلاتے ہوئے عبدل نے یاسر کو کہا تھا۔ جس پر یاسر اپنا سر ہلا کر رہ گیا تھا۔

''میں.... مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ.... میں آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔'' یاسر نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا تھا:

'' میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔''

''ارے! انسان ہی انسان کے کام آتا ہے جوان...!'' عبدل مسکرایا:

'' عجیب اتفاق ہی تھا کہ میرا آج تھانے کا چکر لگ گیا، وہ بھی صبح سویرے.... ورنہ میرا کوئی ارادہ نہیں تھا...بس ایک غیر مرئی طاقت مجھے جیسے مجبور کر رہی تھی کہ تھانے میں کسی کو میری ضرورت ہے۔ تو بس، اسی بے چینی کو دور کرنے کے لیے آگیا ورنہ تم نہ جانے کب تک ان سلاخون کے پیچھے رہتے اور یہ لوگ تمہارے اوپر اللہ جانے کتنے کیس ڈال دیتے۔''

عبدل نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بتایا۔

''اب میرے گھر چلو، اس حلیے میں اپنے گھر جاؤ گے تو وہ تمہیں دیکھتے ہی بہت پریشان ہو جائیں گے۔ بس انہیں فون کر کے بتادو کہ ایک ایمرجنسی میں ایک دوست کے ساتھ دوسرے شہر جانا پڑ گیا تھا۔'' اس کی بات سن کر یاسر نے بوجھل دل کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

....☆....

''آنٹی....! عمر کہاں ہے؟'' بلال نے ان کے گھر میں داخل ہو کر نگہت بیگم کو سلام کرنے کے بعد پوچھا تھا۔ وہ کچن میں مصروف تھیں۔

''ٹی وی کے سامنے گیم لگا کر بیٹھا ہوگا۔''

انہوں نے وہیں سے جواب دیا تھا۔ بلال ٹی وی روم کی جانب بڑھ گیا۔ عمر واقعی وہاں موجود تھا اور ٹی

وی پر ماریو گیم کھیل رہا تھا۔
"عمر! دیکھو تو میں کتنی زبردست چیز لایا ہوں!" بلال نے دبے دبے جوش سے کہا تو عمر نے سکرین سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر منہ بنا کر دوبارہ سکرین کی جانب متوجہ ہو گیا۔ بلال کے ہاتھ میں اشتیاق احمد کا ایک ضخیم ناول تھا۔
"یہ زبردست چیز تم ہی پڑھو اور مجھے گیم کھیلنے دو۔" ماریو نے کچھوے کے اوپر چھلانگ لگا کر اسے اس کے خول میں بند کر دیا تھا۔
"یار، تم اگر ایک دفعہ فاروق کی باتیں پڑھ لو تو ہنس ہنس کر تمہارے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔" بلال نے ایک اور کوشش کی۔
"بھئی مجھے اپنے پیٹ میں بل نہیں پڑوانے۔" کچھوا خول سے اپنے منہ اور پاؤں باہر نکال کر دوبارہ چلنا شروع ہو گیا تھا۔
"نہیں تو نہ سہی....!!" بلال کا جوش ماند پڑ گیا: "تمہیں یاد ہے ناں آدھے گھنٹے میں قاسم کی ٹیم کے ساتھ ہمارا میچ ہے؟"
"ہاں ہاں، مجھے یاد ہے، تم اپنا ناول پڑھو، میں بس یہ سٹیج مکمل کر لوں، پھر ہم اکھٹے چلتے ہیں۔" عمر نے ماریو کو پاور اپ سٹار کھلاتے ہوئے کہا تو بلال منہ بناتا ہوا باہر نکل گیا۔ موسم اچھا تھا اس لیے اس نے ایک کرسی اٹھائی اور دیوار کے ساتھ اگے بکائن کی چھاؤں میں بیٹھ کر ناول پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ دیوار کی دوسری جانب، اِسی بکائن کی چھاؤں میں اصغر شاہ اور منگلا کچھ لمحوں بعد آ کر بیٹھنے والے ہیں!

....☆....

یونی ورسٹی میں بھی الوینہ اس کے ساتھ ساتھ رہی۔ دونوں کی نشست بھی برابر میں تھی۔
"آؤ، کینٹین چلتے ہیں۔"
جیسے ہی مسز ہاشم کی English Methodology کی کلاس ختم ہوئی، الوینہ نے اس کا ہاتھ

پکڑا اور ایک جانب چل دی۔ منال کو سب کچھ عجیب تو لگ رہا تھا لیکن اسے اچھا بھی لگ رہا تھا۔ ایک ایلیٹ کلاس کی لڑکی اس سے دوستی کی خواہاں تھی اور اسے ہر جگہ اپنے ساتھ لیے پھر رہی تھی۔

کینٹین کے بالکل سامنے گھاس سے ڈھکے ایک میدان میں لکڑی کے بنے کچھ بنچ اور میزیں تھیں جہاں طلباء کینٹین سے کھانا خرید کر بیٹھتے اور دوستوں کے سنگ گپ شپ کرتے ہوئے وقت گزارتے۔ انہی میں سے ایک میز کے گرد فہد، بینش اور شہروز بیٹھے ہوئے تھے۔ منال نے دور سے بینش کو پہچان لیا تھا۔ وہی بینش جس نے رجسٹریشن والے دن اس کے لباس اور پسماندہ پسِ منظر کا مذاق اڑایا تھا۔ بینش کو دیکھ کر منال کچھ جھجک سی گئی۔

"الوینہ! مجھے لائبریری میں کچھ کام ہے۔آپ اپنے دوستوں کے پاس جائیں، میں لائبریری جاتی ہوں۔" منال نے بہانہ بنایا۔

"کون سے دوست؟" الوینہ کے لہجے میں فہد اور بینش کو دیکھ کر تلخی اتر آئی تھی۔

"وہ....." منال نے آنکھوں سے اس بنچ کی جانب اشارہ کیا۔

"ہائے الوینہ! ہم یہاں ہیں!!" شہروز کو یقیناً فہد، بینش اور الوینہ کے درمیان کھٹ پٹ کا علم نہیں تھا، تبھی اس نے الوینہ کو آواز دی تھی۔ الوینہ نے اس کے ساتھ فہد اور بینش کو دیکھتے ہی اپنا چہرہ دوسری جانب موڑ لیا اور ایک دوسرے بینچ کی جانب بڑھ گئی۔ منال میکانکی انداز میں اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

"اسے کیا ہوا ہے؟ اور اس کے ساتھ کون ہے؟" شہروز کو اس کے ردِ عمل پر حیرت ہوئی تھی۔

"دماغ خراب ہو یا ہے اس کا۔" بینش نے بھی کڑوے انداز میں کہا تو شہروز نے پہلے بینش کو اور پھر الوینہ کو دیکھا۔

"کوئی فائٹ ہو گئی ہے کیا تم دونوں کے درمیان؟ "

"فائٹ وہاں ہوتی ہے جہاں فرینڈ شپ ہو، اور ہماری فرینڈ شپ پر وہ لعنت بھیج چکی ہے۔ چلو فہد، چلیں یہاں سے...." بینش نے یہ کہہ کر اٹھتے ہوئے کہا تو فہد بھی کھڑا ہو گیا۔ شہروز حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''لیکن تم دونوں تو بیسٹ فرینڈز تھے یار...''!!

''تھے....اب نہیں ہیں۔''الوینہ نے تڑخ کر جواب دیااور فہد کا ہاتھ پکڑ کر چل پڑی۔ شہروز الجھ سا گیا تھا۔جب کوئی سرا ہاتھ نہ آیا تو اٹھ کر الوینہ کے بینچ کی جانب چل پڑا۔

''تمہارے اور بینش کے بیچ کوئی....''اس نے الوینہ کے قریب جاتے ہی کہا لیکن پھر منال کو دیکھ کر جھجھک گیا۔

''ان کا تعارف..؟''شہروز نے منال کو گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ منال کی اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ شہروز کی جانب دیکھ پاتی۔وہ بس لکڑی کے بنے بنچ کی ایک جانب سے قدرے اکھڑی ہوئی سیلن زدہ لکڑی کو دیکھے گئی۔

''یہ منال ہے، میرے ہاسٹل کمرے کی ہمسائی اور میری کلاس فیلو... جو اب میری بہت اچھی دوست بھی ہے۔کیوں منال..؟''الوینہ نے اس کا تعارف کروانے کے ساتھ ہی اس سے سوال بھی پوچھ لیا۔جواب میں سیلن زدہ لکڑی کو دیکھتے ہوئے منال بس دھیرے سے سر ہلا کر مسکرا سکی۔شہروز حیرت اور دلچسپی سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''یعنی تمہاری اور بینش کی فرینڈشپ واقعی میں ختم ہو گئی ہے؟''

''ہاں، تھینکس گاڈ فار دیٹ..!''الوینہ نے ایسے سانس لیا جیسے ایک بوجھ اس کے سر سے ٹلا ہو:''لیکن اچھا ہی ہوا ہے...اس کے بدلے مجھے بہت اچھی دوست مل گئی ہے۔''الوینہ نے مسکراتے ہوئے منال کی طرف دیکھا۔

''یہ تو بہت برا ہوا.... مم..میرا مطلب ہے کہ.......''

شہروز کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ منال کے سامنے کیا بات کرے۔ منال نے بھی اس کی ہچکچاہٹ محسوس کر لی تھی۔

''الوینہ! پلیز مجھے کچھ کام ہے۔کلاس میں ملیں گے۔''یہ کہتے ہوئے منال نے ایک جانب قدم بڑھا دیے۔

"یار، تم نے اس لڑکی سے کیسے دوستی کرلی؟آئی مین، Look at her and look at you!!!... تم دونوں کہیں سے بھی فرینڈز نہیں لگتے یار۔" اس کے کچھ دور جاتے ہی شہروز نے تیزی سے الوینہ کے برابر میں بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ اس کے اور میرے اسٹیٹس میں بہت فرق ہے۔"

منال نے اپنے عقب میں الوینہ کی آواز سنی تھی۔اس کے لہجے میں مضبوطی تھی: "لیکن مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا، مجھے وہ اچھی لگی ہے اور میں اپنے اسٹیٹس کے لوگوں میں دوستی کرنے کا نتیجہ دیکھ چکی ہوں, They are like scorpians, no matter how hard yoi try, they sting you whenever they have a chance!"

الوینہ نے نفرت سے کہا تھا۔اس کا یہ لہجہ دیکھ کر شہروز خاموش ہو گیا تھا۔

....☆....

"شاہ جی! اگر آپ میری بات کو تحمل سے اور کھلے ذہن کے ساتھ سنیں گے تو آپ میری بات کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔" نماز سے فارغ ہو کر منگلا اور اصغر شاہ کی محفل بکائن کی چھاؤں کے نیچے جم چکی تھی۔

"تم فکر نہ کرو۔" اصغر شاہ نے مسکراتے ہوئے اسے حوصلہ دیا۔

"بس ہمارے ہاں کے ملاؤں اور مولویوں نے ہمارے مسلک کا بہت غلط نقشہ لوگوں کے سامنے کھینچا ہوا ہے۔ ہمارے مسلک پر تو باقاعدہ کفر کے فتوے لگتے ہیں، اسی لیے ہم اسے کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرتے۔ جان تو سب کو پیاری ہوتی ہے۔" منگلا کے لہجے میں بے چارگی تھی۔ان کی باتوں سے ناول پڑھتے ہوئے بلال کا بار بار انہماک ٹوٹ رہا تھا۔

"تم کون سے مسلک کی بات کر رہے ہو؟" اصغر شاہ چونکے۔

"اس کو چھوڑیں شاہ جی، پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں آپ کا کیا یقین ہے؟" منگلا نے الٹا انہی سے سوال کر ڈالا۔اس کا سوال سن کر بلال چونک اٹھا تھا۔اس نے نظریں اٹھا کر

دیوار کو گھورا جس کی دوسری جانب بیٹھے منگلا اور اصغر شاہ باتیں کر رہے تھے۔

"ہمارا تو یہی یقین ہے کہ حضرت عیسیٰ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ آسمان پر اٹھا لیا تھا۔ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ انہیں دوبارہ زمین پر بھیجا جائے گا۔" اصغر شاہ پوری طرح متوجہ تھے۔

"لیکن شاہ جی!!" منگلا کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ "جو آسمان پر ہے، وہ زیادہ افضل ہے یا جو زمین پر ہے، وہ زیادہ افضل ہے؟" بلال کے کان اب انہی کی باتوں کی طرف لگے ہوئے تھے۔ اس نے آہستگی سے ناول بند کر دیا۔

"ظاہر سی بات ہے، جو افضل ہوتا ہے، وہی آسمان پر ہوتا ہے۔" اصغر شاہ نے وثوق سے کہا۔ منگلا کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"لیکن حضرت محمد ﷺ تو زمین میں دفن ہیں۔ تو پھر افضل کون ہوا؟"

اس کے سوال پر اصغر شاہ چونک گئے۔ ان کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نمودار ہو گئے۔

"لیکن افضل تو حضرت محمد ﷺ ہی ہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔"

"بے شک، بے شک۔ اس میں تو کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا، ہونا بھی نہیں چاہیے۔" منگلا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ بلال نے بھنویں سکیڑیں۔

"لیکن ان باتوں کا تمہارے مسلک سے کیا تعلق ہے؟" اصغر شاہ نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"شاہ جی......!" منگلا کی مسکراہٹ گہری ہو گئی: "ہمارا یہ ماننا ہے کہ حضرت محمد ﷺ حضرت عیسیٰ سے بہت افضل ہیں۔ اسی وجہ سے ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کو اللہ نے آسمان پر نہیں اٹھایا تھا، بلکہ جب یہودیوں نے انہیں تختۂ صلیب پر چڑھایا اور وہاں سے بھاگ گئے۔ حضرت عیسیٰ زخمی حالت میں وہاں سے نکل کر کشمیر کے علاقے سری نگر کی طرف آ گئے اور ایک سو بیس سال کی عمر میں وہیں وفات پا گئے۔"

منگلا نے ایک ایک لفظ کو ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے ہوئے کہا۔ اس کی بات سن کر بلال کا حیرت کے

مارے منہ کھل گیا۔ دور کہیں کوئی کتا اچانک بھونکا تھا۔

"اچھا.....!!" اصغر شاہ ٹھوڑی کو کھجاتے ہوئے سوچ میں پڑ گئے۔ "یہ تو نئی بات بتا رہے ہو تم.....!!" لوہا گرم دیکھ کر منگلا نے دوبارہ چوٹ لگائی۔

"یہ بات میں یا میرا عقیدہ نہیں کہہ رہا، یہ بات تو خود قرآن مجید میں ہے۔ رکیں، میں آپ کو دکھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر منگلا الماری کی طرف گیا اور اس میں سے ایک قرآن مجید نکال کر لے آیا۔ "یہ دیکھیں شاہ جی.....!" یہ کہہ کر اس نے قرآن مجید کھول کر سورۃ آل عمران اصغر شاہ کے سامنے کی اور آیت نمبر پچپن پر انگلی رکھ دی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں:

جب اللہ نے فرمایا:

"اے عیسیٰ! بے شک میں تمہیں پوری عمر تک پہنچانے والا ہوں اور تمہیں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تمہیں کافروں سے نجات دلانے والا ہوں اور تمہارے پیروکاروں کو ان کافروں پر قیامت تک برتری دینے والا ہوں، پھر تمہیں میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے سو جن باتوں میں تم جھگڑتے تھے، میں تمہارے درمیان ان کا فیصلہ کر دوں گا۔"

منگلا نے قرآن مجید سے نظریں ہٹا کر اصغر شاہ کی جانب دیکھا۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ انہوں نے منگلا کے ہاتھ سے قرآن مجید لے کر اس آیت کو غور سے پڑھا۔

"آپ اس کا ترجمہ دیکھیں۔ اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں کہ عیسیٰ! میں تجھے وفات دینے والا اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔ اب شاہ جی، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بات کا اظہار فرمائیں اور اسے پورا نہ کریں؟ وہ تو 'کن' کہتے ہیں اور وہ بات ہو جاتی ہے۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا ناں کہ اللہ تعالیٰ آیت میں کہیں کہ میں حضرت عیسیٰ کو وفات دینے والا ہوں، اور پھر اللہ تعالیٰ ایسا نہ کریں۔" بلال حیرت سے سب کچھ سن رہا تھا۔

"تم نے تو مجھے الجھا سا دیا ہے۔ میں نے تو کبھی اس زاویے سے سوچا ہی نہیں تھا۔" اصغر شاہ کے لہجے میں الجھن تھی۔ منگلا مسکرایا۔ پھر ان کے ہاتھ سے قرآن مجید لے کر واپس الماری میں رکھتے ہوئے کہنے

لگا۔

""شاہ جی...! ہم لوگ بس مولویوں کے پیچھے ہی بھاگتے رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جو انہوں نے کہہ دیا، بس کہہ دیا۔ وہی درست ہے۔ انہوں نے ہی ہمارے ذہنوں میں ڈالا ہے کہ حضرت عیسیٰ زندہ آسمان کی طرف اٹھا لیے گئے تھے۔ اس طرح تو نعوذ باللہ وہ حضرت محمد ﷺ کی توہین کے مرتکب نہیں ہو جاتے کہ حضرت عیسیٰ زندہ ہیں اور آسمانوں پر ہیں اور ہمارے حضرت محمد ﷺ وفات پا چکے ہیں اور زمین میں مدفون ہیں؟ استغفر اللہ""!

منگلا نے کانوں کو ہاتھ لگایا تھا۔

"" صحیح کہہ رہے ہو منگلا...! تمہاری بات میرے بھی دل کو لگ رہی ہے۔"" اصغر شاہ نے پُرسوچ لہجے میں کہا تھا۔ بلال نے تعجب سے دوبارہ دیوار کی جناب یوں دیکھا جیسے اسے دیوار کے اُس پار بیٹھے اصغر شاہ نظر آ رہے ہیں۔

""انکل کیسی باتیں کر رہے ہیں!! اور منگلا بھائی؟"" اس نے بھنویں سکیڑتے ہوئے سوچا تھا۔

""لیکن شاہ جی! پلیز ایک وعدہ کریں!"" منگلا نے منت بھرے لہجے میں اصغر شاہ کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے۔ ""آج ہم دونوں کے درمیان یہ جو بھی باتیں ہوئی ہیں، ان کا آپ کسی سے بھی ذکر نہیں کریں گے۔ ورنہ میرا یہاں رہنا ناممکن ہو جائے گا شاہ جی.... آپ پڑھے لکھے ہیں اور تحمل سے بات سنتے ہیں۔ ہر کوئی ایسا نہیں ہوتا اور ان مولویوں اور ملاؤں کا تو آپ کو پتا ہے ناں کہ خواہ مخواہ کا فساد شروع کر دیتے ہیں۔""

""ہاں ہاں، تم فکر نہیں کرو۔ یہ بات ہمارے درمیان ہی رہے گی۔"" اصغر شاہ نے اس کے ہاتھوں کو تھپتھپایا تھا۔ منگلا مسکراتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ اصغر شاہ جانتے نہیں تھے کہ منگلا انہیں کس راستے کی طرف لے کر جا رہا ہے۔ بلال خاموشی سے اٹھا اور عمر کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

""عمر...! میں گھر جا رہا ہوں۔ میرے سر میں اچانک بہت درد شروع ہو گیا ہے۔""

اس نے دروازہ کھول کر گیم کھیلتے عمر کو بتایا اور اس کا جواب سنے بغیر ہی دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔ دور کہیں کتا مسلسل بھونکے جا رہا تھا۔

بلال گھر میں داخل ہوااور آہستگی سے گیٹ بند کرکے، چپ چاپ اپنے کمرے کی جانب بڑھنے ہی لگا تھاکہ گلاب کے پودے کی کاٹ چھانٹ کرتے اس کے باباجان عبدالکریم صاحب کی نظر اس پر پڑ گئی۔

''بلال بیٹے.....!'' انہوں نے حیرت سے اسے آواز دی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رک گیااور ان کی جانب دیکھا۔ عبدالکریم صاحب کو وہ پریشان اور الجھا ہوا سالگا۔

''السلامُ علیکم اباجان....''!!

''وعلیکم السلام...!! سب خیر ہے ناں؟ تم لوگوں کا تو کوئی میچ ہونا تھا۔''!

عبدالکریم صاحب کے پوچھنے پر بلال نے الجھے ہوئے سے انداز میں اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''جی، لیکن میرے سر میں درد شروع ہو گیا ہے اس لیے میں عمر کو بتا کر گھر آگیا ہوں۔''

''اوہ...!! اچھا چلو آرام کرو جا کر۔ اپنی ماں سے کہنا کہ سر درد کے آرام کی گولی بھی دے دیں تمہیں۔''

ان کے کہنے پر بلال سر ہلا کر اندر کی طرف بڑھ گیا تو عبدالکریم صاحب بھی دوبارہ پودے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

....☆....

منال اور الوینہ کلاس میں برابر کی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور الوینہ اسے پیڈی کیور کرنے کا طریقہ بتا رہی تھی۔

''منال...!'' منال نے آواز کی سمت سر اٹھا کر دیکھا تو فاطمہ اگلی نشست سے ان کی جانب آرہی تھی۔ اس نے بڑی سی ایک چادر اوڑھی ہوئی تھی۔

''السلامُ علیکم.....!'' قریب آنے پر اس نے ان دونوں کو سلام کیا تھا۔ منال نے تو جواب دیا، الوینہ البتہ خاموش رہی۔

''وعلیکم السلام....''!!

''منال، پلیز تمہارے پاس کوئی اضافی پین ہے؟ میرا بال پوائنٹ گم گیا ہے۔'' فاطمہ الوینہ کو ایک

نظر دیکھ کر منال کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''ٹھہرو، میں دیکھتی ہوں...'' یہ کہہ کر منال نے اپنے بیگ میں جھانکا، کچھ تردد کے بعد اسے ایک بال پوائنٹ مل ہی گیا، جو اس نے فاطمہ کی جانب بڑھا دیا۔

''لیکن پلیز اسے گم نہیں کرنا، میرے پاس بس یہی دو بال پوائنٹ ہیں۔''

''تھینک یو منال... بہت شکریہ...!!'' فاطمہ نے مسکرا کر پین پکڑا، دوبارہ ایک نظر منہ پھیر کر بیٹھی الوینہ پر ڈالی اور اپنی نشست کی جانب بڑھ گئی۔ شام کو منال اپنے کمرے میں گئی تو فاطمہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

''منال! بات سنو.....!!'' ہاسٹل کے کمرے میں اب وہ دونوں بیٹھیں مالٹا چھیل رہی تھیں۔ فاطمہ کرسی سے اٹھی، ہاتھ دھو کر اس نے اپنے کپڑے تہہ کر کے الماری میں رکھنا شروع کیے اور ایک بار پھر منال کو پکارا:

''منال...! کہاں گم ہو بھئی..؟''

''ہوں.... بولو...'' منال نے ہنکارا بھرا۔

''تم.....'' فاطمہ کچھ کہتے کہتے رک گئی:

''تمہیں عجیب نہیں لگتا... الوینہ کا تمہارے ساتھ دوستی کرنا؟ میرا مطلب ہے کہ ......وہ اتنی ماڈرن، فیشن ایبل لڑکی ہے، میں نے ہمیشہ اسے چست پینٹ اور شرٹ میں ہی دیکھا ہے، لڑکوں سے اس کی دوستی ہے۔ اِدھر دوسری طرف تم ہو۔ اتنی سادہ سی اور بالکل معصوم سی۔ تو..... ' '

فاطمہ کپڑے تہہ کرتے کرتے رک گئی تھی۔ منال مالٹے کی ایک پھانک آہستہ آہستہ چباتے ہوئے اس کی بات سن رہی تھی۔

''دیکھو منال....!'' اس کی توجہ اپنی طرف پا کر فاطمہ نے ہاتھ میں پکڑی ایک تہہ شدہ قمیض وہیں بستر پر رکھی اور اس کے قریب چلی آئی:

'' میری امی نے مجھے ہاسٹل بھیجنے سے پہلے مجھے نصیحت کی تھی کہ اپنے اسٹیٹس کے لوگوں میں ہی

رہنا، ان ہی سے میل جول بڑھانا۔ اگر کوئی امیر لڑکی تمہاری طرف متوجہ ہو تو ضرور اس کے پیچھے اس کا اپنا مفاد یا کوئی وجہ ہوتی ہے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟''

''ہاں میں سمجھ رہی ہوں، لیکن الوینہ ایسی نہیں ہے اور اسے مجھ سے کیا غرض ہو سکتی ہے بھلا؟ میں تو اسے کچھ بھی نہیں دے سکتی اور وہ کہتی ہے کہ وہ دوستی میں اسٹیٹس نہیں دیکھتی۔'' منال نے جواب دیا اور مالٹے کی ایک اور پھانک منہ میں رکھ لی۔ مالٹے کا کھٹا میٹھا رس اس کے پورے منہ میں بھر سا گیا تھا۔

'' مجھے میری امی نے ایک بات اور بھی کہی تھی.....'' فاطمہ کچھ ہچکچائی۔

''کیا.....؟'' منال نے رس نگلتے ہوئے پوچھا۔

''انہوں نے کہا تھا کہ...... یہ امیر لڑکیاں غریب لڑکیوں سے اس لیے بھی دوستی کرتی ہیں تا کہ انہیں۔ٹریپ کر سکیں۔ یعنی وہ انہیں اپنے جال میں پھنسا کر پھر غلط جگہ پر بھیج دیتی ہیں۔'' فاطمہ نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات مکمل کی لیکن اس کی بات سن کر منال کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔ مالٹے کا رس ایک دم کڑوا سا محسوس ہوا تھا۔

''فاطمہ پلیز.....!!'' منال نے کچھ سخت لہجے میں اسے کہا: ''الوینہ میری سہیلی ہے۔ اور تمہیں اس کے بارے میں اس طرح کی بات کہنے کا بالکل حق نہیں ہے!! تم شاید مجھ سے حسد کر رہی ہو کہ الوینہ نے مجھ سے دوستی کی ہے اور تمہیں وہ منہ نہیں لگاتی، تبھی تم ایسی بات کر رہی ہو۔'' منال کے لہجے اور الفاظ میں تلخی تھی۔ فاطمہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''میں ایسی لڑکی کے منہ لگنا بھی نہیں چاہتی جس کا کردار ہی مشکوک ہو۔ سمجھ آئی تمہیں؟ کرو جو تم نے کرنا ہے۔ واقعی، میں کون ہوتی ہوں تمہیں روکنے یا سمجھانے والی......'' یہ کہہ کر فاطمہ غصے سے اٹھی، اپنے ہاتھ میں پکڑی قمیض کو بستر پر پھینکا اور کمرے کا دروازہ زور سے بند کرتے ہوئے چلی گئی۔

پیچھے منال رہ گئی تھی۔ اس نے بھی غصے میں اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا مالٹا پلیٹ میں پٹخا اور سینے پر دونوں بازو تہہ کر کے کرسی پر ٹیک لگا لی۔ دونوں ہی نہیں جانتی تھیں کہ کچھ ہی دیر پہلے الوینہ ان کے دروازے پر دستک دینے والی تھی کہ اندر سے آتی آوازیں اور اپنا نام سن کر رک گئی تھی اور ان کی باتیں سن کر فاطمہ کے

کمرے سے باہر نکلنے سے پہلے ہی اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

....☆....

عبدل نے یاسر کو اپنا ایک چست سا لباس دیا تھا جو یاسر کو بالکل فٹ آیا تھا۔ نہا دھو کر جب یاسر کمرے میں آیا تو عبدل تب تک چائے بنا کر کپ میز پر رکھ چکا تھا۔ چائے کے ساتھ کچھ لوازمات بھی تھے۔

"ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ قمیض شلوار تمہارے لیے ہی بنا تھا۔"

عبدل نے اسے ستائشی نظروں سے سر سے پاؤں تک دیکھا تھا۔ یاسر زخمی سی مسکراہٹ کے ساتھ قمیض کے کف کو تہہ کرتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ عبدل کا سادہ سا گھر تھا۔ جس کمرے میں وہ بیٹھے ہوئے تھے، وہ ڈرائنگ روم تھا جس میں بس دو صوفے اور ایک میز رکھی ہوئی تھی۔

"آپ کے گھر میں اور کوئی نہیں ہے؟" یاسر نے گھر کی خاموشی کو محسوس کیا۔

"ہے لیکن وہ یہاں نہیں رہتے، دوسرے شہر میں رہتے ہیں۔ مجھے ملازمت کے سلسلے میں یہاں رہنا پڑتا ہے۔"

عبدل نے جواب دیا اور ساتھ ہی چائے کا ایک کپ اس کی طرف بڑھایا۔

"چلو اب چائے پیو۔ گرما گرم چائے تمہارے اندر جائے گی تو تمہارے جسم کو کچھ سکون ملے گا۔ ورنہ پولیس کی مار سے تو اللہ بچائے"!

یاسر نے اس کے ہاتھ سے کپ لیا لیکن اسے لبوں سے نہیں لگایا۔ وہ کپ کو میز پر رکھ کر سر جھکا کر

کسی سوچ میں گم ہو گیا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو جوان...؟" عبدل نے اپنا کپ اٹھایا۔ یاسر نے اس کے سوال پر چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"یہاں کے سسٹم کے بارے میں.... میں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا اور یہ مجھے اٹھا کر تھانے لے گئے تھے۔ میں تو نماز پڑھ کر خوشی خوشی گھر جا رہا تھا کیونکہ مجھے ایک جگہ سے ملازمت انٹرویو کے لیے فون آیا تھا۔ آج مجھے انٹرویو کے لیے جانا تھا نو بجے۔"

یاسر نے کہتے ہوئے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالی۔ وہاں دس بج رہے تھے۔

"اوہ.... مجھے معلوم ہے کہ تم بے گناہ تھے، تبھی تو تمہیں وہاں سے نکالا۔"

"لیکن وہاں گزرے وقت کا ڈراما پوری زندگی میرے ساتھ رہے گا عبدل بھائی..."!!

یاسر نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ کیسا سسٹم ہے جو کسی بھی بے گناہ کو اس کے ناکردہ جرم کی بنیاد پر تھانے میں بند کروا دیتا ہے اور تشدد کر کے اقرارِ جرم کرواتا ہے؟ وہاں مجھے جن گالیوں کو سہنا پڑا، جن تھپڑوں کی ذلت کو برداشت کرنا پڑا اور اپنے باپ کے بارے میں جن حقارت بھرے جملوں کو سننا پڑا، وہ میں جانتا ہوں یا میرا رب..."!!

یاسر اپنے دل کی بھڑاس نکالنا شروع ہو گیا تھا، عبدل نے اسے بولنے دیا۔

"یہ کیسا نظام ہے جو ایک اچھے بھلے معزز شہری کی عزت کو پل بھر میں خاک میں ملا دیتا ہے؟ میرے والد نے مجھے ہمیشہ اس ملک کی قدر کرنا سکھایا ہے لیکن یہ لوگ.... یہ کیوں اس طرح کرتے ہیں کہ انسان اس سسٹم سے اور اس ملک سے ہی بے زار ہو جائے؟"

یاسر کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے کو تھے۔ وہ آنسو آنسو نہیں تھے، حقیقت میں مان ٹوٹنے کی تکلیف تھی، وہ مان جو ہر باعزت شہری کو اپنے ملک پر ہوتا ہے۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو یاسر... نہایت افسوس کی بات ہے کہ کرپٹ لوگ اپنی کرپشن چھپانے کے لیے کسی کے بھی گلے میں رسی ڈال دیتے ہیں، چاہے اس بندے کا کچھ بھی لینا دینا نہ ہو.... میرا اپنا بھائی بھی

اس سسٹم کا شکار ہو چکا ہے۔‘‘عبدل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو یاسر چونکا۔

’’آپ کا بھائی بھی...؟‘‘

’’ہاں یاسر! میرا اپنا چھوٹا بھائی...!! ہمارے گھر کا سب سے زیادہ لاڈلا۔‘‘ یاسر کے لبوں پر زخمی سی مسکراہٹ پھیلی:

’’ وہ بہت ذہین اور قابل تھا۔ ہم اس وقت لودھراں میں رہتے تھے۔اس کے بڑے اونچے خواب تھے کہ ڈاکٹر بن کر مریضوں کی خوب خدمت کرے گا... غریبوں کا مفت علاج کرے گا وغیرہ....وہی خواب جو کسی بھی نرم دل اور پُر خلوص انسان کے ہوتے ہیں۔‘‘

یاسر توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا:’’اسے خدمتِ خلق کا بہت شوق تھا.....اور اس کی یہی خدمتِ خلق کی لگن اسے لے ڈوبی۔‘‘

عبدل دھیرے دھیرے بتا رہا تھا۔:’’کچھ غنڈوں سے اس کی لڑائی ہو گئی تھی،انہوں نے موقع ملتے ہی اس کی ایسی درگت بنائی کہ...‘‘

دکھ کی شدت سے عبدل جملہ بھی مکمل نہیں کر پایا۔ کرب اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا، جیسے ماضی کا وہ منظر ابھی بھی اس کے سامنے چل رہا ہو:

’’ہم نے پولیس میں رپورٹ کروائی لیکن انہوں نے بجائے ان غنڈوں کو پکڑنے کے، میرے بھائی کو ہی پکڑ لیا اور تین ماہ کے لیے تھانے میں بند کر دیا۔ بہت بھاگ دوڑ کرنے کے بعد جب ہم اسے رہا کرنے میں کامیاب ہوئے تو وہ وہ نہیں رہا تھا جو بہت باہمت اور پر عزم تھا۔ میرے سامنے جیل سے نکلا ہوا، ایک انتہائی دل شکستہ نوجوان کھڑا تھا جس کے سارے خواب جیل کی سلاخوں کے پیچھے دم توڑ چکے تھے۔‘‘

’’اوہ...!! بہت برا ہوا۔‘‘ یاسر نے افسوس کیا۔

’’ہمیں بڑا وقت لگا تھا اسے سنبھالنے اور اسے واپس زندگی کی طرف لانے میں.... لیکن وہ بھی تمہاری طرح اس سسٹم سے ایسا بے زار ہو گیا تھا کہ پھر یہاں نہیں رکا اور کسی نہ کس طرح امریکہ چلا گیا۔آج وہ وہاں ایک خوشحال زندگی گزار رہا ہے۔‘‘

عبدل نے بات مکمل کرنے کے بعد دوبارہ چائے کا کپ اٹھالیا جس کے اندر موجود چائے کی سطح پر بالائی کی پتلی سی تہہ بن گئی تھی۔

''مجھے بھی دکھ ہوا آپ کے بھائی کے بارے میں جان کر۔'' یاسر نے ہمدردی سے عبدل کو دیکھا تو وہ ہلکا سا مسکرایا۔

''خیر، چھوڑو ماضی کے قصوں کو، تم اپنے بارے میں بتاؤ، کیا کرتے ہو؟ کیا شوق ہیں؟ ''

عبدل نے پوچھا تو جواب میں یاسر چائے کی چسکیاں لیتا ہوا یاسر اسے اپنے بارے میں بتانے لگا۔ دو تین گھنٹے یہ ملاقات جاری رہی۔ پھر وہ اپنے گھر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ عبدل کے ساتھ وقت گزار کر دوپہر کے وقت یاسر اپنے گھر پہنچا تھا۔ بغیر بتائے پوری رات غائب رہنے پر ابا جان کو جتنا غصہ آیا تھا، س کے چہرے پر نیل اور ورم جبکہ چال میں لنگراہٹ دیکھ کر وہ فوراً پریشانی میں بدل گیا تھا لیکن عبدل یاسر کے ساتھ تھا۔

اسی نے انہیں تسلی دی تھی کہ رات کو ہلکا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ گھر والے پریشان ہو جاتے اسی لیے یاسر نے انہیں نہیں بتایا۔ امی جان نے یہ سنتے ہی فوراً بیٹے کا صدقہ دینے کے لیے پیسے نکالے تھے جبکہ شبنم شکرانے کے نفل پڑھنے جائے نماز پر کھڑی ہو گئی تھی۔

عمروں میں فرق کے باوجود یاسر اور عبدل میں اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ یاسر ہفتے میں دو دفعہ تو ضرور عبدل سے ملنے جاتا تھا۔ ذوالفقار کے بارے میں اسے بس محلے کے دوسرے لڑکوں سے پتا چل جاتا تھا اور پھر ایک دن ایک دوست کے ذریعے ہی اسے پتا چلا کہ ذوالفقار اور اس کے گھر والے دوسرے شہر منتقل ہو رہے ہیں۔

یاسر کو سن کر تھوڑا سا دکھ تو ہوا لیکن جلد ہی اس دکھ پر ذوالفقار کا سرد رویہ حاوی ہو گیا۔

''جاتے ہیں تو جائیں، میری بلا سے....!'' یاسر نے سائیکل پر صفائی والا کپڑا زور سے مارتے ہوئے دل میں کہا تھا۔

''یاسر! میں نے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

ایک شام یاسر عبدل سے ملنے اس کے گھر آیا تو دعا سلام کے بعد عبدل نے اسے کہا۔ یاسر اس کی بات سن کر چونکا۔

''جی، کہیں عبدل بھائی۔''

''تم نے مجھے ایک دفعہ کہا تھا کہ تم یہاں کے کرپٹ سسٹم سے تنگ ہو اور باہر کے کسی ملک جانا چاہتے ہو۔''

''جی عبدل بھائی...!! حالانکہ پہلے میں پاکستان کو چھوڑ کر جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن اب دل اٹھا گیا ہے یہاں سے۔ ہر دن یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ ابھی کہیں سے پولیس آئے گی اور مجھے دوبارہ کسی جھوٹے الزام میں جیل میں بند کر دے گی۔'' یاسر نے افسردگی سے کہا تھا۔

''یہ افسردگی چھوڑو بھئی اور میری بات غور سے لیکن تحمل سے سنو۔''

عبدل نے رک کر ایک نظر یاسر کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا، جیسے جانچنا چاہ رہا ہو کہ اس سے یہ بات کرنی چاہیے یا نہیں۔

''میں تم سے جو بات کرنے لگا ہوں، تم وعدہ کرو کہ اس کا کسی سے ذکر نہیں کرو گے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں عبدل بھائی، کہ کسی کو نہیں بتاؤں گا، لیکن بات کیا ہے؟'' یاسر حیران اور پُر تجسس ہوا۔

''میں تمہیں باہر بھجوا سکتا ہوں یاسر، بہت آسانی سے...!!'' عبدل مسکرایا۔ اس کی بات سن کر یاسر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''واقعی عبدل بھائی...؟ لل... لیکن کیسے...؟'' یاسر کے لہجے میں حیرت اور خوشی تھی۔

''میں جس جماعت سے منسلک ہوں، ان کا ایک طریقہ کار ہے۔ تمہیں بس ایک کاغذ پر دستخط کرنے ہوں گے اور بس....''

''بس...؟'' یاسر کو حیرت ہوئی۔ ''اور کچھ بھی نہیں؟ '

''ہاں، اور کچھ بھی نہیں! بس دستخط!'' عبدل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم نے بس ایک فارم پر دستخط کر کے اپنے آپ کو ہماری جماعت کا رکن بتانا ہے اور بس....!!''اور پھر یاسر کو اس دستخط کی نوعیت بتانے لگا۔

''اوہ..!!ایسا کیسے ہو سکتا ہے ؟ یہ تو.... یہ تو....!!'' یاسر کا ردِ عمل عبدل کی توقعات کے عین مطابق تھا۔

''تمہیں لگتا ہے میں تمہیں غلط مشورہ دے سکتا ہوں ؟''عبدل نے پوچھا تھا۔

''نہیں عبدل بھائی....''!!

''تو پھر جیسے میں کہہ رہا ہوں ویسے ہی کرو ناں !!''عبدل نے قطعیت سے کہا تھا۔وہ آہستہ آہستہ یاسر کو اپنی جماعت کے بارے میں بتانے لگا۔اسے معلوم تھا کہ کن باتوں کو پہلے سامنے رکھنا ہے اور کون سی باتوں کو بعد میں سامنے لانا ہے۔

آغاز اس نے بڑے محتاط انداز میں کیا تھا۔یاسر سادہ سا نوجوان تھا جس کے نزدیک اسلام بس مسجد میں نمازیں پڑھ آنے، طوطے کی طرح بغیر سمجھے قرآن مجید پڑھ لینے اور معاملات میں حرام اور حلال کا خیال رکھنا تھا، شبِ برات، شبِ معراج، ربیع الاول، ایسے تمام مذہبی تہواروں پر اس کا شوق دیدنی ہوتا تھا، لیکن ....اسلام بس اس کے دل کے اندر تک نہیں پہنچا تھا، اس نے اسلام کو سمجھا نہیں تھا۔یہی وجہ تھی کہ یاسر کو عبدل کی باتوں کی گہرائی کا اتنا احساس نہ تھا۔

جب عبدل نے اس سے نزول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے بات چیت کی تو عام کم فہم مسلمانوں کی طرح وہ بھی جی جی کرتے ہوئے سر ہلا کر رہ گیا تھا۔آگے کی تین ملاقاتوں میں عبدل نے اسے بہت تفصیل سے اپنی جماعت کے عقیدے کے بارے میں بتایا تھا اور کچھ ہی ہفتوں کے بعد وہ دن آگیا جب اس جماعت کی بیعت فارم پر دستخط کرتے ہوئے یاسر کا ہاتھ ایک دفعہ بھی نہیں کانپا۔کیونکہ اسے نہایت چالاکی سے یقین اور عقیدے کا کوئی اور ہی مطلب سمجھا دیا گیا تھا۔

''بھائی جان ! شکر ہے کہ آپ کے توسط سے میں اصل اسلام کی اصل روح کو جان گیا ہوں۔آج سے آپ میرے استاد ہیں۔میں آپ کو کیسے مخاطب کیا کروں ؟آغا جان کہہ کر یا پیر اور حضرت جی کہوں....؟''

تقریباً دو ماہ بعد اس نے عبدل سے بغل گیر ہوتے ہوئے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا تھا۔
''مربی...!! تم مجھے اپنا دوست کہہ سکتے ہو، مربی سمجھ سکتے ہو، جو تمھارا دل کرے۔'' جواب میں عبدل نے خوش ہوتے ہوئے اس کی پیٹھ تھپتھپائی تھی۔

....☆....

اپنے بستر پر سیدھا لیٹا ہوا بلال سر کے نیچے دونوں ہاتھوں کو رکھے، چھت کو گھور رہا تھا۔ اس کے ذہن میں مسلسل منگلا اور اصغر شاہ کی گفتگو چل رہی تھی لیکن وہ ان باتوں سے کوئی مطلب نکالنے سے قاصر تھا۔ بس کچھ تھا جو اس کو الجھا رہا تھا، کوئی ایسی بات تھی جو اسے چبھ رہی تھی۔

تنگ آ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''جی، آجائیں۔'' اس نے جواب دیا تو دروازہ کھول کر عبدالکریم صاحب اندر آ گئے۔

''اب کیسی طبیعت ہے شہزادے کی؟'' انہوں نے خوش مزاجی سے پوچھا تو بلال مسکرا دیا۔

''میں ٹھیک ہوں ابا جان...!!''

''ٹھیک تو وہ والا بلال تھا جو عمر کی طرف جانے کے لیے اپنی ماں اور مجھے بتا کر نکلا تھا۔ ابھی جو بلال وہاں سے واپس آیا ہے، وہ ٹھیک نہیں لگ رہا۔ کہیں کسی نے ہمارا بلال بدل تو نہیں دیا؟'' انہوں نے بلال کے برابر میں بیٹھتے ہوئے کہا تو بلال بھی ہنس پڑا۔

''یا پھر عمر سے جھگڑا کر آئے ہو..؟''

''نہیں ابا جان، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' بلال نے انہیں تسلی دینا چاہی۔

''اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر کیسی بات ہے بیٹے؟ میں نے تمہیں اتنا الجھا ہوا پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اگر کوئی پریشانی یا مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ، میں شاید تمہاری کوئی مدد کر پاؤں۔'' عبدالکریم صاحب نے نرمی سے کہا تو اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو مسلتا ہوا بلال کچھ لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔

''اگر میں ابا جان کو بتا دوں تو ان کی اصغر انکل سے دوستی ختم نہ ہو جائے۔''

''اور اگر نہ بتایا تو اصغر انکل کوئی غلطی نہ کر لیں۔'' اس کے ذہن میں بیک وقت مختلف سوچیں آ رہی

تھیں۔

"یا ابا جان مجھے عمر سے دوستی ختم کرنے کا نہ کہہ دیں۔"

"لیکن پتا تو چلنا چاہیے کہ منگلا بھائی اصغر انکل سے ایسی باتیں کیوں بتا رہے تھے۔"

"بتاؤ ناں بیٹے، کیا الجھن ہے..؟"اس کی سوچوں کے سلسلے کو عبدالکریم صاحب کی آواز نے توڑا تھا۔ بلال نے گہرا سانس لے کر ان کی جانب دیکھا اور الف سے ی تک پورا ماجرا بتا دیا۔ عبدالکریم صاحب حیرت، تعجب اور تشویش کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس کی بات سن رہے تھے۔

"مجھے ان کی باتیں بہت عجیب لگی تھیں، بہت زیادہ عجیب۔ بس اسی لیے میں سر درد کا بہانہ کر کے گھر آگیا۔"

پورا ماجرا سنانے کے بعد بلال نے کہا۔

"تم نے ٹھیک کیا بیٹے کہ گھر چلے آئے اور مجھے بتا کر تم نے بالکل ٹھیک کیا ہے۔"

عبدالکریم صاحب نے اس کے کندھے پر تھپکی دی تو بلال مسکرایا۔ ابا جان کو بتانے کے بعد اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے اوپر سے بوجھ ہٹ گیا ہے۔

"ابا جان...! کچھ دن پہلے سر سعید نے ہمیں کلاس میں ایسے لوگوں کے بارے میں بتایا تھا کہ یہ لوگ سب سے پہلے حضرت عیسیٰ کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں شک ڈالتے ہیں اور پھر ان لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"ہاں بیٹے! ان لوگوں کا یہی طریقہ کار ہوتا ہے۔"

عبدالکریم صاحب نے اثبات میں سر ہلایا:"لیکن مجھے تعجب ہے کہ منگلا ان لوگوں میں سے ہے... مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"مجھے بھی یقین نہیں آرہا ابا جان...!! منگلا بھائی تو کہیں سے بھی ان لوگوں جیسے نہیں لگتے۔ وہ ہمارے ساتھ ہی تو مسجد میں جا کر نمازیں پڑھتے ہیں۔"

بلال کے لہجے میں الجھن تھی۔

''بیٹے..! یہ لوگ ظاہر یہی کرتے ہیں جیسے یہ ہم میں سے ہیں، لیکن یہ اپنے اندر کا زہر موقع ملنے پر وہ باہر نکالتے ہیں۔''

''جیسے منگلا نے کیا....؟؟'' بلال نے فوراً کہا تھا۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ اس نے۔منگلا کے لیے۔ 'بھائی' کا لفظ استعمال نہیں کیا۔

''ہاں بیٹے...!! لیکن!'' عبدالکریم صاحب نے تنبیہی نظروں سے بلال کو دیکھا۔

''ابھی تم نے اس موضوع پر کسی سے بھی نہیں، عمر سے بھی نہیں بات کرنی۔ یہ بہت بڑی بات ہے اگر ہم منگلا کے بارے میں لوگوں کو بتائیں کہ وہ اس خاص جماعت میں سے ہے۔ میں خود اصغر شاہ کے سامنے اس سے بات کروں گا اس موضوع پر۔ ان شاءاللہ سچ سامنے آجائے گا۔''

''جی ابا جان...!! میں کسی سے بھی بات نہیں کروں گا۔'' بلال نے کہا تھا۔ اسی وقت باہر سے عمر نے آواز لگائی تھی۔ وہ بلال کو بلا رہا تھا۔

''جاؤ بھئی، میچ کھیلو جا کر۔ تمہارا دوست بلانے آگیا ہے''!

میاں عبدالکریم صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا تو بلال بھی ہنس پڑا۔ کمرے سے اس کے جانے کے بعد عبدالکریم صاحب سوچ میں پڑ گئے تھے۔

....☆....

فاطمہ کمرے سے جا چکی تھی لیکن اس کی باتیں ابھی بھی منال کے ذہن میں آرہی تھیں۔ اگرچہ اس نے فاطمہ کو تو چپ کروا دیا تھا لیکن اس کی باتوں نے منال کے دماغ میں الجھن سی ضرور پیدا کر دی تھی۔

''اگر فاطمہ سچ کہہ رہی ہوئی تو...؟ اگر الوینہ کا تعلق واقعی ایسے ویسے گروپ سے ہوا اور وہ مجھے پھنسانے کی کوشش کر رہی ہو تو..؟ لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو میرے ساتھ اتنی مخلص ہے۔''

منال کو الوینہ کے ساتھ گزارے سارے دن یاد آرہے تھے لیکن سبھی یادوں میں الوینہ کا روپ ایک بے حد خیال رکھنے والی سہیلی کا سا تھا۔ کبھی منال کے ساتھ کینٹین جا کر کچھ کھانا اور بل خود ادا کرنا، کبھی اس کے ڈیڈی نے کوئی مہنگا پھل بھیجنا تو الوینہ کا منال کا حصہ الگ رکھ لینا۔ اپنے گروپ میں کسی کو

اجازت نہ دینا کہ وہ منال کی ماں حالت کے بارے میں کچھ کہہ سکے۔ منال کی نظر دروازے کے پیچھے لٹکے ہوئے اپنے بیگ پر پڑی۔

''چلو ناں اب، دیر ہو رہی ہے۔ کینٹین میں رش لگ جائے گا۔''

کلاس ختم ہونے کے بعد سارے طلباء اپنی نشستوں سے اٹھ کر باہر کا رخ کر رہے تھے اور منال ابھی تک اپنے بیگ کے ساتھ لگی ہوئی تھی جس کی زپ بند ہونے میں نہیں آ رہی تھی، تب الوینہ نے بے صبری سے کہا تھا۔

''یہ زپ نہیں بند ہو رہی۔ تم جاؤ، میں آتی ہوں۔'' منال نے اسے کہتے ہوئے زپ کو ایک جھٹکے سے بند کرنے کی کوشش کی تو اچانک زپ ایک طرف سے باہر نکل آئی۔

''اوہ...!'' دکھ کے مارے بے ساختہ منال کے لبوں سے نکلا تھا۔ الوینہ نے اس کے بیگ کی ٹوٹی زپ کی طرف دیکھا۔

''ارے کوئی بات نہیں۔ اور لے لینا۔ بلکہ میں نے آج مارکیٹ جانا ہے، تم وہاں سے اپنی پسند کا شولڈر بیگ لے لینا۔'' اور منال کے انکار کرنے کے باوجود الوینہ اسے بازار لے گئی تھی اور کالے چمکیلے چمڑے سے بنا ہوا ایک بہت خوبصورت، سٹائلش اور مہنگا شولڈر بیگ اسے تحفتاً لے دیا تھا۔

''اور فاطمہ کہہ رہی ہے کہ ان سے کے پیچھے الوینہ کی کوئی غرض ہو گی مجھ سے! ہونہہ!!'' منال نے ذہن میں آئے سارے خدشات کو رد کیا اور ہاسٹل کے کچن میں چائے بنانے کی غرض سے ایک ساس پین اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، اسی وقت الوینہ نے بھی اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ منال کو اسے دیکھ کر شدید حیرت ہوئی تھی۔

....☆....

شام کو عبدالکریم صاحب اصغر شاہ کے ڈیرے پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''بھئی مرادے! آج تو کڑک سی چائے پلاؤ۔'' دروازہ مراد نے ہی کھولا تھا۔

''جی میاں جی، آج ڈبل کڑک چائے پلاؤں گا۔'' مراد نے اپنے مخصوص چہکتے ہوئے انداز میں کہا تھا۔ میاں عبدالکریم مسکراتے ہوئے ڈیرے کے صحن میں رکھے موڑھے پر بیٹھ گئے۔

''السلامُ علیکم میاں جی! آج کڑک چائے کا دل کیسے کر گیا؟'' اصغر شاہ نے اپنے دالان سے دروازہ عبور کر کے ان کی جانب آتے ہوئے کہا۔ ان کے ہاتھ میں تازہ اخبار تھا جو سکول میں اساتذہ کے ہاتھوں سے ہوتا ہوا اب قدرے باسی ہو چکا تھا۔

''بس ایسے ہی شاہ جی! کبھی کبھی اپنے کالج کا دور یاد کرنے کا دل چاہتا ہے جب میں اپنے دوستوں کے ساتھ رات کو چھپ کر بلوچی ہوٹل کے تھرے پر بیٹھ کر کڑک چائے پیتا تھا۔'' عبدالکریم صاحب نے ہنستے ہوئے کہا اور ان کے ہاتھ سے اخبار کا ادارتی صفحہ تھام لیا۔ ''منگلا نظر نہیں آرہا۔''

''ابھی آجائے گا وہ بھی۔ اپنے کمرے میں ہے۔ مراد! چائے چڑھا دو تو منگلا کو بلا لینا۔''

''جی شاہ جی....!!۔''

مراد نے دالان کے ایک جانب بنے کچے چولہے پر پتیلی رکھتے ہوئے کہا۔ لکڑی کے چولہے پر پکی، کوئلے کی سوندھی سی خوشبو لیے چائے میاں عبدالکریم صاحب اور اصغر شاہ، دونوں کو ہی مرغوب تھی اسی لیے خاص اس چائے کے لیے دونوں شام کو اکھٹے ہوتے تھے۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اخبار کا مطالعہ بھی ہو جاتا، حالاتِ حاضرہ پر بات چیت بھی ہو جاتی۔ ابھی بھی اصغر شاہ کے ہاتھ میں اخبار کا پہلا صفحہ اور میاں عبدالکریم کے ہاتھ میں ادارتی صفحہ تھا اور دونوں اس کے مطالعے میں مگن تھے جب منگلا ان کے پاس آیا۔

''السلامُ علیکم میاں جی... ! کیسے ہیں؟'' اس کے سلام کرنے پر دونوں نے ہی چونک کر اسے دیکھا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں منگلا، تم سناؤ۔'' میاں عبدالکریم صاحب نے اسے بغور دیکھا لیکن منگلا کو محسوس نہیں ہوا۔

''شکر ہے اللہ پاک کا۔ بڑا کرم ہے۔ شاہ جی کی صحبت ملی ہوئی ہے، اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔''

منگلا نے موڑھے پر بیٹھتے ہوئے کہا تو اصغر شاہ دھیما سا مسکرا کر دوبارہ اخبار کی جانب متوجہ ہو گئے۔ میاں عبدالکریم نے بھی بظاہر اپنی توجہ اخبار کی جانب مبذول کر لی۔ منگلا بھی ایک صفحہ اٹھا چکا تھا۔ کچھ ثانیے اسی خاموشی میں گزر گئے۔

"بے نظیر بڑی جی دار خاتون ہے۔" اچانک عبدالکریم صاحب نے اخبار پڑھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو تو، ایک اکیلی خاتون مردوں کی سیاست میں انہیں مشکل وقت دے رہی ہے۔"

اصغر شاہ نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اخبار سیاسی خبروں سے بھرے ہوئے تھے۔

"ذوالفقار علی بھٹو بھی کم نہیں تھا۔ میرا تو خیال ہے اس نے جو ختم نبوت کے سلسلے میں قومی اسمبلی کے اندر ایک تاریخ ساز بل پاس کروایا تھا۔ وہ اس کا واقعی ایک عظیم کارنامہ ہے۔ کیوں منگلا؟" میاں عبدالکریم نے منگلا کو بھی گفتگو میں شامل کیا تو وہ گڑبڑا گیا۔

"جی..؟؟..جج...جی... بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔" منگلا بوکھلا گیا تھا۔

"ارے ہاں، تم نے بتایا تھا کہ تمہارا تعلق تو چنیوٹ ضلع سے ہے۔ علاقہ کون سا ہے تمھارا..؟"

"جی وہ....ایک قصبہ ہے... میاں پور...بس وہی علاقہ ہے۔" منگلا نے جلدی سے ایک فرضی نام بتا دیا تھا۔

"اوہ..!! تو وہاں ایک ربوہ نام کا علاقہ ہے کوئی؟" عبدالکریم صاحب نے ایک بار پھر چوٹ کی، تو منگلا نے خود کو پُر اعتماد کیا اور بولا:

"جج..جی بالکل ہے"

"بلکہ وہ علاقہ تو اس جماعت کا گڑھ سمجھا جاتا ہے جس پر بھٹو صاحب نے پابندی لگوائی تھی۔" عبدالکریم صاحب اب پوری طرح منگلا کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔ منگلا سٹپٹا سا گیا لیکن اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اصغر شاہ بھی حیرت سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

"ارے! میرا بھی تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔" اصغر شاہ نے حیران ہوتے ہوئے کہا تو منگلا فوراً بولا:

"جی جی...، آپ درست کہتے ہیں۔ وہاں اس جماعت کی کافی آبادی ہے، لیکن ہم ان سے تھوڑا دور رہتے ہیں۔"

"اچھا... ویسے ان لوگوں سے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ معاف کرے، یہ بہت برا فتنہ ہے بھئی!" میاں عبدالکریم نے یہ کہتے ہوئے دوبارہ منگلا کی جانب غور سے دیکھا۔ وہ پُرسکون تھا، مگر عبدالکریم صاحب پر دل ہی دل میں پیچ وتاپ بھی کھارہاتھا، البتہ چہرے سے اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سر...!!" اس نے بہت جوش سے کہا تھا لیکن میاں عبدالکریم کا اس پر شک ابھی بھی برقرار تھا۔

اسی وقت مراد نے ٹرے ایک کے سامنے ایک تپائی پر رکھی۔ ٹرے میں تین پیالیوں میں موجود چائے سے کوئلے کی خوشبو اڑاتی ہوئی بھاپ نکل رہی تھی۔

"جیتے رہو مراد....! خوشبو ہی اتنی شان دار ہے تو چائے کیا غضب ڈھائے گی"!

اصغر شاہ نے اپنی پیالی اٹھاتے ہوئے تعریف کی تو مراد دانت نکال کر ہنستا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ سبھی کو علم تھا کہ وہ اپنی چائے کی بڑی سی پیالی کو لبالب بھر کر سکول کے گراؤنڈ میں لے جائے گا اور وہاں لڑکوں کا میچ دیکھتے ہوئے چائے سے لطف اندوز ہو گا۔

....☆....

الوینہ نے اپنے سر پر ایک سوتی ململ کا دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا جس میں اس کا چہرہ اور بھی زیادہ پیارا لگ رہا تھا۔

''اوہ تم...!'' اس کی نظر منال اور اس کے ہاتھ میں پکڑے ساس پین پر پڑی تو مسکرائی: ''آؤ، آج میرے کمرے میں چائے پیتے ہیں۔''

یہ پہلی دفعہ تھا جب الوینہ نے اسے اپنے کمرے میں آنے کی دعوت دی تھی۔ کچھ لمحے تو وہ ہچکچائی، پھر مسکراتے ہوئے اپنا ساس پین واپس کمرے میں رکھ کر الوینہ کے کمرے میں چلی گئی۔ الوینہ کا کمرہ کسی بھی صورت ہاسٹل کا کمرہ نہیں لگ رہا تھا۔ ایک دیوار پر کسی غیر ملکی گلوکار کا پوسٹر لگا ہوا تھا، تو دوسری طرف کمرے کے ایک کونے میں چھوٹا سا فریج تھا۔

''آپ کا کمرہ تو بہت خوب صورت ہے الوینہ!'' منال نے ستائشی لہجے میں کہا تو الوینہ ہنس پڑی۔ پھر ایک جانب چھوٹی سی میز پر رکھے تھرماس کی طرف بڑھی۔ منال ابھی تک سحر زدہ سی اس کے کمرے کو یکھے جا رہی تھی۔ الوینہ نے تھرماس سے چائے دو کپوں میں انڈیلی۔

''یہ لو، گرما گرم چائے..''!

اس نے ایک کپ منال کی طرف بڑھایا تو اس نے حیرت سے چائے کی جانب دیکھا جس سے ابھی بھی بھاپ اٹھ رہی تھی۔

''یہ چائے.....؟آپ نے کب بنائی؟ ' '

''میں نے نہیں بنائی۔''الوینہ اس کی بات سن کر ہنسی اور چائے کا کپ لے کر ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ گئی جس پر گدی بچھی ہوئی تھی۔

''آپا جی مجھے بنا کر دے دیتی ہیں۔ڈیڈی نے وارڈن سے اجازت لے ہوئی ہے۔ورنہ مجھے تو چائے تو کیا،انڈا تک اُبالنا نہیں آتا۔''

الوینہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور کپ کو ہونٹوں سے لگا لیا۔منال نے بھی اس کے برابر میں رکھی دوسری کرسی پر بیٹھ کر چائے کی چسکی لی۔چائے واقعی بہت زبردست تھی۔ورنہ وہ اپنی چائے بناتے ہوئے بہت ناپ تول کر دودھ ڈالتی تھی تاکہ اپنی محدود پاکٹ منی سے کچھ مہینے اچھا گزارا ہو جائے۔

''چائے بہت اچھی ہے۔''منال نے تعریف کی تو الوینہ مسکرائی۔کمرے میں کچھ ثانیے خاموشی رہی۔

''ایک بات پوچھوں؟ برا تو نہیں منائیں گی؟''منال نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں ہاں،پوچھو....''

''وہ....بس ایسے ہی میرے ذہن میں آرہا تھا کہ.....آپ کے ڈیڈی تو اتنے امیر ہیں،پھر آپ ہاسٹل میں کیوں رہتی ہیں؟میرا مطلب،آپ تو آرام سے ایک چھوٹا سا گھر لے کر اس میں رہ سکتی ہیں ناں،تو پھر ہاسٹل کیوں جہاں اتنی سہولیات بھی نہیں جتنی آپ کے اپنے گھر میں ہوں گی۔''

بہت عرصے سے ذہن میں کلبلاتا سوال آخر منال کے ہونٹوں پر آ ہی گیا تھا۔الوینہ نے گہری سانس لیتے ہوئے چائے کا کپ ایک جانب رکھا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگی:

''تمہارا سوال درست ہے۔اس میں برا ماننے والی کوئی بات نہیں ہے۔مجھ جیسی لڑکی کو اگر کوئی ہاسٹل میں رہتا ہوا دیکھے تو اسے واقعی بہت عجیب لگے۔''الوینہ کے اس جواب سے منال کو کچھ حوصلہ ہوا ورنہ وہ سخت ردِ عمل کی توقع کر رہی تھی۔الوینہ نے اپنے سر کے گرد لپٹا دوپٹہ کچھ ڈھیلا کیا تو اس کے سر کے کچھ بال ڈھلک کر ماتھے پر آ گئے۔

"تم صحیح کہہ رہی ہو۔ میرے ڈیڈی کے پاس اتنی دولت ہے کہ میں آرام سے یونی ورسٹی کے پاس ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر، یا ان فلیٹ خرید کر اس میں رہ سکتی ہوں لیکن میں اس تنہائی کا کیا کروں گی جو مجھے وہاں میسر ہو گی؟ وہ تنہائی جو بچپن سے میرے ساتھ چمٹی ہوئی تھی اور مجھے کسی صورت چھوڑتی نہیں تھی۔ اس ہاسٹل میں آکر مجھے احساس ہوتا ہے جیسے میں واقعی انسانوں کے درمیان رہ رہی ہوں۔" منال نے اس کے لہجے میں اترتی اداسی کو بہت واضح محسوس کیا۔

"میرے پیرنٹس میں جب Seperation ہوئی تو میں اس وقت تین سال کی تھی۔ تین سال کوئی عمر تو نہیں ہوتی کہ ماں کی ضرورت نہ ہو!" الوینہ کی آنکھوں میں نمی اتر رہی تھی۔ وہ ایک گھٹنے پر دوسرا گھٹنا ٹکائے، ایک ہاتھ سے آہستہ آہستہ دوسرے ہاتھ کی پشت کو رگڑتے ہوئے اداسی بھرے لہجے میں بتا رہی تھی:

"ڈیڈی سارا دن اپنے بزنس میں مصروف رہتے تھے۔ تمہیں پتا ہے منال، جن بچوں کے باپ بزنس میں ہوں، ان کی ماؤں کو کہیں نہیں جانا چاہیے۔ باپ تو ویسے بھی بزنس کی وجہ سے بچوں کے پاس نہیں ہوتے، جب مائیں بھی یوں چلی جاتی ہیں تو بچوں کا کیا بنتا ہے؟ ان کا سارا بچپن تو نوکروں کے رحم و کرم پر گزر جاتا ہے۔ بس میرا بچپن بھی اسی طرح گزر گیا، گڑیا کو سینے سے لگائے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہ شاید مجھے کہیں کسی کمرے میں کوئی شفیق صورت نظر آجائے۔ میں تو لوگوں کی توجہ کو ترسی ہوئی لڑکی ہوں منال" !

الوینہ نے پلکیں اٹھا کر منال کو دیکھا اور اداسی سے مسکرائی: "تو جب مجھے وہاں چنیوٹ کے نواح میں واقع محل نما لیکن خاموش گھر سے نکل کر یہاں چھوٹے سے لیکن آوازوں سے بھرپور ہاسٹل میں رہنے کا موقع ملا تو میں نے اسے ہاتھ سے جانے نہیں دیا.... تو بس یہ ہے یہاں رہنے کی وجہ!" اتنا کہہ کر الوینہ نے مسکراتے ہوئے ایک ہاتھ سے اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو صاف کیا اور دوسرے ہاتھ سے چائے کا کپ اٹھا لیا۔ چائے سے اب دھواں نہیں اٹھ رہا تھا۔

منال بھی دھیرے سے مسکرائی اور آگے جھک کر اپنا ایک ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''اب تو اداس نہیں ہوتی...؟''

''اب....؟'' الوینہ زور سے ہنسی: ''ہوتی ہوں بھئی، اب بھی اداس ہوتی ہوں کیونکہ ہاسٹل میں ایک ہی لڑکی مجھے پسند آئی اور وہ اتنی کم باتیں کرتی ہے کہ شاید پورے دن میں مشکل سے دس جملے بولتی ہو گی۔'' اس نے منال کی کم گوئی کی عادت پر چوٹ کی تو وہ جھینپ کر مسکرا دی۔

''بس، میری کہانی بھی کچھ ایسی ہی سمجھیں.....'' منال نے بھی اپنی زندگی کے بارے میں الوینہ کو بتانا شروع کیا۔ غربت کے حالات، ماں کی وفات، بھائیوں کا غیر ذمہ دار رویہ، بابا کی محنت بھری زندگی، اپنی پڑھائی.....الوینہ بھرپور توجہ سے اس کی زندگی کا احوال سن رہی تھی۔

....☆....

یاسر کی شامتِ اعمال کہ اس کی الماری میں ایک رسید ڈھونڈتے ہوئے اس کے ابا جان کو اس جماعت کے حوالے سے کچھ پمفلٹ اور کتابیں مل گئیں۔ پہلے تو وہ حیرت سے انہیں الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے، ان کی چھٹی حس کسی بڑی بات کی طرف اشارہ کر رہی تھی لیکن انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ جب تک یاسر سودا لے کر گھر واپس نہیں آ گیا، وہ بے چینی اور اضطراب سے باہر ٹہلتے رہے۔ شبنم اور امی جان نے پوچھنے کی کوشش کی تو انہیں بھی جھڑک دیا۔

جیسے ہی یاسر گھر میں داخل ہوا، ابا جان تیزی سے اس کی جانب لپکے۔

''یہ....یہ کیا ہے یاسر....؟''

ان کے ہاتھ میں موجود پمفلٹ کو دیکھ کر پہلے تو یاسر گھبرا گیا، پھر اپنے آپ پر قابو پاتا ہوا کہنے لگا:

''کچھ نہیں ابا جان..!! یہ تو بس ایسے ہی...''

''ایسے ہی کیا....؟'' ابا جان غصے میں تھے۔ شبنم اور امی جان ایک جانب پریشان سی کھڑی باپ بیٹے کی بحث دیکھ اور سن رہی تھیں۔

''کچھ نہیں ابا جان....!! یہ مجھے کسی نے دیے تھے بس پڑھنے کے لیے۔'' یاسر نے بات بنائی۔

''کیا ہو گیا جی؟ کچھ ہمیں بھی تو بتائیں۔'' امی جان نے مداخلت کرنے کی کوشش کی تھی۔

''یہ دیکھو.... تمہارا بیٹا کن لوگوں میں اٹھ بیٹھ رہا ہے۔''

ابا جان نے پمفلٹ امی جان کے ہاتھ میں پٹخے۔ پھر واپس یاسر کی طرف مڑے: ''تم نے کبھی اسلام کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا تو ایسی کون سی قیامت آگئی جو اس جماعت کے مواد کو پڑھ رہے ہو؟ کیوں اپنا ایمان داؤپر لگانے کو تیار بیٹھے ہو؟''

''کتابوں کو پڑھنے سے ایمان داؤپر نہیں لگ جاتا ابا جان...'' یاسر نے مضبوط لہجے میں دوبدو جواب دیا تھا۔ عبدل اسے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ جب گھر والوں کو یاسر کے اس فیصلے کا علم ہو گا تو گھر میں ایک طوفان کھڑا ہو گا۔

''تم کل کے جنے بچے! تمہیں کیا پتا یہ لوگ کن کن طریقوں سے وار کرتے ہیں!'' ابا جان سخت طیش مین تھے۔ شنبم بھی امی جان کی طرف کھسک گئی تھی اور اب وہ دونوں حیرت اور صدمے سے ان پمفلٹس کو دیکھ رہی تھیں جو ابا جان نے امی کے ہاتھ پر رکھے تھے۔

''وار کرتے ہیں یا سیدھے رستے کی طرف راہنمائی کرتے ہیں؟'' یاسر نے اچانک ایک فیصلہ کیا تھا۔

''کیا مطلب....؟'' ابا جان اس کا لہجہ اور جملہ سن کر چونکے۔

''ابا جان...!! مطلب یہ کہ آپ کیوں چاہتے ہیں کہ ہم بس لکیر کے فقیر بنے انہی باتوں کو سچ مانتے رہیں جو ہمارے آباؤاجداد نے کہہ دیں۔ ہمارے آباؤاجداد غلط بھی تو ہو سکتے ہیں۔''

''یاسر.....!!'' ابا جان غصے سے چلائے تھے۔

''میں نے اس جماعت کی باتوں کو پرکھا ہے اور ان کی سب باتوں نے مجھے قائل کیا ہے۔''

''یعنی......؟'' ابا جان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ اس طرح سینہ تان کر انہیں انہی کا بیٹا چیلنج کر رہا ہے۔

''تو یہ کہ میں نے اس جماعت کے عقیدے کو قبول کیا ہے اور اب میں ان میں سے ہوں۔'' یاسر نے آخر کار دھماکہ کر ہی دیا تھا۔ امی جان تو سینہ تھام کر رہ گئیں، شبنم گنگ ہو گئی جبکہ ابا جان.....ابا جان کو اس دفعہ اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا کہ انہوں نے درست سنا ہے۔

’’کیا کہا ہے تم نے.....؟‘‘

’’میں اس جماعت ایک ایک فرد ہوں اب..... جسے آپ لوگ کافر کہتے ہیں حالانکہ حقیقت میں ہم سیدھے راستے پر....‘‘

یاسر کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا۔ اباجان نے آگے بڑھ کر ایک زور کا تھپڑ اس کے گال پر رسید کیا تھا۔

’’تم..... ہوش میں تو ہو کہ کیا کہہ رہے ہو...؟‘‘ اباجان غصے اور دکھ میں چلائے تھے۔

’’مجھے علم ہے کہ میں نے کیا کہا ہے.....اور یہی سچ بھی ہے....‘‘ دائیں گال پر ہاتھ رکھے، بے خوف اور باغی لہجے میں یاسر نے اباجان کو جواب دیا تھا۔ اس کا جواب سنتے ہی اباجان قریب رکھی کرسی پر جیسے ڈھے سے گئے۔

’’اباجان....!‘‘ شبنم تیزی سے ان کی جانب بڑھی تھی۔

’’اسے کہو کہ اس گھر سے چلا جائے..... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا جائے۔‘‘ اباجان کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ یاسر کھڑا بس انہیں دیکھتا رہا۔

’’میں..... میں کسی ایسے انسان کو اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتا، جس کا ختمِ نبوت پر یقین نہ ہو۔ میں قربان اپنے نبی پر جن کے بعد کوئی اور نبی نہیں آنا۔‘‘ اتنا کہتے ہی اباجی بلک بلک کر رونا شروع ہو گئے۔ ان کی آنکھوں سے گرتے آنسو تیزی سے ان کی سفید داڑھی کو بھگوتے جا رہے تھے۔ اباجی کو یوں روتا دیکھ کر یاسر کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ لیکن اسی وقت شبنم غصے میں اس کی جانب بڑھی اور اس کے سینے پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے اسے دھکے دینے لگی۔

’’تم نے اباجی کی بات سنی نہیں...؟ دفع ہو جاؤ یہاں سے...‘‘ وہ غصے سے چلائی تھیں۔ یاسر نے ایک نظر امی جان کو دیکھا جو اپنی آنکھوں پر دوپٹہ رکھے سسک رہی تھیں، پھر اباجان پر ایک نظر ڈالی جو ’صلی اللہ علیہ وسلم‘ کا ورد کرتے ہوئے روتے جا رہے تھے، اور گھر سے نکل آیا۔

....☆....

’’سر! مجھے لگ رہا ہے میاں عبدالکریم کو مجھ پر شک ہو گیا ہے۔‘‘

اگلے دن چھٹی تھی اس لیے منگلا بازار جانے کا بہانہ بنا کر سر عظمت کے پاس ان کے ادارے میں پہنچ گیا تھا اور اب ان کے دفتر میں بیٹھا پچھلے دن کی روداد سنا رہا تھا۔ سر عظمت غور سے اس کی روداد سنتے ہوئے اسے حوصلہ دے رہے تھے۔

''لیکن سر! مجھ سے بہت غلط کام ہو گیا۔'' منگلا نے اضطراب میں دونوں ہاتھ ملے:

''مجھے میاں عبدالکریم کے سامنے جماعت سے لاتعلقی کا اظہار کرنا تھا، اس لیے مجھے جماعت کو برا بھلا کہنا پڑا سر..!.. میں بہت شرمندہ ہوں۔''

منگلا ذہنی طور پر اتنا بے چین تھا کہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ کر سسک اٹھا۔ سر عظمت نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

''تمہارا یہ احساسِ شرمندگی ہی کافی ہے! ہمارے اکابر کو علم تھا کہ ہمیں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، اس لیے انہوں نے اس بات کی اجازت دی تھی کہ اگر مصلحت کے تحت جماعت کو برا کہنا پڑے تو بلا جھجک کہہ دو۔ ایک جھوٹ کے پیچھے اگر بہت سے لوگ جماعت میں شامل ہو سکتے ہیں تو پھر جھوٹ کو جھوٹ نہیں سمجھا جاتا۔ تم دل سے تو جماعت کے وفادار ہی ہو ناں؟''

''جی بالکل..!! میں اپنی زندگی قربان کر سکتا ہوں اپنی جماعت پر...!'' منگلا کے دل کو سر عظمت کی بات سن کر ڈھارس ملی تھی۔ وہ جذباتی لہجے میں بولا۔

''شاباش! بس یہی جذبہ چاہیے ہمیں...! تمہیں بس بس اصغر شاہ کو میاں عبدالکریم کے ساتھ اکیلا نہیں چھوڑنا اور اپنی محنت تیز کر دو تا کہ اگر وہ اصغر شاہ کو اپنی باتوں میں لا کر ہماری جماعت کے خلاف کرنے کی کوشش نہ کر سکیں۔''

''ٹھیک ہے سر..!! میں ایسا ہی کروں گا۔'' منگلا نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

....☆....

اس شام کی تفصیلی گفتگو سے منال اور الوینہ کی دوستی اور زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ فاطمہ نے دوبارہ کبھی اس موضوع پر منال سے بات نہیں کی تھی۔ کچھ روز بعد ایک جمعہ کی سہ پہر کو منال نے اپنے کپڑے

دھو کر الگنی پر ڈالے ہی تھے کہ آپا جی نے آکر بتایا:

"منال، تمہارے والد تم سے ملنے آئے ہیں۔ مہمان خانے میں بیٹھے ہیں۔"

اتنا سنتے ہی منال خوشی سے مہمان خانے کی جانب بھاگی۔ سامنے صوفے پر بابا اسحاق بیٹھے ہوئے تھے۔

"السلام علیکم بابا...!" منال نے قریب جا کر انہیں سلام کیا تو انہوں نے کھڑے ہو کر پیار سے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"وعلیکم السلام دھیئے.... وعلیکم السلام! کیسی ہے میری دھی رانی...؟" ان کے لہجے میں منال کے لیے بے پناہ محبت اور شفقت تھی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں بابا۔ تُو کیسا ہے؟ اماں اور بھائی کیسے ہیں؟ اور وہ کالو کیسا ہے؟ ابھی بھی تُو اسے شکر کی ڈلی کھلاتا ہے کیا؟" منال کا بس نہیں چل رہا تھا ایک ہی سانس میں دو مہینے کی رپورٹ لے لے!

"ہاں ہاں، سب چنگا ہے بھئی۔" بابا اسحاق اس کی بے تابی دیکھ کر مسکرایا: "کالو بھی ٹھیک ہے۔ گڑ کی ڈلی کھلاؤں تو وہ سڑک پر بھاگتا نہیں، اڑتا ہے! تُو اپنی سنا! سب ٹھیک ہے یہاں؟ پیسے کی تنگی تو نہیں ہوئی؟ مجھے تیری بڑی فکر لگی ہوئی تھی دھیئے۔"

"جی بابا، سب ٹھیک ہے۔ تُو پریشان نہ ہوا کر۔ یہاں سب کچھ وقت پر ملتا ہے۔" منال نے بابا کو تسلی دی۔

"اچھا!!! چل، فریہ تو بڑی چنگی گل اے"!

"اچھا بابا، تُو بیٹھ، میں تیرے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" منال کو اچانک خیال آیا تو اٹھتے ہوئے بولی۔

"ہاں چاء تو میں ضرور پیوں گا۔ بڑے دن ہو گئے ہیں تیرے ہاتھ کی بنی چاء پیے ہوئے۔"

بابا اسحاق نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا تو منال مسکراتے ہوئے تیزی سے باورچی خانے کی جانب بڑھ گئی۔

"منال! تمہارے باباآئے ہوئے ہیں کیا؟" وہ ابلتے ہوئے پانی میں چائے کی پتی ڈال رہی تھی جب الوینہ نے آکر پوچھا۔ منال نے پلٹ کر دیکھا۔

"ہاں، ابھی کچھ دیر پہلے ہی آئے ہیں۔ میں انہی کے لیے چائے بنارہی ہوں۔"

منال کے لہجے میں خوشی تھی۔الوینہ اس کی جانب بڑھی۔اس کے ہاتھ میں بسکٹ کاایک پیکٹ تھا۔

"توکیاتم اپنے باباکوخالی چائے پلاؤگی؟شرم تونہیں آئے گی تمہیں"!!

الوینہ نے مصنوعی خفگی سے کہااور باورچی خانے کے کاونٹر پر بسکٹ کاپیکٹ رکھ دیا۔

"اگرمیرے پاس کچھ اور ہوتاتومیں وہ بھی تمہیں دے دیتی کہ اپنے باباکوپیش کرولیکن ابھی میرے پاس یہ بسکٹ ہی ہیں۔"

الوینہ کے لہجے میں خلوص تھا۔ منال نے مشکور نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

"بہت شکریہ الوینہ...! مجھے بھی اچھانہیں لگ رہاتھالیکن میری سمجھ میں نہیں آرہاتھا کہ میں چائے کے ساتھ باباکے سامنے کیارکھوں۔ وہ پہلی دفعہ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ تمہارا بہت شکریہ تم نے میری مشکل حل کردی۔"

منال نے مسکراتے ہوئے کہاتوالوینہ اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر ہنس پڑی۔ پھراچانک ایک خیال آنے پر چونک گئی۔

"بلکہ، میں بھی تمہارے ڈیڈی..... سوری، ابا سے مل لوں؟ سوری، ڈیڈی کہنے کی اتنی عادت ہے کہ اب یہی ورڈز بان پر ہوتاہے۔" الوینہ نے خوش ہوتے ہوئے کہالیکن منال سٹپٹاسی گئی۔اس کی نظروں کے سامنے اباجی اوران کاحلیہ آگیاتھا۔

"تم نے شہروز کے ساتھ باہر جاناہے ناں، توتمہیں دیر نہ ہو جائے۔ اباجی سے پھر کسی دن مل لینا۔" منال نے اسے روکناچاہا۔

"مجھے تمہارے اباسے ملنے کون سادوسرے شہر جاناہے، ڈرائنگ روم میں ہی توبیٹھے ہیں! آجاؤ۔"

الوینہ نے جلدی سے الماری سے ایک پلیٹ نکال کر بسکٹ اس میں کھول کر رکھے اور منال کاانتظار

کرنے لگی۔

''لیکن وہ.....''

''جلدی کرو ناں...!'' الوینہ کے بے صبرے پن پر منال نے نہ چاہتے ہوئے بھی چائے ایک کپ میں چھانی اور ایک ٹرے میں کپ رکھ کر منال کے قریب آ گئی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی بسکٹ کی پلیٹ ٹرے پر رکھی اور ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ اسے منال کے ابا جی سے ملنے کا بہت اشتیاق ہو رہا تھا۔

''ہیلو انکل...!'' منال کے ساتھ الوینہ کو دیکھتے ہی ابا جی ہڑ بڑا کر کھڑے ہوئے تھے۔ پہلی دفعہ کسی امیر شہری لڑکی نے عزت کے ساتھ انہیں مخاطب کیا تھا۔ اس سے پہلے تو گاؤں کی ہی جانی پہچانی لڑکیاں ہوتی تھیں جو ان کے سامنے ہی اسٹاپو اور گڑیا کی شادی جیسے کھیل کھیلتے ہوئے بڑی ہوئی تھیں۔

اس کے ہیلو کہنے پر ابا کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس کو کس طرح جواب دیں۔ کیا اس کے سلکی ملائم بالوں پر اپنا کھردرا ہاتھ پھیریں یا پھر کیا؟ ابا جی نے الجھ کر منال کو دیکھا۔ وہ سست قدموں سے چلتی ہوئی آگے آئی اور ٹرے تپائی پر رکھ دی۔ ابا جی نے جیسے تیسے سلام کا جواب الوینہ کے انداز میں ہی دینے کی کوشش کی اور اسی کوشش میں گھبراہٹ کے مارے ان کے چہرے پر عجیب سی کیفیت نمودار ہو گئی۔

''ابا جی! یہ میری سہیلی ہے، الوینہ....''!!

منال نے الوینہ کا تعارف کروایا جو اب دلچسپی سے ابا جی کے حلیے کو دیکھ رہی تھی۔ پرانے لیکن صاف ستھرے کریم رنگ کی شلوار اور قمیض میں ملبوس سفید بالوں اور تھوڑی بڑھی ہوئی شیو میں کہیں کہیں کالے بال تھے۔ کندھے پر حسبِ معمول سفید رنگ کا ایک صافہ تھا جس سے بابا اسحاق ماتھے کو پونچھ رہے تھے۔ چہرے کی رنگت گہری گندمی تھی اور بالائی ہونٹ کے کنارے کے بالکل پاس ایک موٹا سا مسّا تھا۔ الوینہ نے منال کی جانب دیکھا۔ اس کے بھی بالائی ہونٹ کے دائیں کنارے کے بالکل پاس ویسا ہی مسّا تھا۔ الوینہ مسکرا دی۔

''اچھا اچھا، جیتی رہ بیٹی...!'' منال کے بتانے پر ابا جی نے گھبراتے ہوئے ایک دفعہ پھر صافے سے

اپنا ما تھا صاف کیا تھا۔ الوینہ کو ان کی بے چینی نظر آگئی تھی، تبھی وہ مسکرا کر بولی:

''آپ دونوں باتیں کریں، مجھے کچھ کام ہے۔''

اتنا کہہ کر الوینہ وہاں سے جیسے ہی نکلی، باپ بیٹی دونوں نے اپنے رکے ہوئے سانس خارج کیے تھے۔

''دھیے! یہ کیسی سہیلی بنالی ہے تُونے؟'' ابا جی نے حیرت سے پوچھا۔ وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔

''ابا...! اس کے حلیے پر نہ جا، بہت اچھی سہیلی ہے میری۔ بہت امیر ہے لیکن امیروں جیسی نہیں ہے۔ دل کی بہت اچھی ہے۔''

منال نے الوینہ کی تعریف کی تھی۔

''فیروی دھیے.... ! اپنے جیسے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہی ٹھیک رہتا اے۔''

ابا جی کے لہجے میں تجربہ بول رہا تھا۔ منال نے بات بدلنے کی غرض سے چائے کی ٹرے ان کے آگے کی۔

''یہ کیسے بِسکُٹ ہیں؟'' بابا نے پہلی دفعہ ایسے بسکٹ دیکھے تھے جن میں دو بسکٹ کے درمیان چاکلیٹ کی باریک سی تہہ تھی۔ منال ہنس پڑی۔

''بہت مزے کے ہیں بابا۔ تُو کھا کر تو دیکھ۔'' منال نے بسکٹ کی پلیٹ بابا کے نزدیک کی تو اس نے اشتیاق سے ایک بسکٹ اٹھا کر پہلے اسے غور سے دیکھا، پھر جھجھکتے ہوئے اس کا ایک کونا کترا۔ زبان پر موجود مساموں نے دماغ کو پسندیدگی کا عندیہ دیا تو بابا نے رغبت سے بسکٹ کا ایک بڑا ٹکڑا منہ میں ڈال لیا۔

''بڑے چنگے بِسکُٹ ہیں! ممتاز کریانے کی دکان پر تو بس پاپے ہی ملتے ہیں، یا دیسی میٹھی ٹکیاں...... بڑے شہروں کے تو بِسکُٹ وی وکھرے ہیں!'' بابا نے ایک کھا کر دوسرا بسکٹ اٹھایا اور عادت سے مجبور ہو کر بسکٹ کو اپنے چائے کے کپ میں ڈبوتے ہوئے اس کا مزا لیا۔ منال بابا کی معصومیت دیکھ کر مسکرا رہی تھی.... ''یہ بسکٹ الوینہ نے ہی دیے تھے کہ تجھے خالی چا نہ پلاؤں۔''

منال نے بھی ایک بسکٹ اٹھا لیا۔

"جیتی رہ! جیتی رہ! تُو وی اس کا خیال رکھیں، ٹھیک ہے ناں؟ تیری یہ سہیلی مجھے اچھی لگی ہے۔ ایسی سہیلیاں بڑی مشکل سے ملتی ہیں۔"

باباجی نے ایک بڑی سی سڑکی کے ساتھ چائے کا گھونٹ بھرا اور پھر تیسرا بسکٹ اٹھالیا۔

....☆....

"کیا ہوا شاہ جی! الجھے ہوئے سے لگ رہے ہیں۔" میاں عبدالکریم شام کی نشست جمانے اصغر شاہ کے ڈیرے پر موجود تھے۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اس لیے آج محفل اندر کمرے میں لگی ہوئی تھی۔ کمرے کے وسط میں بچھے قالین پر بلال، علی اور عمر بیٹھے لوڈو کھیل رہے تھے اور حسبِ معمول و حسبِ توقع لڑ رہے تھے جب عبدالکریم صاحب نے اصغر شاہ کے ذہنی انتشار کو محسوس کیا۔

"ہوں.... نہیں... سب ٹھیک ہے۔" ان کے پکارنے پر اصغر شاہ اپنی سوچوں سے نکلے: "مراد چائے نہیں لایا ابھی تک"!

"کچھ تو ہے ورنہ آپ پہلے کبھی اتنے خاموش اور ذہنی طور پر غیر حاضر کبھی نہیں لگے۔" عبدالکریم صاحب نے اصرار کیا۔

"ارے نہیں کریم میاں! بس سکول کے معاملات ذہن کو تھکا دیتے ہیں۔"

اصغر شاہ نے بات بدلنے کی کوشش کی۔ اسی وقت مراد ایک ٹرے پکڑے ہوئے اندر داخل ہوا۔

"لیں شاہ جی! گرما گرم پکوڑے کھائیں آج۔"

ٹرے میں ایک بڑا سا تھال بھاپ نکلتے، خستہ اور چٹپٹے پکوڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ ساتھ میں ایک کھلی پیالی میں دہی والی ہری چٹنی بھی تھی۔

"پکوڑے...!!" تینوں بچے بھی پکوڑوں کا نام سن کر اپنا کھیل چھوڑ کر اٹھ آئے۔

"آج تو کمال کر دیا مراد! جیتے رہو بھئی"!

میاں عبدالکریم نے ایک پکوڑے کو چٹنی میں ڈبو کر اپنے منہ میں ڈالا اور بے اختیار کہہ اٹھے۔ ان کے بے ساختہ پن پر مراد کی بتیسی نکل آئی۔

''آپ بھی لیں ناں شاہ جی!''اس نے پکوڑوں کی پلیٹ اصغر شاہ کی جانب بڑھائی۔

''آج اتنا دل نہیں ہے مرادے۔بس ذہنی طور پر بہت تھکاوٹ ہے۔''انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔

''لو جی، مرادے کے پکوڑوں کو کون انکار کرتا ہے شاہ جی؟؟''مراد حیران ہوا۔

''مرادے کے پکوڑے!!!''عمر نے شرارت سے کہا تو تینوں بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔مراد نے نہ سمجھی کے عالم میں ان تینوں کو دیکھا۔اصغر شاہ اور عبدالکریم صاحب بھی بچوں کی شرارت پر مسکرا رہے تھے۔

''مراد بھائی! آلو اور پیاز کے پکوڑے تو کھائے ہیں، یہ مرادے کے پکوڑے کیسے ہوتے ہیں؟''
بلال نے بھی مراد کو چھیڑا تو بات اس کی سمجھ میں آگئی۔وہ بھی ہنس پڑا۔

''میرا مطلب تھا مرادے کے ہاتھ کے بنے پکوڑے''!

''نہیں مرادے! آج تو بس چائے پلوا دو۔''اصغر شاہ نے کرسی کی پشت پر سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں موند کر کنپٹیوں کو انگلیوں سے دبایا۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟''عبدالکریم صاحب نے فکر مندی ظاہر کی۔بچے جلدی جلدی پکوڑے کھانے میں مگن تھے۔

''جی جی.... بس ایسے ہی کسل مندی سی ہے۔''

اصغر شاہ کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ذہنی انتشار کی اصل وجہ نہ بتا کر اپنے لیے کتنی بڑی مصیبت مول لے رہے ہیں!

''آپ نے مرادے کی چائے پینی ہے اور آپ کی ساری تھکاوٹ دور ہو جانی ہے۔''مرادے نے چہکتے ہوئے کہا تھا۔

''مرادے کی چائے!!''تینوں بچے ایک بار پھر ہنستے ہنستے بے حال ہونے لگے۔مراد کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا اپنا سر کھجا کر رہ گیا۔پھر ایک پلیٹ میں کچھ پکوڑے ڈال کر بچوں کے ساتھ قالین پر بیٹھ کر ان کی لوڈو

گیم دیکھنے لگا۔ اصغر شاہ ابھی بھی کچھ خاموش سے تھے۔

"شاہ جی! ایک بات کہوں؟" میاں صاحب نے آہستہ آواز میں انہیں کہا تھا۔ اصغر شاہ نے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

"مجھے... یہ منگلا کچھ ٹھیک نہیں لگتا۔" بچے اپنے کھیل میں مگن تھے اس لیے ان کا دھیان ان دونوں کی جانب نہیں تھا۔ اصغر شاہ ان کی بات پر چونک اٹھے۔

"کیا مطلب....؟"

"مطلب یہ کہ.... بس آپ تھوڑا سا محتاط رہیں اس سے۔" میاں صاحب نے رازدارانہ لہجے میں کہا تھا۔

"میں آپ کی بات کو سمجھ نہیں پا رہا میاں صاحب.... کھل کر بات کریں، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

اصغر شاہ کے لہجے میں الجھن تھی۔ وہ ان پر یہ بات ظاہر نہیں کرنا چاہ رہے تھے کہ منگلا ان سے ایک حساس موضوع پر بات کر چکا ہے۔ انہوں نے اس سے رازداری کا عدہ کیا تھا اور انہیں اب اس وعدے کا پاس رکھنا تھا۔

"میں خود بھی نہیں جانتا کہ میں آپ کو یہ کیوں کہہ رہا ہوں... لیکن بس میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ یہ بندہ ٹھیک نہیں ہے۔" میاں صاحب انہیں بس تنا ہی کہہ سکے تھے کہ اسی وقت منگلا وہاں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ پھلوں کا شاپر اور دوسرے ہاتھ میں جلیبیوں کا ایک ڈبہ تھا۔

"مجھے پکوڑوں کی خوشبو گلی کے آخر سے ہی آ گئی تھی، تبھی جلدی جلدی چلتا ہوا آ گیا کہ میرے آنے تک مراد نے پکوڑے ہڑپ نہ کر لیے ہوں۔"

اس نے خوش دلی سے کہا تو بچے اور مراد ہنس پڑا۔

"نہیں باؤ جی! میں کوئی جن ہوں جو سارے پکوڑے اکیلے ہی کھا جاؤں گا۔"

"مراد بھائی تو دیو ہیں، جنوں کے بھی پیو ہیں!" عمر نے فوراً کہا تو محفل کشتِ زعفراں بن گئی۔

....☆....

''کیسی ہے اے میری دھی...؟'' بابا اسحاق شام ڈھلے واپس گھر پہنچے تو اماں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''فسٹ کلاس ہے وہ! تُو خامخا میں خود بھی پریشان ہوتی ہے اور مجھے بھی کرتی ہے!'' بابا اسحاق نے چارپائی پر بیٹھ کر کھیڑی سے اپنے پاؤں کو آزاد کرتے ہوئے جواب دیا: ''بس اب کھانا لا دے۔ اُدھر بس بِسکُٹ ہی کھائے تھے اور چاء پی تھی۔''

''نہ، تے فریدے نے تجھے روٹی نہیں کھلائی؟ ویسے تو بڑا سگا بنتا ہے۔'' اماں نے تنک کر جواب دیا تھا۔ فرید دکان دار جس سے بابا اسحاق کی پہلی مرتبہ یونیورسٹی کے باہر ملاقات ہوئی تھی۔ اس کا گھر وہاں سے قریب ہی تھا۔

''اس کی دکان بند تھی۔ ویسے بھی موسم خراب ہونے والا تھا، اس لیے سیدھا گھر ای آگیا۔'' بابا اسحاق وہیں چارپائی پر دراز ہوتے ہوئے بولے۔

''آہو، ہوا تو بالکل بند اے۔ ایسے لگ ریا جیسے آندھی آنے ہی والی ہے۔'' اماں نے چولہے پر لکڑی جلانے کی کوشش کی۔ چارپائی پر لیٹا بابا اسحاق تھکاوٹ کی وجہ سے جلد ہی اونگھنے لگا تھا۔

''میں کہیا، اٹھ جاؤ ہن، روٹی کھالو۔'' اماں کی آواز پر اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور انگڑائی لے کر جسم کو سیدھا کرتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

''ہاسٹل میں منال کی ایک سہیلی نے بھی مینوں سلام کیا تھا۔''

روٹی کھاتے ہوئے بابا اسحاق نے اماں کو الوینہ کے بارے میں سب کچھ تفصیل سے بتایا تو اماں حیران رہ گئیں۔

''ہاہائے..! منال کی اُس کڑی سے کیسے دوستی ہوگئی؟'

''پتا نہیں......بس ہوگئی۔'' بابا اسحاق نے کندھے اچکائے۔

''امیروں کے ساتھ ہم غریبوں کا کیا جوڑ بھلا......؟ منال آئے تو اس سے پوچھوں گی، بلکہ کہوں گی کہ اس سے دور ہی رہے، تو چنگا اے۔ ایسے لوگوں کا کچھ پتا نہیں چلدا، بڑے تیکھے ہوتے ہیں یہ امیر لوگ......ہم غریب ماڑے لوگ تو ان کے آگے کیڑے مکوڑے ہی ہیں۔''

اماں کے لہجے میں منال کے لیے فکر اور امیروں کے لیے ناراضی تھی۔

”ٹھیک کہہ رہی اے تُو، لیکن وہ کُڑی ایسی نہیں لگی میں وں..... نخرے والی نہیں اے......“

ابانے کہا تھا۔ پھر بھی اماں کو تسلی نہیں ہوئی اس لیے سونے سے پہلے تک نہ جانے منہ ہی منہ میں کیا بڑبڑاتی رہیں۔

....☆....

کچھ دن عبدل کے گھر گزارنے کے بعد یاسر نے دوبارہ اپنے گھر والوں سے رابطے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے گھر والوں نے اس سے ملنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اُدھر سوگ کا سا سماں تھا۔ انھیں یاسر سے اس طرح کی امید ہرگز نہیں تھی۔

”اگر تم خاتم النبین حضرت محمد ﷺ کا کلمہ نہیں پڑھتے اور تجدید ایمان نہیں کرتے، تو ہمارا تم سے کوئی تعلق نہیں، لیکن اگر تم گمراہی کے راستے سے دوبارہ اپنے عقیدہ پر واپس آگئے تو ہم تمھیں قبول کرلیں گے۔“

ابا جان نے واضح اور دوٹوک الفاظ میں اسے کہا تھا۔ وہ ان کی بات مان لیتا لیکن اس کے پیچھے عبدل کھڑا تھا جو مسلسل اس کو یہ باور کروا رہا تھا کہ یاسر درست ہے اور اس کے گھر والے غلط ہیں۔ نتیجہ یہ کہ یاسر نے بھی اپنے گھر والوں کو چھوڑ دیا۔

”تم کب تک امریکہ یا کینیڈا جانا چاہتے ہو؟“ ایک دن عبدل نے پوچھا تھا۔

”عبدل بھائی..!! اب جبکہ مجھے ہدایت مل چکی ہے تو جب میں اپنے ارد گرد کے لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ کس طرح اصل اسلام کو غلط سمجھتے ہوئے بس اپنے بڑے بزرگوں کے دین کو ہی درست اسلام مان کر زندگیاں گزار رہے ہیں تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس طرح آپ کے توسط سے مجھے ہدایت ملی ہے، اسی طرح میرے توسط سے کسی اور کو بھی ہدایت ملے۔“

”ارے! یہ تو بہت اچھی بات کہی تم نے! شاباش...!“ عبدل نے خوشی سے کہا: ”ہماری جماعت کو تم جیسے بہادر اور مخلص جوانوں کی بے حد ضرورت ہے۔ مجھے تمہارے خیالات جان کر اتنی خوشی ہو رہی

ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

"میں کچھ عرصہ آپ کی طرح جماعت کی خدمت میں لگانا چاہتا ہوں عبدل بھائی.... میں اپنے گھر والوں کو ہدایت کی طرف تو نہ لا سکا، لیکن میری کوششوں سے اگر کوئی ایک بھی اس جماعت میں شامل ہو گیا تو میں سمجھوں گا کہ میرا بیڑا پار لگ گیا۔"

یاسر جذباتی ہوا تھا۔ عبدل نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

پھر جماعت کے مشورے سے یاسر کو بڑے اساتذہ کے پاس بھیج دیا گیا، جہاں اسے مزید تعلیم اور تربیت حاصل کرنا تھی۔ اس کئی کتابوں کا مطالعہ بھی کروایا گیا۔ ساتھ اس کے لیے اچھا معاشی پیکج اور رات کے وقت اپنے تئیں جنت اور حوروں جیسا ماحول بھی پیش کیا گیا۔ اسے بیرون ممالک سفر بھی کروائے گئے۔

راول پنڈی میں 'عظمت کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ' کے بانی عظمت مرزا کے پاس بھجوادیا گیا جو کمپیوٹر کورسز کے پسِ پردہ اپنی جماعت کے تبلیغی کاموں میں مگن تھے۔ ان سے مصافحہ کرتے ہوئے یاسر نے انہیں بتایا تھا،

"میں یاسر ہوں، یاسر منگلا۔"

....☆....

"عبدالکریم صاحب...!" وہ ابھی لیکچر لے کر کلاس روم سے نکلے ہی تھے کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ابتسام صاحب مسکراتے ہوئے تیز تیز قدموں کے ساتھ ان کی جانب آرہے تھے۔

"مبارک ہو عبدالکریم صاحب"!

"کس چیز کی مبارک باد..؟"عبدالکریم صاحب نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی برطانوی ایمبیسی سے فون آیا تھا۔آپ کا ویزہ لگ گیا ہے"!

ابتسام صاحب نے ان سے مصافحہ کرتے ہوئے گرم جوشی سے بتایا تھا۔ میاں عبدالکریم صاحب بھی خوش گوار حیرت کے ساتھ مسکرادیے۔

"واقعی؟؟میں نے تو سنا تھا کہ ویزے وغیرہ میں کافی ہفتے لگ جاتے ہیں۔"

"بس قسمت کی بات ہے!"ابتسام صاحب ان کے ساتھ سٹاف روم کی جانب چلنے لگے:"آپ کا ویزہ تو ویسے بھی جلدی ہی لگنا تھا۔اتنے اہم موضوع پر پی ایچ ڈی کرنے جارہے ہیں"!

"شکر ہے اللہ کا..."میاں عبدالکریم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"بس میں ذرا کچھ کام کر کے آتا ہوں،آپ عطاء سے مٹھائی تو منگوا کر رکھیں۔ پھر میں ساری تفصیلات

بھی بتاتا ہوں۔"

ابتسام صاحب نے ان کا بازو تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا۔

"جی ضرور... کیوں نہیں بھلا!" میاں عبدالکریم صاحب مسکراتے ہوئے سٹاف روم کی جانب بڑھ گئے۔ان کے عقب میں کھڑے ابتسام صاحب معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ مسکرائے تھے۔

شام کو عبدالکریم صاحب اصغر شاہ کے ڈیرے پر آئے تو وہاں بھی مٹھائی لائے تھے۔ان کی آمد سے پہلے ہی وہاں اصغر شاہ اور منگلا بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔انہیں گیٹ سے اندر آتا دیکھ کر منگلا یک دم م خاموش ہو گیا تھا۔

"لیں شاہ جی! منہ میٹھا کریں!" میاں صاحب نے ایک گلاب جامن ڈبے سے نکال کر ان کی جانب بڑھایا۔

"کس خوشی میں جناب؟" اصغر شاہ نے گلاب جامن پکڑتے ہوئے پوچھا۔منگلا بھی سوالیہ انداز میں ان کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"میرا ویزہ لگ گیا ہے برطانیہ کا۔ان شاءاللہ اگلے ہفتے روانگی ہے۔"

میاں عبدالکریم نے ایک موڑھے پر بیٹھتے ہوئے کہا اور مٹھائی کا ڈبہ منگلا کی جانب بڑھا دیا۔

"وہی پی ایچ ڈی کے سلسلے میں..؟" اصغر شاہ نے انگلیوں پر لگے گلاب جامن کے شیرے کو چاٹتے ہوئے پوچھا تھا۔

"جی شاہ جی۔پی ایچ ڈی کے سلسلے میں ہی۔"

"بہت مبارک ہو.... وہاں جا کر برف کے مزے لیجیے گا!" اصغر شاہ نے ہنستے ہوئے کہا تو میاں صاحب اور منگلا بھی ہنس پڑے۔

"مٹھائی آئی ہے!" بچے بھی مٹھائی کا سن کر وہیں چلے آئے تھے۔

"بیٹا، ایک ایک گلاب جامن اٹھا لو، پھر باقی ڈبہ امی کے پاس لے جاؤ۔" اصغر شاہ نے بچوں کا بے صبرا پن دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں شاہ جی، کھانے دیں انہیں۔ بلکہ مراد اور شوکت کو بھی دیں۔ میں بھابھی کے لیے الگ ایک ڈبہ لایا ہوں۔" میاں صاحب نے کہا تھا۔ اس شام کی چائے کی نشست کا موضوع میاں عبدالکریم کے اس نئے سفر کے گرد ہی گھومتا رہا۔

....☆....

قومی تعطیل کے سلسلے میں اگلے دن یونی ورسٹی میں چھٹی تھی۔ الوینہ اور منال اس چھٹی کو ایک ساتھ انجوائے کرنا چاہتی تھیں، منصوبہ یہ تھا کہ لاہور ہی میں کسی ثقافتی جگہ کی سیر کر کے اس دن کو خوش گوار بنالیا جائے۔ مگر پھر اچانک الوینہ کو یاد آیا کہ اسے گھر سے کچھ ضروری چیزیں منگوانا تھیں، تو کیوں نہ خود بھی گھر کا چکر لگا ہی لیا جائے۔ یہ خیال ذہن سے آتے ہی اس نے منال سے بات کی:

"یار منال...! تم کیا ہاسٹل میں بور ہوتی رہو گی۔ میرے ساتھ میرے گھر چلو۔" الوینہ نے منال کو پیشکش کی، تو وہ حیران رہ گئی۔

"تمہارے گھر...پر کیوں..؟"

"ہاں، اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟" الوینہ نے کندھے اچکائے:

"ڈیڈی دوپہر کو گاڑی بھیج دیں گے۔ ہم ڈیڑھ دو گھنٹوں میں گھر پہنچ جائیں گے اور کل شام کو واپسی ہو جائے گی۔"

"لل.....لیکن......." منال ہچکچائی۔ اگرچہ وہ الوینہ کے ساتھ قدرے بے تکلف ہو گئی تھی لیکن اس کے گھر جانا ایک بالکل الگ بات تھی:

"میں سوچ رہی تھی کہ یہاں رہتے ہوئے اسائنمنٹ کر لوں گی۔"

"اوہو! تو میرے گھر میں رہتے ہوئے بھی تو اسائنمنٹ کی جا سکتی ہے۔ بلکہ مجھے بھی کروا دینا!" الوینہ ہنسی:

"یہاں ہاسٹل میں تو مجھ سے پڑھائی نہیں ہو پاتی۔ وہاں تمہاری وجہ سے شاید کچھ پڑھ ہی لوں۔"

"لل.....لیکن....." منال نے کچھ کہنا چاہا لیکن الوینہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ کہنے سے روک

دیا۔

''بس میں نے کہہ دیا ناں کہ تم میرے ساتھ میرے گھر جا رہی ہو۔ مزید کوئی بات نہیں۔''

منال لب کاٹ کر رہ گئی۔ کبھی کبھی الوینہ کی یہ رعب جمانے اور اپنی بات منوانے والی عادت منال کو مشکل میں ڈال دیتی تھی۔ فاطمہ پہلے ہی اپنے شہر کے لیے رختِ سفر باندھ چکی تھی۔ اُس کو بھی بالآخر الوینہ کے گھر جانا ہی بہتر لگا ورنہ پورے ہاسٹل میں گنی چنی لڑکیوں کے بیچ وہ بوکھلائی سی پھرتی۔

دوپہر کے وقت گاڑی آئی تو وہ سب لوگ اس میں سوار ہو گئے۔ منال کی حیرت ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ یونی ورسٹی سے واپسی پر الوینہ کی مہنگی گاڑی میں بیٹھ کر چنیوٹ جانا ہی ایک انوکھا تجربہ تھا۔ ایسی گاڑی میں بیٹھنے کا تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اس کی سوچ کی حد تو تانگے سے شروع ہوتی تھی اور زیادہ سے زیادہ کوچ پر ختم ہو جاتی تھی۔ لیکن اس جدید گاڑی جس کی نشستیں بادامی رنگ کے چمڑے کی بنی ہوئی تھیں، اور جس کے اندر کیسٹ پلئیر پر دھیمی آواز میں گانے چل رہے تھے، اور جسے ایک سفید وردی پہنے ہوئے ڈرائیور چلا رہا تھا، ایسی گاڑی میں بیٹھنے کا منال نے بھلا کب سوچا تھا!

اسے اچانک ہی اپنا آپ اس پورے ماحول میں مِس فِٹ سا لگنے لگا تھا۔ آج تک الوینہ نے اس کی لباس اور حلیے کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ پینٹ شرٹ یا ہاف سلیو اور کبھی کبھی سلیو لیس شرٹ میں ملبوس الوینہ کے برابر میں چادر میں لپٹی ہوئی منال چل رہی ہوتی تھی لیکن اس بات پر الوینہ کو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

''ہر ایک کی مرضی ہے، وہ جیسا لباس پہننا چاہے، جو کرنا چاہے۔'' الوینہ کی سوچ بہت مثبت تھی۔

الوینہ کی کوٹھی منال کے لیے ایک عالی شان محل سے کم نہیں تھی۔ وہ تو بس ایک ایک شے کو دیکھ رہی تھی اور حیران ہوتی جا رہی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے وہ جھجھک سی گئی۔ یہ محل رقبے میں بھی بہت بڑا تھا۔

''آؤ ناں، رک کیوں گئی؟'' اس کے آگے چلتی الوینہ نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

''وہ..... میں جوتے یہیں اتار دوں؟ فرش گندا نہ ہو جائے۔'' اس نے متذبذب انداز میں پوچھا تو

الوینہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''فرش گندا ہوگا تو صاف بھی ہو جائے گا۔ اس میں کیا بڑی بات ہے؟'' الوینہ نے بے فکری سے کہہ کر قدم آگے بڑھا دیے تو منال بھی لیے دیے انداز میں آگے بڑھ گئی۔ ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوتے ہی ایک چالیس پینتالیس سالہ ملازمہ نے الوینہ کو سلام کیا تھا۔

''سلام چھوٹی بی....''

''ڈیڈی گھر پر ہیں کیا؟'' الوینہ نے بیگ ٹی وی لاؤنج میں رکھے صوفے پر پھینکتے ہوئے پوچھا اور خود بھی اس پر ڈھے سی گئی۔

''وہ جی اپنے اسٹڈی روم میں ہیں۔''

''اوہ.... میں سمجھی تھی وہ ہمیشہ کی طرح اپنے کسی ٹور پر نکلے ہوں گے۔'' الوینہ نے منہ بنایا۔

''جی، وہ کہہ رہے تھے کہ آپ آجائیں تو پھر مل کر کھانا کھائیں گے۔ میں انور سے کہہ کر کھانا لگواتی ہوں۔''

ملازمہ نے منال کو کچھ عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے الوینہ کو بتایا اور باورچی خانے میں چلی گئی۔ منال دوسرے صوفے کے کونے پر کچھ تکلف کے ساتھ بیٹھی، رشک بھری نظروں سے ٹی وی لاؤنج کا جائزہ لے رہی تھی۔ کمرے کے ایک جانب بڑی سی آبنوسی الماری تھی جس کے وسط میں بہت بڑا سی ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ ٹی وی کے دونوں جانب الماری میں خوب صورت اور نازک سے ڈیکوریشن پیس تھے جبکہ ٹی وی کے اوپر الماری شیلف میں کتابیں سجی ہوئی تھیں۔

ٹی وی کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک نرم ملائم سا غالیچہ بچھا ہوا تھا جس کے اوپر ایک شیشے کا بنا ہوا میز تھا۔ کمرے کی دیواروں پر مختلف پینٹنگز لگی ہوئی تھیں۔ کمرے کی ایک ایک شے سے امارت جھلک رہی تھی۔ منال کو اپنا آپ اچانک بہت حقیر سا محسوس ہوا۔

''مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' اس نے بوجھل دل کے ساتھ سوچا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟ اور ایزی ہو کر بیٹھو ناں۔ اپنا ہی گھر سمجھو... میں زرا باتھ روم سے ہو کر آئی۔''

الوینہ نے کھڑے ہوتے ہوئے انگڑائی لی تو منال بجھے دل کے ساتھ ہلکا سا مسکرائی۔الوینہ اپنے کمرے میں جاچکی تھی۔

''کاش میں اسے اپنا گھر سمجھ پاتی۔''

اس کے تصور میں کچی مٹی اور گوبر سے لیپا ہوا اس کا اپنا گھر آگیا تھا جس میں کل تین کمرے تھے۔ ایک میں دونوں بھائی سوتے تھے، ایک میں ابا اور اماں اور ایک میں وہ۔ اُسی کے کمرے کو بطور سٹور روم استعمال کیا جاتا تھا۔

کمرے کے ایک طرف دو بڑی پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں جن کو اماں کے ہاتھ کی بنی بیل بوٹے والی چادروں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ کمرے کے دوسری طرف دیوار پر چھجا سا بنا ہوا تھا جس پر اماں ہی کے جہیز کے پیتل اور سٹیل کے بڑے بڑے سے تھال رکھے ہوئے تھے۔

''اماں! یہ اتنے بڑے سے تھال کس لیے ہیں؟ ہمارے گھر تو کبھی اتنا زیادہ کھانا بنتا ہی نہیں ہے کہ تھال میں نکالنا پڑے۔ نہ ہی اتنا آٹا ہوتا ہے کہ اس پرات میں گوندھنا پڑے۔'' اسے یاد آیا، گرمیوں کی ایک دوپہر میں دس سالہ منال نے چارپائی پر اپنی اماں کے برابر میں لیٹتے ہوئے پوچھا تھا۔ نظریں انہی برتنوں پر تھیں۔

''یہ برتن میرے میکے کے ہیں۔'' اماں نے لاڈ سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا:

''تو کیا ہوا اگر اتنا کھانا نہیں بنتا۔ رب سوہنے کا شکر ہے کہ روز پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیتا ہے۔ ہور کیا چاہیے؟....اور خیری ہوئے، تُو جب سیانی ہو جائے گی اور تیرے ویاہ کا دن ہووے گا تو انہی برتنوں میں تیرے مہمانوں کو کھانا دیں گے۔''

اماں نے اسے اپنی آغوش میں بھینچا تو اس نے شرما کر اماں کے بازو میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔

اور اب وہ اِس گھر میں بیٹھی تھی جسے الوینہ کہہ رہی تھی کہ وہ اپنا ہی گھر سمجھے!

''اہم.....'' اچانک کسی کے گلا کھنکھارنے کی آواز پر منال کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹا۔ اس کے صوفے کے بالکل پاس الوینہ کے ڈیڈی کھڑے اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

''السلامُ علیکم......''

''وعلیکم السلام.... اچھا تو تم ہو منال! الوینہ تمھاری بہت تعریف کرتی رہتی ہے۔آج ملاقات بھی ہو گئی۔''

وہ اس کے بالکل سامنے صوفے کی پشت پر ایک بازو دراز کر کے ریلیکس انداز میں بیٹھ گئے۔

''جج.....جی......'' منال نے نروس ہوتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''ارے! تم بیٹھو ناں... کھڑی کیوں ہو؟''

انہوں نے دوستانہ انداز میں کہا تو منال جھجکتے ہوئے دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی، بلکہ بیٹھی کہاں، صوفے کے کنارے پر ٹک سی گئی۔

''مجھے بہت خوشی ہے کہ الوینہ تمھیں اپنے ساتھ یہاں لے آئی۔ واقعی ہاسٹل میں چھٹی کا دن گزارنا میرے نزدیک تو بے وقوفی ہے۔ تم آئی ہو تو اسی بہانے ہمارے گھر میں بھی کوئی رونق ہو جائے گی ورنہ تو اس گھر میں خاموشی ہی چھائی رہتی ہے۔''

''جی.....'' منال سے ابھی بھی کوئی خاص جواب نہ بن پایا۔

''ارے! تم بس یہی ایک لفظ بولتی ہو کیا؟'' ڈیڈی نے دلچسپی سے پوچھا۔

''جی....؟'' منال نے چونک کر پوچھا، پھر خود ہی کھسیا کر ہنس پڑی۔اس کی ہچکچاہٹ میں کچھ کمی آئی تھی۔اسی وقت الوینہ بھی آگئی۔

''آپ گھر پر کیسے ڈیڈی..؟ کہیں مصروفیت نہیں ہے آپ کی....؟''

الوینہ نے ڈھکے چھپے الفاظ میں انہیں کچھ جتانے کی کوشش کی جسے نظر انداز کرتے ہوئے ڈیڈی مسکرائے۔

''نہیں پرنسس! آج میری کوئی مصروفیت نہیں ہے۔اس لیے تم دونوں کو بہت اچھا وقت دے پاؤں گا۔ لیکن تمہاری یہ سہیلی 'جی' کے سوا کچھ کہتی ہی نہیں ہے حالانکہ تم نے بتایا تھا کہ یہ بہت پیاری باتیں کرتی ہے۔''

ڈیڈی نے مسکراتے ہوئے منال کی طرف دیکھا۔الوینہ نے ڈیڈی کو گھور کر دیکھا۔اس نے منال کے بارے یوں کب ڈیڈی کو یہ سب بتایا تھا؟

''کھانا کھائیں؟ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔''الوینہ نے موضوع بدلنے کی کوشش کی تھی۔

''ہاں ہاں، شیور..!''ڈیڈی نے اٹھتے ہوئے کہا اور بڑے باوقار انداز میں اپنے بازو کے اشارے سے منال کو ڈائننگ روم کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

کھانے کی میز پر بہترین نفیس برتنوں میں ذائقہ دار کھانا چُنا ہوا تھا۔خانساماں نے طرح طرح کے مزے دار پکوان تیار کر رکھے تھے۔گویا یہ دعوتِ شیراز تھی۔سب لوگوں کو کھانے کی میز کے گرد آچکے تھے۔

''الوینہ !اپنی سہیلی کی پلیٹ میں بھی کھانا نکال دو، وہ شاید جھجھک رہی ہے۔''

منال نے اپنی پلیٹ میں مروت کی وجہ سے بہت تھوڑی سی بریانی نکالی تھی جسے ڈیڈی نے نوٹ کر لیا۔

''نن...... نہیں نہیں.....ابھی کے لیے اتنا کافی ہے۔''منال نے فوراً کہا لیکن تب تک الوینہ اس کی پلیٹ پکڑ چکی تھی اور جب اس نے پلیٹ واپس منال کے سامنے رکھی تو وہ میز پر موجود سبھی نعمتوں سے لدی ہوئی تھی۔

''الوینہ....!''منال نے دبے دبے لہجے میں احتجاج کیا جسے کوئی بھی خاطر میں نہ لایا۔مجبوراً منال کو تکلف کو ایک جانب رکھ کر کھانا شروع کرنا پڑا۔

کھانے کے دوران ماحول بہت خوش گوار تھا۔الوینہ کے ڈیڈی کافی خوش مزاج اور حاضر جواب تھے، لیکن نہ جانے کیوں الوینہ خاموش خاموش سی تھی۔رفتہ رفتہ منال کی جھجھک ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے چور نظروں سے الوینہ کے ڈیڈی کی جانب دیکھا۔کالے سیاہ بالوں کو، جن میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی، خوب صورت انداز میں سیٹ کیا ہوا تھا جس سے ان کے مردانہ وقار میں بہت اضافہ ہو رہا تھا۔آدھی آستین والی شرٹ اور قدرے موٹے ہونٹوں پر گھنی مونچھوں کے ساتھ وہ کہیں سے بھی الوینہ

کے ڈیڈی نہیں لگ رہے تھے۔ منال نے گھبرا کر نظریں ان سے ہٹالی تھیں۔

اس رات دونوں سہیلیوں نے جی بھر کر باتیں کیں۔ الوینہ نے منال کو اپنا مکمل گھر وزٹ کروایا ۔ کہیں سنگ مر مر لگا ہوا تھا تو کہیں گھاس والے خوبصورت لان تھے۔ کہیں چڑیا، طوطے اور موروں کے پنجرے تھے تو کہیں شیشے کے جاروں میں پانی کے اندر تیرتی ہوئی رنگ برنگی مچھلیاں...!

الوینہ کے گھر خوبصورت لمحے اور بہترین وقت گزار کر وہ دونوں چنیوٹ سے اگلے دن واپس لاہور آگئیں۔آتے ہی انھوں نے ہاسٹل میں اپنا سامان رکھا اور ایک کپ چائے پینے کے لیے پھر سے الوینہ کے کمرے میں بیٹھ گئیں۔

”تمہار بہت بہت شکریہ الوینہ....! میرے لیے یہ دو دن بہت یادگار تھے۔“

اپنے کمروں کی طرف بڑھتے ہوئے منال نے الوینہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”مجھے خود بہت مزا آیا۔ ورنہ میں گھر جا کر بور ہی ہوتی رہتی تھی۔ کل بہت عرصے بعد گھر میں ایک اچھی محفل جمی تھی۔“

اس کا جواب سن کر منال مسکرادی۔

رات کو سوتے ہوئے منال خواب میں الوینہ کی کوٹھی میں ہی گھوم رہی تھی۔

....☆....

گھر میں اداسی سی چھائی ہوئی تھی۔ عبدالکریم صاحب کو تیاری کے لیے بس کچھ ہی دن ملے تھے۔ انہی دنوں میں انہوں نے تیاری کرکے برطانیہ کے لیے نکلنا تھا۔ ثریا بیگم اور بلال ان کی تیاری میں ہاتھ توبٹا رہے تھے لیکن بار بار اداسی کا اظہار بھی کر رہے تھے۔

”مجھے معلوم ہے تم دونوں بہت اداس ہو رہے ہو۔ لیکن مجھے بھی تو دیکھو، وہاں تو میرے پاس مزے دار سی بریانی پکا کر کھلانے والی بیگم ہوں گی، نہ ہی میرے ساتھ اپنے سکول کے قصے سنانے والا بیٹا! میں تو آپ دونوں سے بھی زیادہ اداس ہوں گا۔“

رات کے کھانے پر سبھی خاموشی اور بے دلی سے کھانا کھا رہے تھے جب میاں عبدالکریم نے بات

شروع کی۔

''وہاں آپ اپنی پی ایچ ڈی میں اتنے مصروف ہوں گے، ہمیں یاد کرنے کی فرصت ہی نہیں ملے گی آپ کو۔''

بلال نے بجھے لہجے میں کہا اور سر جھکا کر پلیٹ میں موجود چاولوں کو بلاوجہ اِدھر اُدھر ہلانے لگا۔

''اور یہاں آپ اپنی پڑھائی اور میچوں میں اتنے مصروف ہوں گے کہ آپ کو احساس بھی نہیں ہو گا اور سال گزر جائے گا۔ ان شاءاللہ۔''

عبدالکریم صاحب نے اسے بہلانا چاہا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ ان شاءاللہ ہمیں آپ کے پیچھے کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔'' ثریا بیگم نے شوہر کو تسلی دینا چاہی۔

''اور اگر ہوئی بھی تو میرا جوان بیٹا میرے ساتھ ہو گا ناں، وہ خود ہی نمٹ لے گا۔'' ان کی بات سن کر بلال دھیما سا مسکرایا تھا۔

مقررہ تاریخ کو میاں عبدالکریم برطانیہ جا چکے تھے، ایک ایسے وقت میں جب ان کے عزیز ترین دوست کو ان کی اشد ضرورت تھی لیکن اس بات سے وہ دونوں دوست بے خبر تھے۔

....☆....

''السلام علیکم شاہ جی...!'' گلی کا موڑ مڑتے ہی منگلا کی اصغر شاہ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ سورج اپنی کرنیں سمیت کر دوسرے جہان کو روشن کرنے جا چکا تھا اور اپنی جگہ اندھیری رات کو دے دی تھی جو آہستہ آہستہ اپنی کالی چادر پھیلاتی جا رہی تھی۔

''وعلیکم السلام منگلا۔ کہاں سے آ رہے ہو؟'' شاہ جی احمد کریانے کی دکان سے کچھ سامان کی خریداری کر کے نکلے تھے۔ ان کے ہاتھ میں سامان والا شاپر تھا۔

''بس ایسے ہی ہوا خوری کے لیے نکلا تھا۔ آج موسم بہت اچھا ہے، لیکن آپ خود کیوں سودا لینے آئے؟ مجھے یا مراد کو کہہ دیا ہوتا۔''

اس نے ان کے ہاتھ سے شاپر لینا چاہا۔

''کوئی بات نہیں یار..!! تھوڑا سا سامان ہے۔ ویسے بھی میرا خود گھر میں دل گھبرا رہا تھا۔'' اصغر شاہ نے جواب دیا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ گلیوں میں لگی لائٹس روشن ہو چکی تھیں۔ منگلا ان کی خاموشی کو نوٹ کر رہا تھا۔

''آپ مجھ سے ناراض ہیں شاہ جی؟'' منگلا نے خاموشی کو کسی طرح ختم کرنا چاہا۔

''نہیں، تم سے کیوں ناراض ہونا ہے... بس ایسے ہی میاں صاحب کے جانے سے دل اداس سا ہے۔'' اصغر شاہ نے جواب دیا تھا۔

''مجھے لگا میری اُس دن کی باتوں کی وجہ سے آپ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں...''

''نہیں یار...!! ناراض نہیں ہوں، الجھا ہوا ہوں۔'' اصغر شاہ نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔

'تمہاری بات پر غور کروں تو وہ دل کو لگتی ہے لیکن پھر اس یقین کا کیا کروں جو حضرت عیسیٰ کے بارے میں شروع سے ہی مجھے ہے کہ وہ زندہ اٹھائے گئے ہیں اور دوبارہ زمین پر آئیں گے؟''

منگلا ان کی بات سن کر زیر لب مسکرایا۔

''شاہ جی...!'' اس نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔ گلی کے ایک جانب خالی پلاٹ تھا اور دوسری جانب گھروں کی ایک قطار، جن کے باہر سرسبز کیاریاں تھیں۔ کچھ مکینوں نے اپنی کیاریوں میں خوشنما پھولوں کے پودے لگائے ہوئے تھے اور کچھ نے موسمی سبزیاں:

''مجھے اندازہ تھا کہ میری اس بات سے آپ تذبذب کا شکار ہو جائیں گے، لیکن دیکھیں، جب پیغمبروں نے اللہ کا پیغام اپنی قوم تک پہنچایا تو سبھی لوگوں نے یہی کہا تھا کہ ہم اپنے باپ دادا کے طریقوں کو چھوڑ کر آپ کی بات مان لیں؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن جنہوں نے ان پیغمبروں کی بات مانی تھی، وہ نجات پا گئے اور جنہوں نے نہیں مانی، وہ عذاب کا شکار ہوئے۔ ایسا ہی ہے ناں؟''

''ہاں... ایسا ہی ہے۔'' اصغر شاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو ہمیں وہ ماننا چاہیے جو قرآن میں درج ہے یا وہ جو ہمارے مولوی لوگ کہتے ہیں؟ قرآن کا رتبہ اور

علم بڑا ہے ناں۔"

سامنے سے ایک سائیکل سوار آرہا تھا۔ منگلا خاموش ہو گیا۔ دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔

"السلامُ علیکم شاہ جی..! ٹھیک ہیں؟" سائیکل سوار نے ان کے قریب سے گزرتے ہوئے سلام کرنے کے ساتھ ساتھ حال احوال بھی پوچھ لیا تھا۔

"وعلیکم السلام... شکر ہے اللہ کا۔"

اصغر شاہ نے ہاتھ ہلا کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے جانے کے بعد منگلا نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا جہاں ٹوٹا تھا۔

"شاہ جی! اچھا یہ بتائیں کہ عیسائی حضرت کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

"کہ وہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور خود بھی خدا ہیں۔" اصغر شاہ نے جواب دیا۔

"اب آپ سوچیں شاہ جی! اگر اگر کسی عیسائی کو کہا جائے کہ وہ ہستی جسے تم لوگ خدا کا بیٹا اور معبود کہتے ہو، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام، وہ وہاں آسمان پر قربِ قیامت تک زندہ ہیں، وہ نہ کھانے کے محتاج ہیں نہ پینے کے۔ جبکہ ہمارے نبی ﷺ فوت ہو چکے ہیں، تو اس کا کیا نتیجہ ہو گا؟ عیسائی تو اپنے عقیدے پر اور زیادہ پختہ ہو جائیں گے کہ وہ حق پر ہیں اور ہم مسلمان بھٹکے ہوئے ہیں۔"

"صحیح کہہ رہے ہو..." اصغر شاہ نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"لیکن اس کے برعکس، اگر ہم عیسائیوں پر یہ ثابت کر دیں کہ جسے وہ لوگ اپنا معبود اور خدا کا بیٹا سمجھتے ہیں، وہ دوسرے انبیاء کی طرح اسی زمین میں دفن ہیں اور ان کی قبر موجود ہے، تو؟ ساری عیسائیت کی بنیاد ہی ہل کر رہ جائے گی..."!!

"اوہ...!!" اصغر شاہ کے ماتھے پر شکنوں کا جال سا بُن گیا تھا: "یہ اچھا نکتہ لائے ہو تم۔"

"جی شاہ جی...!" منگلا کے لہجے میں جوش تھا: "میرے پاس اس موضوع پر کچھ تحقیقی کتابیں موجود ہیں۔ مجھے یقین ہے انہیں پڑھنے کے بعد آپ کو اپنے سارے سوالوں کے جوابات مل جائیں گے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو مجھے ضرور وہ کتابیں دو، میں پڑھنا چاہتا ہوں۔"

اصغر شاہ کے لہجے میں اشتیاق تھا۔ جلد ہی وہ منگلا کے کمرے میں کھڑے تھے۔ منگلا نے اپنی قمیض کی جیب سے ایک چابی نکال کر اپنے ٹرنک پر لگائی۔ ایک 'کلک' کی آواز سے ٹرنک کا تالہ کھلا تھا۔ اس نے ٹرنک کھول کر اپنے تہہ شدہ کپڑوں کو ایک جانب سے اٹھایا اور ان کے نیچے چھپے کچھ چھوٹے کتابچے، تحریری مواد اور ایک دو بڑی کتابیں نکل آئیں۔

"شاہ جی، یہ لیں۔" اس نے وہ پمفلٹ اصغر شاہ کی جانب بڑھائے تھے۔ انہوں نے کو پکڑتے ہوئے ان پر ایک نظر ڈالی۔ ان پر 'براہین احمدیہ' لکھا ہوا تھا۔ مصنف کا نام جلی حروف میں درج تھا۔

" یہ نام تو جانا پہچانا سا لگ رہا ہے، شاید اخباروں اور کہیں رسائل میں پڑھنے کا اتفاق ہوا ہو... ہاں مجھے یاد آگیا۔" یہ کہتے ہوئے اصغر شاہ چونکے تھے۔

"جی شاہ جی...." منگلا نے سنبھل سنبھل کر کہا۔ وہ ان کے چہرے کے تاثرات کو نوٹ کر رہا تھا جہاں ہلکی سی ناگواری کے آثار تھے۔

"یعنی.... تمھارا واقعی اس مصنف یا اس کی جماعت سے کوئی تعلق ہے۔" ان کے لہجے میں حیرت ہی حیرت تھی۔

"میری بات سنیں شاہ جی پلیز....." منگلا نے فوراً ملتجائی انداز میں ان کے سامنے ہاتھ جوڑے:

" مجھے ان کے سامنے جھوٹ بولنا پڑا تھا ورنہ میری جان کو خطرہ ہو جاتا یا مجھے یہاں سے نکال یا جاتا۔ میں نے اسی لیے آپ سے بات کی تھی کیونکہ آپ جوش سے نہیں، ہوش سے کام لیتے ہیں۔ آپ پلیز تحمل سے میری بات سن لیں۔"

اصغر شاہ کا رویہ ایک دم تبدیل ہو چکا تھا۔ انھیں منگلا پہ غصہ تو تھا، مگر وہ تحمل سے کام لے رہے تھے۔

"لیکن تم نے تو ان کے سامنے مرزا پر لعنت بھیجی تھی۔"

"وہ... میں مجبور تھا شاہ جی..!! میں اگر ایسا نہ کرتا تو کیا کرتا؟.. کیوں کہ عبدالکریم صاحب مزاجاً سخت طبیعت کے ہیں، آپ تو جانتے ہی ہیں۔ ہر انسان آپ کی طرح ٹھنڈے دماغ کا تو نہیں ہوتا ناں۔" منگلا

جذباتی انداز میں کہہ رہا تھا۔اصغر شاہ خاموش رہے۔پھر اگلے ہی لمحے منگلا نے اپنے ٹرنک کو دوبارہ کھولا اور جلدی سے دومزید کتابچے ان کے حوالے کیے:

’’شاہ جی..!! دیکھیے ان کتابچوں کے مصنف علماء تو ہماری جماعت سے تعلق نہیں رکھتے ناں؟ یہ نیوٹرل یا سنی العقیدہ ہوں گے۔دیکھیے کیسے انھوں نے مرزا صاحب کے بارے میں شائستہ اسلوب اختیار کرتے ہوئے،ان کی کچھ باتوں کی تائید اور کچھ کی تردید کی ہے۔اسے علماء کا اختلافِ رائے بھی کہہ سکتے ہیں ،جس میں اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔مگر یہ کافر شافر اور اس طرح کے نعرے صرف جذباتی لوگ اور دین کی روح کو سمجھنے سے قاصر مولوی حضرات ہی لگاتے ہیں۔آپ تو ماشاءاللہ پڑھے لکھے اور تحمل مزاج انسان ہیں ۔‘‘وہ اب بھی اپنے لٹریچر کے پرچار سے پیچھے نہیں ہٹا تھا۔

’’ہوں...دیکھتا ہوں انھیں...‘‘اصغر شاہ نے وہ کتابچے پکڑ لیے تھے۔

’’شاہ جی...!! پلیز صرف ایک دفعہ میری باتوں پر غور کریں،دیکھیں، ہم کچھ نیا یا الگ نہیں کہتے۔آپ مجھے بتائیں، میں نے آپ کے ساتھ جتنی بھی باتیں کی ہیں، کیا ان میں سے کوئی بھی آپ کو گستاخانہ لگیں؟ میں نے تو بس سوال اٹھائے ہیں تاکہ آپ مولویوں کے ایک مخصوص زاویے سے ہٹ کر صورت حال کو دیکھیں۔میں معافی چاہتا ہوں اگر آپ کو میری بات بری لگی ہے، بلکہ.....‘‘یہ کہہ کر منگلا تیزی سے اٹھا اور میز پر سے اپنا سامان اٹھانے لگا۔

’’کیا کر رہے ہو تم...؟‘‘اصغر شاہ نے اچھنبے سے پوچھا۔

’’شاہ جی! اگر آپ کو میری حقیقت جاننے کے بعد میرے یہاں رہنے پر اعتراض ہے تو میں ابھی یہاں سے چلا جاتا ہوں اور دوبارہ کبھی آپ کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔مجھے پتا ہے لوگ ہمارے بارے میں اپنے دلوں میں کتنی نفرت رکھتے ہیں۔میں آپ سے ملا تھا تو مجھے لگا تھا کہ میں آپ سے بات کر سکتا ہوں، اپنے ’’مسلک‘‘ کے بارے میں آپ کو بتا سکتا ہوں تاکہ آپ جان سکیں کہ ہم بھی مسلمان ہیں، ہم بھی حضرت محمد ﷺ کو اپنا نبی مانتے ہیں، ہم بھی وہی نماز اور کلمہ پڑھتے ہیں جو آپ پڑھتے ہیں...لیکن...‘‘منگلا نے آنکھوں میں آئی نمی کو ہاتھ کی پشت سے پونچھا:’’....لیکن اگر آپ مجھ سے محض

اس جماعت سے تعلق کی وجہ سے نفرت کر رہے ہیں تو میں کس منہ سے یہاں رہ سکتا ہوں؟ پہلے ہی آپ کے مجھ پر بے شمار احسانات ہیں۔"

اس نے اپنی کتابیں اٹھا کر بستر پر رکھیں تو شاہ جی نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

"کوئی کہیں نہیں جارہا! سمجھے..!! جو منہ میں آرہا ہے بغیر سوچے سمجھے بولے جارہے ہو!" ان کے لہجے میں تھوڑی سختی تھی۔ منگلا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"اگر میں نے بھی دوسرے لوگوں کی طرح بغیر کسی تحقیق کے تم لوگوں سے نفرت کرنی ہے تو میرے اتنے مطالعے کا کیا فائدہ؟ میں یہ پڑھوں گا۔"

انہوں نے کتابچوں اور پمفلٹس کی جانب دیکھا: "...اور پھر تم سے بات کروں گا۔"

"جی جی ضرور شاہ جی....!!" منگلا نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا: "آپ ضرور انہیں پڑھیں...اور پھر آپ جو پوچھنا چاہیں، پوچھ سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے...اللہ حافظ۔" اصغر شاہ سپاٹ لہجے میں جواب دیتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد منگلا بے دم سا ہو کر بستر پر گر سا گیا۔ ایک بہت بڑا مرحلہ تھا جو عبور ہو گیا تھا، اور ایک بہت بڑا مرحلہ تھا جسے ابھی عبور کرنا تھا۔

....☆....

یونی ورسٹی سے ایک ہفتے کی چھٹی تھی جس کی وجہ سے ہاسٹل میں مقیم ساری طالبات کو اپنے اپنے گھروں کو جانا تھا۔ الوینہ بھی جا چکی تھی۔ بابا اسحاق منال کو لینے کے لیے ہاسٹل آیا ہوا تھا۔ منال نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

"کیا بات ہے ابا...؟ پریشان لگ رہے ہو۔"

"کچھ نہیں دھی رانی۔ تیری تیاری ہو گئی ہے؟" بابا نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔

"نہیں ابا....بتا کیا بات ہے؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟ اماں تو بیمار نہیں ہو گئی؟ بھاء امداد اور جاوید

ٹھیک ہیں؟‘‘

منال نے ابا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔

’’تیری ماں بھی ٹھیک ہے اور ان دونوں ہڈ حراموں کو کچھ نہیں ہونا....‘‘ بابا اسحاق کے لہجے میں تلخی عود آئی۔ پھر بھرائے ہوئے لہجے میں کہنے لگا:

’’میرا کالو بیمار ہے، کل سے۔ قولنج ہوا پڑا ہے اسے۔ بس اسی کی پریشانی ہے۔‘‘

’’اللہ خیر کرے.....‘‘ منال نے باپ کا ہاتھ تھپتھپایا: ’’میں جا رہی ہوں ناں، دیکھنا اسے ایک دن میں ہی ٹھیک کر دوں گی۔‘‘

وہ مسکرائی تو بابا اسحاق بھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا مسکرایا۔

’’تجھے دیکھتے ساتھ ہی اس نے اٹھ بیٹھنا ہے! چل اب جلدی تیاری کر لے، فیر بس پکڑیں۔‘‘

’’میں تو تیاری کر کے بیٹھی ہوئی تھی۔ بس ابھی بیگ لے کر آتی ہوں۔‘‘ منال تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

کچھ ہی دیر میں دونوں باپ بیٹی رکشے میں بیٹھ کر بس اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ دو گھنٹوں کے سفر کے بعد وہ اپنے شہر اور پھر تانگے پر بیٹھ کر چالیس منٹ میں وہ اپنے گھر پہنچ چکے تھے۔ تانگے سے اتر کے جیسے ہی منال کی نظر اپنے کچے مکان کے ساتھ بنے باڑے پر پڑی، اس کا دل مسوس کر رہ گیا۔ وہاں کالو زمین پر لیٹا، اپنے سر کو مٹی پر رکھے انہی کی جانب یاس بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

منال کے گھر واپس آنے کے اگلے ہی دن کالو چلا گیا، ہمیشہ کے لیے.....! بابا اسحاق کی تو جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی۔ کالو اس گھر میں تب آیا تھا جب منال دس سال کی تھی۔ وہ تب زیادہ بڑا نہیں تھا۔ خوب صورت تو وہ تھا ہی...

’’ابا! یہ گھوڑا میرا ہے۔‘‘ امداد نے فوراً بابا اسحاق سے لگام لینے کی کوشش کی۔

’’نہ بیٹا نہ! اینج نہیں کردے!‘‘ بابا اسحاق نے اسے سمجھانے کی کوشش کی: ’’اللہ نے ان گھوڑوں کو بڑے پیار سے بنایا ہے۔ ان سے دوستی کرو گے تو یہ اپنے اوپر بٹھائیں گے اور تجھے ہر جگہ لے کر جائیں گے۔

لیکن اگر انہیں زور سے قابو کرنے لگو گے تو یہ تجھے ہاتھ بھی نہیں لگانے دیں گے۔"

مگر لڑکپن کی سرحد پر قدم رکھتے امداد نے بڑے زعم کے ساتھ کالو پر بیٹھنے کی کوشش کی تھی۔ جیسے ہی اس نے کالو کی نعل کو پکڑا، کالو نے ہنہناتے ہوئے اپنی اگلی ٹانگیں اوپر اٹھا لیں۔ امداد ڈر کے مارے لڑکھڑایا اور اور سنبھلتا ہوا تیزی سے پیچھے ہٹ گیا اور دور کھڑا ہو کر سہمی نظروں سے دیکھنے لگا۔

جاوید الگ ناراض تھا کہ گھوڑا کیوں خریدا گیا ہے، کبوتر کیوں نہیں۔ ایک منال رہ گئی تھی جو اس وقت دروازے کی اوٹ سے، اپنی بڑی آنکھوں کو خوف سے مزید پھیلائے، کالو کو دیکھتی جا رہی تھی۔

"میں نے تجھے کہا بھی تھا!" بابا اسحاق نے امداد کو ڈانٹا۔ پھر اس کی نظر بیٹی پر پڑی تو اسے بلانے لگا،

"دیکھ منال! تیرے لیے گھوڑا لایا ہوں۔" لیکن بیٹی ٹس سے مس نہ ہوئی اور وہیں دروازے کی اوٹ سے کالو کو گھورتی رہی۔

"رہن دے اسے! امداد سے سنبھالا نہیں گیا، یہ بھی چوٹ لگوا لے گی۔"

اماں اسی وقت گائے کو دودھ دوہنے کے لیے ایک ہاتھ میں پیتل کا برتن اٹھائے باہر نکلی تھیں۔

"او سیانی بی بی!" بابا اسحاق جب بھی اماں کو پیار سے سیانی بی بی کہتے تھے، منال کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھی۔ اسے اماں کے لیے سیانی بی بی کا لفظ بالکل مناسب لگتا تھا۔ ایک ہی دودھ سے دہی، مکھن، گھی اور لسی کیسے بنانی ہے، یہ اماں کو پتا تھا، اسے نہیں۔ مرغی کو کب انڈوں پر بٹھانا ہے، کب بالن توڑ کر لانا ہے، پھونکنے سے کس طرح کچے چولہے کے نیچے سلگتی لکڑیوں پر پھونک مار کر ان میں بجھتی آگ کو کس طرح دوبارہ بھڑکانا ہے، یہ سب اماں کو پتا تھا، اسے نہیں۔ تو پھر اماں سیانی ہوئیں ناں!!

"انسان گھوڑے کو نہیں چُنتا بلکہ گھوڑا خود چنتا ہے کہ اس کے اوپر کون بیٹھے گا اور کون اسے سہلائے گا۔ امدادے کو تو بس اپنی ٹور دکھانی تھی کہ اس کے بازو کی مچھلیوں میں بڑا زور آ گیا ہے، کالو نے ساری آکڑ نکال دی"!

بابا اسحاق ہنسا تو منال بھی ہنس پڑی تھی۔ امداد ابا کی بات سن کر تن فن کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

"لے، یہ سیب کھلا اسے۔"

بابا اسحاق نے منال کی طرف ایک سیب بڑھایا تو وہ جھجکتے ہوئے ان کے پاس چلی آئی اور ان کے ہاتھ سے سیب پکڑ لیا۔ بابا نے اس کے ہاتھ کے نیچے اپنا ہاتھ رکھا اور پھر دونوں ہاتھوں کو کالو کے منہ کے قریب کیا۔ منال کو ڈر لگ رہا تھا۔

"دیکھ کالو....! میری شہزادی تیرے لیے کیسا میٹھا سیب لائی ہے! لے، کھالے"!

کالو نے اپنا چہرہ سیب کے نزدیک کیا تو اس کے نتھنوں سے نکلنے والی گرم گرم سانس منال کے ہاتھ سے ٹکرائی۔ اس نے سہم کر اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا لیکن اس کا ہاتھ بابا اسحاق کے ہاتھ پر دھرا ہوا تھا۔ انہوں نے اسے ہاتھ کو کھینچنے نہ دیا۔ تبھی کالو نے اپنے بڑے بڑے دانتوں سے اس کے ننھے ہاتھ کے اوپر سے سیب اچک کر کھانا شروع کر دیا۔ اس کے منہ سے سیب کے کچھ ذرے منال کی ہتھیلی پر گرے تو اس نے کراہیت سے اپنا ہاتھ دوبارہ کھینچا۔ اِس دفعہ بابا اسحاق نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ہنستے ہوئے پیار سے کالو کی پیشانی کو سہلانے لگا۔

"دیکھا! کچھ نہیں کہتا یہ... آجا، اسے پیار کر لے۔" انہوں نے دوبارہ منال کو بلایا تھا۔ سیب کھلانے سے منال کا ڈر کسی حد تک دور ہو گیا تھا لیکن تھوڑی سی جھجک ابھی بھی باقی تھی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کالو کے بدن پر ہاتھ پھیرا تو کالو نے ہلکی سی جھرجھری سی لی لیکن آرام سے کھڑا رہا۔

"اب یہ تیرا گھوڑا ہے مُنی.....!" بابا اسحاق نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ اور منال نے واقعی اسے اپنا گھوڑا مان لیا تھا۔ اس کی خوب خدمتیں کرتی اور وہ بھی جیسے ہی منال کو دیکھتا، خوشی سے اپنی اگلی ٹانگوں کے سموں کو زمین پر مار کر ہنہنانے لگتا۔

بابا اسحاق کا تانگہ چلنا شروع ہو گیا تھا۔ منال کی پڑھائی کے پیچھے کالو کی بھی محنت شامل تھی۔

اور اب..... کالو مر گیا تھا!

....☆....

"مراد! منگلا کدھر ہے؟ نظر نہیں آ رہا۔"

صبح اصغر شاہ مہمان خانے کی جانب آئے تو منگلا کا خالی کمرہ دیکھ کر حیرت سے مراد سے پوچھا۔ وہ

ڈیرے کے ایک جانب لگے نلکے پر ہاتھ دھو رہا تھا۔

''وہ تو شاہ جی صبح سویرے ہی نکل گئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ ایک ضروری کام کی وجہ سے اپنے گھر جانا پڑ گیا ہے اور دو دن بعد آجائیں گے۔''

''اچھا....!!'' اصغر شاہ کو اس کا جواب سن کر حیرت ہوئی۔ ایسا پہلی دفعہ ہوا تھا کہ منگلا انہیں بتائے بغیر کہیں چلا گیا تھا۔

''تو اس نے پہلے کون سا مجھے ساری باتیں بتائی تھیں۔''

ان کے ذہن میں گزشتہ رات کا واقعہ گزر گیا۔ وہ بدمزہ سا منہ بناتے ہوئے سکول کی جانب چل دیے۔ سکول میں منگلا کی غیر حاضری کی وجہ سے طلباء کا لیب پیریڈ آف تھا جو انہوں نے لائبریری میں بیٹھ کر کچھ وقت خاموش رہ کر کتابیں پڑھنے میں اور باقی وقت شور مچانے میں گزارا!

''منگلا صاحب کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔''

سر ریاض نے چنے کی دال لوکی کا سالن اپنی پلیٹ میں نکالتے ہوئے کہا تھا۔ اصغر شاہ نے ایک نظر انہیں دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں۔

دوپہر کو ان کے ڈیرے پر دوپہر کے کھانے کی نشست جمی ہوئی تھی۔ اصغر شاہ کی عادت تھی کہ وہ دوپہر کے کھانے میں ضرور کسی کو شریک کرتے تھے، اس لیے سر ریاض اور سر عبدالغفور اکثر سکول سے چھٹی کے بعد ڈیرے پر آجاتے تھے اور کھانا کھا کر اپنے گھروں کو رخصت ہو جاتے تھے۔

''بہت اچھے، سلجھے مزاج کا نوجوان ہے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا لیکن دوسروں کی مدد کرنے کو ہر پل تیار۔'' سر عبدالغفور نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''شاہ جی! منگلا کتنے دن کی چھٹی پر گیا ہے؟ آج تو لڑکوں نے شور مچا کر ناک میں دم کر دیا تھا!'' سر ریاض ہنسے تھے۔ وہ لائبریرین تھے۔

''ہوں....!!'' اپنی ہی سوچوں میں ڈوبے ہوئے اصغر شاہ چونکے تھے۔ ''مجھ سے کچھ کہا؟''

''جی شاہ جی...!!'' سر عبدالغفور بولے۔ ''ریاض صاحب پوچھ رہے ہیں کہ منگلا کب تک واپس

آجائے گا؟"

"اوہ اچھا...!! معاف کرنا، میرا ذہن کہیں الجھا ہوا ہے۔" اصغر شاہ شرمندگی سے بولے:

"وہ آجائے گا...ان شاءاللہ کل شام یا رات تک پہنچ جائے گا۔ دو دن کی چھٹی پر گیا ہے۔"

"شکر ہے۔ پھر لائبریری میں سکون ہو گا۔"

سر ریاض ہنسے۔ اصغر شاہ بھی ہنس پڑا اور اپنے ذہن میں آتی سوچوں کو جھٹک کر کھانے اور بات چیت پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔

....☆....

بابا اسحاق نیم کے درخت کے نیچے بچھی چارپائی پر سر پکڑے بیٹھا تھا جبکہ اس کے سامنے رکھی دوسری چارپائی پر بیٹھا امداد اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چھوٹی سی منڈیر کے عقب میں کچے چولہے پر چائے پکاتی منال کے کانوں تک باپ بیٹے کی ساری باتیں پہنچ رہی تھیں۔اماں باہر زمینوں پر جانوروں کے لیے درانتی کے ساتھ تیزی سے چارہ کاٹ رہی تھیں۔

"ابا! میری مان، تو مجھے کراچی جانے دے۔ لیاقت چھٹی پر آیا ہوا ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ کراچی میں سب کو کام مل جاتا ہے۔"

جواب میں بابا اسحاق سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔

"تجھے مجھ پر بھروسہ نہیں ہے؟ تُو ہمیشہ مجھے نالائق سمجھتا آیا ہے ابا، مجھے پتا ہے۔ نہ میں پڑھائی میں اچھا، نہ میں تجھ سے کوئی ہنر سیکھ سکا۔ لیکن مجھے ایک بار کراچی جانے دے، تُو دیکھنا وہاں میں ضرور کچھ کروں گا۔ یہاں رہ کر تو بس تانگہ چلالو، دکان کھول لو یا پھر نمبردار کی زمینوں کو دیکھنے میں اپنی زندگی گزار دو۔"

پیالی کے اوپر چھلنی رکھ کر چائے چھانتی منال نے اس کے لہجے میں منت اور بے زاری کو محسوس کیا تھا۔اس نے چائے کی کٹوریوں کو سٹیل کی ایک ٹرے میں رکھا، ساتھ ایک پلیٹ میں تین چار رس رکھے اور

باپ اور بھائی کی جانب چلی آئی۔

""لیکن امدادے! کراچی اتنا دور.... !تُو کیسے جائے گا؟ اور تیرے بغیر میں یہاں کیا کروں گا پتر؟""

بابا اسحاق نے آخر سر اٹھا کر امداد کی جانب دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں دکھ تھا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ٹرے سے چائے کی کٹوری اٹھالی۔

""میں نے کچھ رقم جوڑ رکھی ہے۔ لیاقت نے شام والی ریل گڈی تے پرسوں واپس کراچی جانا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جاؤں گا ناں۔ اور تُو فکر نہ کر، میں اُدھر پہنچتے ہی کوئی کام شام ڈھونڈ کے ناں تجھے پیسہ بھیجنا شروع کر دوں گا۔ لیاقت کہہ رہا تھا کہ وہ بھی مجھے اسی فیکٹری میں کام دلوا دے گا جہاں وہ کام کرتا ہے۔""

امداد نے منال کے ہاتھ سے چائے کی کٹوری لی اور پھر سے کہنے لگا:

"" ابا...!! دیکھ... کالو تو اب ہے نہیں....، تُو نے سوچا ہے گزارا کیسے ہو گا؟ تیرے پاس اور گھوڑا خریدنے جوگے پیسے ہیں؟ اور اس کے ہاسٹل کے خرچے ہم کدھر سے بھریں گے اب...؟""

امداد منال کی پڑھائی کو درمیان میں لے آیا۔ منال نے چور نظروں سے ابا کو دیکھا، وہ چائے پیتے ہوئے گہری سوچ میں گم ہو گئے تھے۔ منال ٹرے کو چارپائی پر ایک جانب رکھ کر اندر کمرے میں چلی آئی۔

""تیری ماں مان گئی ہے؟"" ابا کو امید تھی کہ اماں نہیں مانے گی۔

""وہ تو پہلے سے مانی بیٹھی ہے۔"" امداد نے جوش سے بتایا۔

""ٹھیک ہے پتر، چلا جا فیر کراچی۔"" اندر رکھی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے منال کے کانوں میں ابا کی تھکی تھکی سی آواز آئی تھی۔

....☆....

نگہت بیگم فون پر اپنی بہن سے گپ شپ کرنے میں مصروف تھیں، عمر اور علی بلال کے ساتھ کرکٹ کھیلنے گراونڈ میں جا چکے تھے اور رابعہ اپنا ہوم ورک کرنے میں مگن تھی۔ شام کو اصغر شاہ کے ڈیرے پر آکر محفل جمانے اور چائے پینے والے عبدالکریم برطانیہ جا چکے تھے اور منگلا غائب تھا۔

اصغر شاہ نے چائے اپنے اسٹڈی روم میں ہی منگوالی تھی۔

''ابو جی، یہ لیں چائے۔'' نگہت بیگم کے پردے کی وجہ سے مراد کا گھر کے اس حصے میں آنا منع تھا۔اس نے دروازے سے ہی رابعہ کو چائے کی ٹرے تھما دی تھی اور اب وہ چائے لے کر اصغر شاہ کے اسٹڈی روم میں آئی تھی۔

''جیتی رہو بیٹی۔'' اصغر شاہ نے اخبار ایک جانب رکھ کر اس سے ٹرے پکڑ لی اور میز پر رکھ دی:

''ہوم ورک کیسا جا رہا ہے؟''

''ٹھیک ہے ابو جی...! سائنس کا کر چکی ہوں، اب بس اردو کا رہتا ہے۔'' رابعہ نے تابعداری سے بتایا۔

''تمہارے بھائیوں کو تو فکر ہی نہیں ہے ہوم ورک کی، دیکھو تو کیسے مزے سے کھیلنے چلے گئے۔'' اصغر شاہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ رابعہ بھی ہنس پڑی۔

''مجھے رسالہ پڑھنا ہے اس لیے بس جلدی جلدی ہوم ورک ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔''

''شاباش، اچھی بات ہے۔ ہوم ورک میں کوئی مسئلہ ہو تو مجھ سے یا اپنی ماں سے پوچھ لینا۔''

اصغر شاہ نے کہا تو وہ 'جی ابو جی' کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد اصغر شاہ کچھ ثانیے تو میز پر رکھے چائے کپ میں سے اٹھتی بھاپ کو تکتے رہے، پھر ایک گہری سانس لے کر میز کے ایک جانب بنی دراز میں سے منگلا کے دیے ہوئے دعوتی پمفلٹ نکالے اور انہیں پڑھنے لگے۔ انہیں پڑھنے میں وہ اتنا محو ہو گئے تھے کہ چائے پینے کا خیال ہی نہیں رہا۔ زندگی میں پہلی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ چائے کا کپ ان کے قریب رکھا ہوا تھا اور وہ اس سے غافل ہو گئے تھے۔

....☆....

''اوہ نو منال.....!! یہ کیسے ہوا؟ تمہیں تو وہ گھوڑا بہت پسند تھا''!

الوینہ نے صدمے سے کہا تو منال کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں اور ہاسٹل واپس آباد ہو چکا تھا۔

''ہاں، وہ میرا چہیتا تھا۔ میں نے اس کے بہت لاڈ اٹھائے تھے۔ کاش میں تمہیں اس سے ملوا پاتی۔''

منال نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے گلو گیر لہجے میں کہا تھا۔

''آئی نو، میں تمہارا دکھ محسوس کر سکتی ہوں۔ میرے پاس ایک کیوٹ سا بُل ڈوگ تھا لیکن ایک دن اس نے کوئی زہریلی چیز کھالی تھی اور میرے ہاتھوں میں دم توڑ دیا تھا۔ میں اس کی ڈیتھ کے بعد ڈپریشن میں چلی گئی تھی۔''

الوینہ نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے تسلی دینا چاہی: ''اس کے بعد ڈیڈی نے چیک خریدا تھا لیکن وہ مجھے اچھا نہیں لگتا، تبھی اسے پاس نہیں آنے دیتی۔''

''ابا بہت پریشان ہو گئے ہیں اس کے جانے سے .....امداد بھائی بھی کراچی چلے گئے ہیں۔ پاس ہوتے تو شاید ابا کو سہارا محسوس ہوتا۔ کالو اور تانگے کی وجہ سے ہماری گزر بسر ہوتی تھی۔ شکر ہے یونی ورسٹی کی طرف سے مجھے سکالرشپ ملا ہوا ہے اس لیے فیس کا مسئلہ نہیں ہے ورنہ میری پڑھائی چھوٹ جانی تھی۔''

منال نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب ہے، پڑھائی چھوٹ جانی تھی؟''الوینہ نے اسے آنکھیں دکھائیں: ''زندگی میں پہلی دفعہ مجھے ایک رئیل فرینڈ ملی ہے تو ایسے ہی اسے چھوڑ دوں گی کیا....؟ تم بالکل بھی فکر نہیں کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ان شاءاللہ.....''منال نے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا۔

....☆...

منگلا کے دیے ہوئے کتابچوں نے ان کی بے چینی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ رات کو سونے کے لیے لیٹے تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ان کے دل اور دماغ میں لڑائی چھڑ چکی تھی۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے۔''نگہت بیگم ان کے پہلو میں گہری نیند سو رہی تھیں او وہ سینے پر اپنے دونوں ہاتھ دھرے، سیدھے لیٹے، چھت پر لگے پنکھے کو دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے۔

"مجھے اس جماعت کے بارے میں مزید تحقیق کرنی چاہیے۔ کیا معلوم ان کے خلاف پروپیگنڈا زیادہ ہو اور اصل بات یہ نہ ہو۔ منگلا کا کردار اور اخلاق متاثر کن ہے۔ جس طرح اس نے مری میں میری جان بچائی اور جس خلوص سے وہ بچوں کو سکول میں پڑھاتا ہے، اسلام کی تعلیمات بھی تو یہی ہیں... تو پھر اس کی جماعت کو مسلمان کیوں نہیں کہا جاتا؟" سوچیں اور سوال مسلسل اس کے ذہن میں آتے جا رہے تھے۔

"مجھے مزید جاننا چاہیے اس کی جماعت کے بارے میں.. ہو سکتا ہے اگر وہ غلط ہو تو میں اسے سیدھی راہ پر لے آؤں، اور ہو سکتا ہے میں غلط ہوں۔"

اچانک انہیں جھٹکا سا لگا تھا۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"کیا ایسا.... ایسا ممکن ہے کہ میں.... اور ہم سب اکثریتی مسلمان غلط ہوں...... اور وہ اقلیتی لوگ ہی درست ہوں.. ؟اف میرے خدا..." !!

یہ خیال ہی ان کے لیے بہت بڑا اور رونگھٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔ وہ لرز کر رہ گئے:

"نہیں نہیں.... ایسا ناممکن ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں ہو سکتا۔ وہی لوگ غلط ہیں... ہم کیسے غلط ہو سکتے ہیں؟ ' '

انہوں نے اضطرابی حالت میں اپنے چہرے کو ہاتھوں سے رگڑا:

"ایسا ہو سکتا ہے کہ جو نکات اتنے سالوں سے ہم مسلمانوں سے پوشیدہ ہوں، انہیں اللہ نے اس جماعت کے سربراہ پر کھول دیے ہوں۔"

ان کے اندر ملی جلی آوازں کا شور اٹھ رہا تھا:

"نہیں.... نعوذ باللہ... میں یہ کیا سوچ رہا ہوں..! مجھے ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ مجھے اس جماعت کے بارے میں مزید تحقیق نہیں کرنی چاہیے، کہیں یہ لوگ میرا ذہن نہ بدل دیں۔" ان کے پورے جسم سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا: "اگر انہوں نے میرا ذہن بدل دیا تو اس کا تو مطلب یہ ہو گا کہ وہ لوگ حق پر..."

سوچ کی یہ لہر اتنی زورآور تھی کہ بے ساختہ اصغر شاہ کہہ اٹھے۔

"نہیں.....!!!" نگہت بیگم ہڑبڑا کر جاگی تھیں۔انہوں نے فوراً سائیڈ لیمپ جلایا تھا۔

"کیا ہوا سرتاج..؟" انہوں نے اصغر شاہ کو پسینے میں شرابور بیٹھے ہوئے دیکھا تو پریشان ہو گئیں۔

"نہیں..کچھ نہیں....کچھ نہیں...تم سو جاؤ پلیز...." اصغر شاہ نے ان کی جانب دیکھا تو وہ مزید پریشان ہو گئیں۔اصغر شاہ کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟"

"ہاں ٹھیک ہوں، بس تم سو جاؤ...رکو، مجھے پانی دے دو۔" اصغر شاہ نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا تو نگہت بیگم نے جگ میں سے پانی گلاس میں انڈیل کر ان کی جانب بڑھایا۔وہ ابھی بھی تشویش بھری نظروں سے انہیں غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"شکریہ....!!" اصغر شاہ نے خالی گلاس ان کی جانب بڑھایا اور خود دوسری جانب کروٹ لے کر لیٹ گئے۔ نگہت بیگم بھی ان کی پشت کو پریشانی سے گھورتی ہوئی دوبارہ لیٹ گئیں اور سائیڈ لیمپ بند کر دیا۔

....☆....

ڈیڈی اور الوینہ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے جب الوینہ نے کہا۔

"ڈیڈی! مجھے آپ سے ایک بات کرنی تھی۔"

"ہاں بولو...." ڈیڈی نے اسٹیکس کو چھری اور کانٹے سے الگ کرتے کہا۔جواب میں الوینہ انہیں منال کی پریشانی کے بارے میں بتاتی گئی۔ڈیڈی پوری توجہ سے سن رہے تھے۔ جیسے ہی اس نے بات ختم کی، ڈیڈی مسکرائے۔

"بس، یہ بات ہے؟" ڈیڈی نے اطمینان نے اسٹیکس منہ میں ڈالی۔

"جی...." الوینہ اپنی پلیٹ میں سے کرسپی فرائیڈ پرانز اٹھا کر کھانے لگی۔

"No worries.۔اسے کتنی رقم چاہیے؟" ڈیڈی نے نیپکن سے ہاتھ اور ہونٹ صاف کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"آئی ڈونٹ نو کہ گھوڑا کتنے کا آتا ہے۔" الوینہ نے کندھے اچکا کر اچھنبے سے کہا تھا۔ ڈیڈی اس کا انداز دیکھ رک ہنس پڑے، پھر پینٹ کی جیب سے کالے چمڑے کا بٹوہ نکالا جس پر 'ٹیڈ بیکر' کا مونو گرام بنا ہوا تھا۔

"یہ اسے دے دینا...." ڈیڈی نے الوینہ کی جانب ہزار ہزار روپے کے کچھ نوٹ بڑھائے تھے۔

الوینہ نے ایک ابرو اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

"اس طرح تو وہ نہیں لے گی ڈیڈی...."!

"تو تمہارا کیا مطلب ہے، اب میں گھوڑا خرید کر اس کے گھر کے باہر باندھ دوں؟" ڈیڈی نے بھی ابرو اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" الوینہ نے دوبارہ ایک پران اٹھا کر کھانا شروع کر دیا تھا۔ ڈیڈی ہنس پڑے۔

"تم اتنی جلدی ناراض کیوں ہو جاتی ہو مجھ سے؟"

"نہیں، میں ناراض نہیں ہوں..... بس سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ سے کیا بات کروں...." الوینہ نے ان کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا تھا۔

"اپنی اس فرینڈ سے تو بہت باتیں کرتی ہو.... جب اسٹڈیز مکمل ہو جائیں گی اور وہ ہمیشہ کے لیے اپنے گاؤں چلی جائے گی تو پھر کیا کرو گی؟"

ڈیڈی نے کوک کا گلاس لگاتے ہوئے گہری نظروں سے الوینہ کو دیکھا۔ وہ ان کا سوال سن کر چونک گئی تھی لیکن خاموش رہی۔

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو..... تم منال سے کہنا کہ اگر اسے اس طرح رقم لینا ٹھیک نہیں لگ رہا، تو کوئی بات نہیں، میں اس کے گھر جا کر اس کے باپ کو دے دوں گا، یا کوئی اور طریقہ تلاش کر لیں گے ہم..."

"واٹ...؟ آپ اس کے گھر جائیں گے؟" الوینہ نے حیرت سے پھیلی آنکھوں کے ساتھ ڈیڈی کو دیکھا۔

”سوواٹ... ؟میں اس کے گھر چلا گیا تو کیا ہو گا؟“ ڈیڈی کو اس کی حیرت پر حیرت ہوئی۔

”نہیں..... میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ ہم اس کے گھر بھی جا سکتے ہیں۔ وہ کافی غریب لوگ ہیں۔“ الوینہ نے کہا۔

”تم نے بہت غریب لڑکی سے دوستی بھی تو کی ہوئی ہے..... تو کیا ہوا اگر ہم اس کے گھر چلے جائیں؟ اور ہاں... اسی بہانے میں اس کا علاقہ بھی دیکھ لوں گا، شاید یہ بات میرے کام آئے۔“

”آپ کو معلوم ہے میں لوگوں کو ان کی مالی حیثیت پر جج نہیں کرتی۔“

”اور تمہیں بھی معلوم ہے کہ مجھے جہاں کسی بھی قسم کا کوئی فائدہ نظر آئے تو میں اسے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔“ ڈیڈی نے مکار سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

”مجھے سمجھ نہیں آتی اس کام سے آپ کو کیا فائدہ ہوتا ہے ڈیڈی؟“ الوینہ دوبارہ اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

”تم نہیں سمجھو گی وینہ! یہ جو میرے پاس اتنا پیسہ ہے، اتنا رعب اور دبدبہ ہے، یہ سب اسی کام کا مرہون منت ہے۔ یہ کام چلتا رہے، ہمارے حق میں یہی بہتر ہے، لیکن تم اس بات کو نہیں سمجھو گی، تم نے کبھی اس میں انٹرسٹ ہی نہیں لیا، Infact, تم نے کبھی مذہب میں ہی انٹرسٹ نہیں لیا!!“ ڈیڈی کے لہجے میں شکوہ تھا۔

”Whatever!!“ الوینہ نے جواب میں کندھے اچکا کر بے زاری کا اظہار کیا اور آخری پران کو بھی منہ میں ڈال لیا۔

....☆....

”السلام علیکم شاہ جی...!“

اصغر شاہ صبح کی سیر سے فارغ ہو کر، ڈیرے کے باہر لگائی ہوئی سبزیوں کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک کسی نے عقب سے آہستگی سے کہا تھا۔ وہ منگلا تھا۔

”ارے تم...!!“ اصغر شاہ اسے دیکھ کر پہلے تو تھوڑا حیران ہوئے، پھر ناراضی کے اظہار کے طور پر

اس سے منہ پھیر لیا اور سبزیوں کے پودوں کو دیکھنے لگے۔

''شاہ جی....!'' اب منگلا نے ان کے سامنے آکر پکارا تھا۔

''تم کیا سوچ کر گئے تھے..؟ اور اب کیا سوچ کر واپس آئے ہو؟'' اصغر شاہ نے بے تاثر لہجے میں کہتے ہوئے ٹماٹر کے پودے کا معائنہ کیا۔ وہاں پھولوں کی پتیاں گر چکی تھیں اور اب ان کی جگہ سبز رنگ کے ننھے ٹماٹر نکل رہے تھے۔

''میں یہ سوچ کر گیا تھا کہ اب شاید آپ کے دل اور مہمان خانے میں میری جگہ نہیں رہی ہو گی....اور واپس یہ سوچ کر آیا ہوں کہ مجھے خود سے یہ بات اخذ نہیں کر لینی چاہیے۔ ہدایت دینا خدا کا کام ہے، میرا کام تو بس ہدایت کو آپ تک پہنچانا ہے۔'' منگلا کے لہجے میں اعتماد اور بے خوفی تھی۔ اصغر شاہ نے اکڑوں بیٹھ کر غور سے کدو کی بیل کو دیکھا۔ اس کے زرد ہوتے پتے موسم کی تبدیلی کا پتا دے رہے تھے۔

''میں اس بات کا یقین کس طرح کروں کہ تم مجھے ہدایت کی طرف بلا رہے ہو؟ یہ راستہ گمراہی کا بھی تو ہو سکتا ہے۔'' انہوں نے ایک پتے کو نرمی سے چھوا۔

''یہ فیصلہ کرنا تو آپ کا کام ہے شاہ جی....!! ہماری جماعت کا یہ طریقہ کار نہیں کہ کسی پر اپنے عقائد زبردستی نافذ کریں۔ ہم تو دعوت دیتے ہیں کہ ہم سے بات کریں، ہم سے پوچھیں کہ ہم کیا مانتے ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔'' منگلا نے نیچے جھک کر کدو کی بیل کے قریب اگتی ایک جڑی بوٹی کو جڑ سے کھینچ کر باہر نکالا۔

''میں یہ فیصلہ کیسے کر سکتا ہوں؟''

اصغر شاہ نے اب اپنی انگلیوں کی پوروں سے پودینے کے پتوں کو ہلکا سا مسلا۔ فضا میں پودینے کی دلفریب سی مہک پھیل گئی۔

''تحقیق کر کے شاہ جی...! سوال کر کے سوال اٹھا کر... لیکن شرط یہی کہ پہلے سے ذہن میں موجود تصورات کی بنا پر تحقیق نہ کی جائے، جوابوں کے متلاشی سوالوں کو ذہن میں پہلے سے موجود تصورات اور خیالات کی کسوٹی پر نہ پرکھا جائے... سوچ کا ایک نیا در کھولا جائے، ایک نئے زاویے سے بات اور عقائد کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔'' منگلا وہ باتیں کہہ رہا تھا جو اس کی اپنی نہیں تھیں، ان دو دنوں میں وہ سر

عظمت اور ایک دوسرے مربی سے اچھی خاصی ٹریننگ لے کر آیا تھا اور ہر طرح سے اصغر شاہ کو قائل کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

''ٹھیک ہے پھر....'' اصغر شاہ ہاتھ جھاڑ کر کھڑے ہو گئے۔ پھر پوری گفتگو میں پہلی دفعہ منگلا کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگے:

''مجھے مزید تحقیق کرنی ہے۔ عصر کی نماز کے وقت تیار رہنا۔ ہم دونوں کہیں چلیں گے۔''

''کہاں شاہ جی...؟'' منگلا کو حیرت ہوئی۔

''وقت آنے پر پتا چل جائے گا۔''

اصغر شاہ نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا اور گھر کی جانب بڑھ گئے۔ حیران پریشان منگلا بھی مہمان خانے کی طرف چل دیا۔

....☆....

''یہ کیا ہے الوینہ..؟'' منال ہاسٹل کے سبزہ زار میں بیٹھی پڑھ رہی تھی جب الوینہ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے ایک چھوٹا سا خالی لفافہ اور ایک چاکلیٹ کارنیٹو اس کی کتاب پر رکھ دی۔ منال نے چونک کر پہلے لفافے اور آئس کریم کو اور پھر الوینہ کو دیکھا تھا جو اب مزے سے اپنی ٹانگوں کو جھلاتی ہوئی، اپنے ہاتھ میں پکڑی کارنیٹو کا ریپر اتارنے میں مگن تھی۔

''آئس کریم ہے، بہت مزے کی، کھاؤ ناں۔''

منال نے آئس کریم کی بجائے لفافے کو اٹھایا اور اسے کھول کر دیکھا تو دھک سے رہ گئی۔ لفافے کے اندر کچھ رقم تھی۔

''لیکن یہ....؟'' منال نے نوٹوں کو ہاتھ میں پکڑ کر اچنبھے سے پوچھا۔

''اوہو.... پہلے آئس کریم تو کھالو۔ پگھل جائے گی۔'' الوینہ نے اپنی آئس کریم کے ریپر کو زبان سے چاٹتے ہوئے لاپرواہی سے کہا لیکن منال نے پھر بھی آئس کریم کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ وہ بس رقم کو گھورتی رہی۔

''دوپہر کو ڈیڈی کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی۔ تمہارا پوچھ رہے تھے۔''

کچھ ثانیے کے بعد الوینہ نے خود ہی بتانا شروع کر دیا۔ منال نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''میں نے انہیں تمہارے گھوڑے اور مالی پریشانیوں کے بارے میں بتایا تھا۔ بہت افسوس کر رہے تھے۔ یہ رقم بھی انہوں نے ہی دی ہے، تمہارے لیے۔'' الوینہ کا جواب سن کر منال نے ایک دفعہ پھر نوٹوں کی جانب دیکھا۔

''لیکن.....الوینہ! تم نے انہیں کیوں بتایا؟....اور..... یہ رقم میں نہیں لے سکتی پلیز.....''

''کیوں؟ کیا میں تمہاری فرینڈ نہیں ہوں؟'' الوینہ نے بھنویں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''ایسی بات نہیں ہے الوینہ....'' منال نے بے بسی سے لب کاٹے....'' ....تم اور تمہارے ڈیڈی بہت اچھے ہیں۔ آج کے زمانے میں اتنے مخلص لوگ نہیں ملتے.... لیکن میں اتنی بڑی رقم کیسے لے سکتی ہوں؟''

''یہ رقم تمہارے لیے تھوڑی ہے؟ تمہارے ابا کے لیے ہے تاکہ وہ نیا گھوڑا خرید کر دوبارہ وہ.... کیا کہتے ہیں اسے؟....ہاں، تانگہ چلا سکیں، بلکہ ایسا کرو....'' الوینہ نے اتنا کہہ کر منال کی نوٹ بک اس کے سامنے رکھی: ''اس پر تم اپنے گھر کا پتا لکھ دو۔ ڈیڈی خود ہی یہ رقم تمہارے گھر پہنچا دیں گے۔''

''نہیں الوینہ.....! ایسے کیسے...؟'' منال اس کی تجویز پر تقریباً اچھل ہی پڑی:

''مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا کہ تمہارے ڈیڈی کو اتنی زحمت ہو....''

''تو پھر چپ کر کے تم ہی یہ پیسے رکھ لو۔ ڈیڈی یہ بھی کہہ رہے تھے کہ اگر کم پڑیں تو مزید لے لینا۔''

الوینہ اب آئس کریم کی کون کھانے لگی تھی۔ منال الجھ کر رہ گئی۔ اگر رقم رکھتی تو ابا ناراض ہو جاتے، اور اگر نہیں رکھتی تو الوینہ کی دوستی شاید ختم ہی ہو جاتی۔

''کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم اور تمہارے ڈیڈی جمعرات کو میرے ساتھ گاؤں چلیں...اور وہاں تمہارے ڈیڈی خود میرے ابا جی کو یہ رقم دے دیں؟ یہ زیادہ مناسب رہے گا۔'' منال نے ملتجی لہجے میں کہا

تھا۔

''اوکے، نو پرابلم.... میں ڈیڈی کو فون کر کے بتادوں گی۔''

الوینہ نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا تھا۔ منال نے مشکور نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے اپنی آئس کریم کھانا شروع کر دی جو پگھل کر زمین پر گرنے ہی والی تھی۔

....☆....

''مراد! آج چائے بس اپنے اور شوکت کے لیے بنالو۔ ہم کسی کام سے جارہے ہیں۔'' مراد ہاتھ سے گیڑنے والے نلکے سے دیگچی میں چائے کے لیے پانی ڈالنے لگا تھا جب اصغر شاہ نے ڈیرے کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ وہ اور منگلا مسجد سے آرہے تھے۔

''شاہ جی! میں گاڑی باہر نکال لیتا ہوں، آپ دونوں آجائیں۔'' شوکت ان کی آواز سن کر وہیں آگیا۔

''نہیں شوکت، گاڑی میں چلالوں گا۔ تم گھر پر ہی رہو۔ بس مجھے اور منگلا کو ایک ضروری کام ہے۔'' اصغر شاہ نے جواب دیا تو گیراج کی طرف بڑھتے شوکت کے قدم وہیں رک گئے۔ اس نے حیرت سے ان کی اور پھر منگلا کی جانب دیکھا۔ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اصغر شاہ شوکت کے بغیر گاڑی پر کہیں گئے ہوں۔

''ٹھیک ہے شاہ جی۔'' شوکت نے بس اتنا کہا اور قمیض کی جیب سے گاڑی کی چابی نکال کر اصغر شاہ کی طرف بڑھادی۔ انہیں شوکت کی یہ بات بہت پسند تھی کہ وہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا اور زیادہ سوال نہیں کرتا تھا۔

''چلو۔'' انہوں نے منگلا کو آنے کا کہا اور گیراج کی طرف بڑھ گئے۔ مراد ایک ہاتھ میں دیگچی پکڑے، نلکے کے پاس ہی کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد وہ حیران ہو کر شوکت کے پاس آگیا۔

''شوکت بھاء! ان دونوں کو ایسا کون سا ضروری کام پڑ گیا کہ چائے چھوڑ دی؟ چائے بھی کوئی چھوڑنے والی شے ہے؟''

''میں کیا جانوں مرادے! چل یار، مجھے تو چائے پلاناں'!

'شوکت نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بے تکلفی سے کہا تھا۔ مراد کے جانے کے بعد شوکت کچھ دیر تو وہیں کھڑا اپنی ٹھوڑی کو کھجاتا رہا، پر کندھے اچکا کر نلکے کی جانب بڑھ گیا۔ ڈیرے کے باہر سے گاڑی کے انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز گونجی تھی جو بتدریج دور ہوتی گئی۔

....☆....

''السلام 'علیکم....'' منال نے 'فرید اسٹور' میں داخل ہوتے ہوئے جھجک کر کہا، تو شیشے کی میز کے پیچھے کرسی پر ایک ٹانگ کو موڑ کر بیٹھا، ایک بال پین کو کان کے پیچھے اڑس کر تیز تیز انگلیوں سے کیلکولیٹر پر حساب کتاب کرتا ہوا فرید اسے دیکھ کر بوکھلا گیا۔ جلدی سے کھڑے ہونے کی کوشش میں کیلکولیٹر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا تھا۔ بدحواس ہوتے ہوئے وہ سیدھا کھڑا ہوا اور جلدی جلدی اپنے کپڑوں کی سلوٹیں ہاتھ سے ہٹانے کی ناکام کوششیں کرنے کے بعد تیزی سے انگلیاں بالوں میں پھیر کر انہیں سیٹ کرنے لگا۔

''وعلیکم السلام....آ....آپ یہاں؟'' حیرت اور خوشی فرید سے سنبھالے نہیں جا رہی تھی۔ منال نے چادر کو اپنے گرد کستے ہوئے نظریں جھکائیں۔

''وہ.....مجھے ایک فون کارڈ چاہیے تھا۔''

''جی جی....میں ابھی دیتا ہوں۔'' فرید نے گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ منال خاموشی سے اس کی بدحواسیوں کو دیکھ رہی تھی۔

''اوہ.....یہ ہیں!'' فرید نے کارڈز کا ایک بنڈل اٹھایا جو ایک ربڑ بینڈ کی مدد سے ایک دوسرے کے اوپر ٹکے ہوئے تھے۔ پھر ان میں سے ایک کارڈ نکالا اور منال کی طرف بڑھا دیا۔ منال نے اسے اپنے پرس میں رکھ کر پیسے نکالنے چاہے تو فرید فوراً پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

''او میں نے کہا، کیا کر رہی ہیں جی؟ ہماری محلے داری ہے....اور میں محلہ داروں سے پیسے نہیں لیتا''!

"محلہ داری....؟" منال حیران ہوئی۔

"ہاں جی.... مم مطلب کہ... ہماری دکان اور آپ کی یونیورسٹی... میرا مطلب ہے کہ ایک ہی محلے میں ہے ناں... تو پھر ہماری محلے داری ہی ہوئی ناں"!

فرید کی گھبراہٹ ختم ہو گئی تھی۔

"لیکن پھر بھی...." منال نے دوبارہ پیسے اس کی طرف بڑھائے۔

"نہیں جی..... مجھے شرمندہ نہ کریں آپ..... چاچا اسحاق کو میں نے زبان دی تھی کہ میں آپ کا خیال رکھوں گا۔ تو جن کا خیال رکھتے ہیں، ان سے پیسے کون لیتا ہے...؟ بتائیں آپ...؟" فرید نے بات سے بات نکالنا چاہی تاکہ منال کچھ دیر اور وہاں رک جائے۔

"چلیں، آپ کا شکریہ.... منال نے پیسے واپس پرس میں ڈالتے ہوئے کہا تھا، جسے سنتے ہی فرید کے ارمانوں پر دس من وزنی اوس پڑ گئی تھی۔

"کوئی بات نہیں....."

اس نے منمناتی ہوئی آواز میں کہا اور منال پرس اٹھا کر دکان سے باہر نکل گئی۔ اس نے ہاسٹل میں لگے فون بوتھ سے ماسی بشیراں کے گھر فون کیا تھا۔ پورے گاؤں میں کمال کا ہی گھر تھا جہاں فون لگا ہوا تھا، وہ بھی کمال نے پی ٹی سی ایل والوں کو کہہ کہہ کر لگوایا تھا تاکہ دبئی سے گھر والوں سے رابطہ رکھ سکے۔

"سلام ماسی جی..."!!

"میں کہیا، والیکم سلام...!" ماسی نے 'وعلیکم السلام' کو اپنے مخصوص لہجے کے ساتھ ادا کرتے ہوئے گرم جوشی سے کہا۔ وہ منال کی آواز فوراً پہچان گئی تھیں۔ "نی کی حال اے تیرا دھیے؟"

"میں ٹھیک ہوں ماسی... تُو کیسی ہے؟" منال نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"چنگی آں میں وی۔ راشدہ آئی بیٹھی اے...." ماسی بشیراں نے یہ کہتے ہوئے فون کے ریسیور سے منہ ہٹا کر غالباً راشدہ کو بتایا تھا۔ راشدہ ماسی بشیراں کی بھتیجی تھی جو دو سال پہلے بیاہ ہو کر جہلم کے ایک گاؤں چلی گئی تھی۔

''منال دا فون اے لہور توں...آہو، اسحاق دی کڑی......'' جواب میں راشدہ نے نہ جانے کیا کہا تھا، ماسی بشیراں نے اسے ''...آہو....'' میں جواب دے کر دوبارہ منال کی طرف توجہ کی تھی۔

''ہور سنا منال؟ کی حال اے؟''

ماسی بشیراں کی عادت تھی کہ جملے کے آخری لفظ کے آخری حرف کو ہمیشہ کچھ اس طرح ادا کرتی تھی کہ سننے والے کو لگتا تھا، وہ حرف کچھ اٹھلاتا ہوا، لہراتا ہوا ان کی زبان سے نکلا ہے۔ منال کو ان کا یہ انداز بڑا پسند تھا لیکن فی الحال وہ فون بوتھ کی سکرین پر نظریں جمائے بیٹھی تھی جہاں تیزی سے پیسے گر رہے تھے۔

''ماسی! ابا کو پیغام دے دے گی کہ جمعرات کو میرے ساتھ کچھ مہمان آئیں گے؟''

اس نے کام کی بات کرنا چاہی۔

''ہورے، کیڑھے مہمان؟'' ماسی بشیراں نے حیرت اور تجسس سے پوچھا۔

''وہ.....میری سہیلی ہے، اس کے ساتھ اس کا ابا ہو گا۔'' منال کو الوینہ کے ڈیڈی کے لیے 'ابا' کا لفظ اتنا عجیب سا لگا۔

''ابا غریبوں کا ہوتا ہے، امیروں کے تو 'ڈیڈی' ہوتے ہیں!'' اس نے سوچا لیکن یہ وقت ایسی باتیں سوچنے کا نہیں تھا۔

''خیری نال آئیں گے...؟'' ماسی بشیراں کا ماتھا ٹھنک گیا تھا۔ اسی وقت منال کو ماسی بشیراں کے عقب سے سٹیل کے برتن گرنے کی زوردار آواز آئی۔

''آئے ہائے...! خسماں کو کھائے یہ بکرا....! فیر رسی تڑوا کے پانڈے وچ وڑ گیا اے!! او راشدہ!!! پھڑیں اینوں....''!

اور اس شور کے ساتھ ہی منال کے فون کارڈ میں پیسے ختم ہو گئے!

ماسی بشیراں نے راشدہ کے ساتھ تعویز لینے کے لیے گاؤں کے باہر بنے بابا ملنگ کے مزار پر جانا تھا تاکہ راشدہ کا شوہر دوسری زنانیوں کے چکر میں نہ پڑے، اس لیے ماسی بشیراں نے گلی میں گلی ڈنڈا کھیلتے عادل کو بلایا اور اسے منال کا پیغام دے کر بابا اسحاق کے گھر بھیج دیا۔ وہ دوڑا دوڑا گیا، دروازے پر کھڑے

کھڑے پیغام نشر کیا اور پھر دوڑتا ہوا واپس اپنے دوستوں کے ساتھ کھیل میں مگن ہو گیا۔

"انہوں نے کیوں آنا ہے اِدھر..؟" صحن میں جھاڑو لگاتی اماں نے حیرت سے ابا کو دیکھا تھا۔

"اللہ جانے...!" ابا نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ خود بھی الجھے ہوئے تھے کہ بیٹھے بٹھائے ان دونوں باپ بیٹی کو کیا سوجھی کہ ان کے غریب خانے آنا چاہ رہے ہیں۔

"اللہ خیر کرے.." اماں وہیں جھاڑو زمین پر رکھ کر سوچنا شروع ہو گئی تھیں کہ منال کی شہری سہیلی اور اس کے باپ کے شایان شان کیسے انتظامات کرے۔

جمعرات کا دن آ پہنچا تھا۔ جہاں منال پریشان تھی کہ الوینہ اس کا گھر اور مالی حالات دیکھ کر نہ جانے کیا سوچے، وہیں الوینہ پر جوش تھی کہ وہ پہلی دفعہ کسی گاؤں کو حقیقی زندگی میں دیکھنے جا رہی تھی۔

"منال....." کسی نے اسے پکارا تھا۔

"جی.....؟" منال نے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا جہاں الوینہ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ہلکے گلابی رنگ کی قمیض اور سفید شلوار پہنی ہوئی تھی۔ کندھے پر ایک جانب سفید اور نیلے رنگ کا شیفون کا دوپٹہ لٹک رہا تھا۔ پہلی دفعہ منال نے اسے روایتی پاکستانی لباس میں دیکھا تھا۔

"بہت پیاری لگ رہی ہیں"!

وہ تعریف کیے بغیر نہ رہ سکی، جواب میں الوینہ ہنس پڑی: "یہ میں نے تمہارے گاؤں جانے کے لیے خاص طور پر خریدا تھا۔ I can imagine اگر میں وہاں پینٹ شرٹ یا سلیولیس شرٹ میں جاتی تو کتنی آکورڈ لگتی۔"

"جی....، یہ تو ہے۔" منال نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا، وہاں اگر مجھ سے کوئی گڑبڑ ہو ناں، تو پلیز مجھے فوراً بتانا ہے تم نے..... میں فرسٹ ٹائم کسی گاؤں جا رہی ہوں ناں، تو مجھے پتا نہیں ہے کہ گاؤں میں لوگوں کا رہن سہن، برتاؤ کیسا ہو گا۔ ایسا نہ ہو وہاں سب میری حرکتیں دیکھ کر ہنسنے لگیں۔" اس کی فکر جان کر منال ہنس پڑی۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ وہاں بھی انسان ہی رہتے ہیں... بس...."

منال نے الوینہ کے پاؤں کی جانب اشارہ کیا جو ہائی ہیل کے نازک سے سینڈل میں مقید تھے۔

''آپ اتنی ہائی ہیل پہن کر وہاں کے کچے راستوں پر چل نہیں پائیں گی۔''

''اوہ.....'' منال کی بات سن کر الوینہ نے پریشانی سے اپنے سینڈلوں کو دیکھا اور پھر ہنس پڑی:

''صحیح کہہ رہی ہو منال...! میں ابھی انہیں چینج کر لیتی ہوں۔'' یہ کہہ کر الوینہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

....☆....

گاڑی ابھی سکول کے گراؤنڈ کے سامنے سے گزر رہی تھی کہ گراؤنڈ کی طرف جاتے ہوئے بلال اور عمر کی اس پر نظر پڑی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اصغر شاہ اور برابر کی سیٹ پر منگلا بیٹھے ہوئے تھے۔

''انکل اور منگلا کہاں جا رہے ہیں؟'' بلال نے بیٹ کو زمین سے ٹکاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''پتا نہیں۔ ابو نے کوئی ذکر تو نہیں کیا تھا۔'' عمر نے بے پروائی سے گیند کو ہوا میں اچھالتے ہوئے کہا۔ اچانک بلال کو اصغر شاہ اور منگلا کے درمیان ہونے والی گفتگو یاد آ گئی جو اس نے کچھ عرصہ پہلے سنی تھی۔ گاڑی وہاں سے جا چکی تھی۔

''یار عمر... ایک بات تو بتاؤ''!

''کیا...؟''

''یہ منگلا بھائی... یہ تمہیں ٹھیک لگتے ہیں کیا؟'' بلال نے سوال کو گھمایا۔

''مطلب...؟'' عمر نے گیند کیچ کرتے ہوئے بھنویں سکیڑیں۔

''مطلب یہ.... منگلا بھائی نے تم سے کبھی کوئی عجیب سی بات کی ہے؟'' بلال کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح عمر سے پوچھے۔

''انہوں نے تو کبھی نہیں، البتہ تم عجیب سی باتیں کر رہے ہو۔'' عمر ہنسا تو بلال کو بھی زبردستی مسکرانا پڑا۔ اسے اپنے اباجی میاں عبدالکریم کی بات یاد آ گئی تھی جو انہوں نے برطانیہ جانے سے پہلے اس سے کی تھی۔

”بیٹا! میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ منگلا کی حقیقت کیا ہے۔ مجھے برطانیہ جانا پڑ رہا ہے ورنہ میں ضرور اس کے بارے میں تحقیق کرتا۔ لیکن تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم منگلا کی حرکتوں پر نظر رکھو گے۔“

انہوں نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا:

” یہ موضوع اتنا حساس ہے کہ میں بغیر تصدیق کے، منگلا کے بارے میں کوئی بات نہیں کہہ سکتا لیکن تمہیں جیسے ہی کوئی گڑبڑ لگے یا تم سے یا عمر سے منگلا اس قسم کی کوئی بات کرے تو تم نے مجھے یا سر سعید کو ضرور اس کے بارے میں بتانا ہے۔ ٹھیک ہے؟“

”ٹھیک ہے ابا جان۔“ بلال نے پر اعتماد لہجے میں کہا تھا۔

”لیکن ایک بات یاد رکھنا.... تم نے خود سے کبھی بھی منگلا سے اس موضوع پر بحث نہیں کرنی....اب بتاؤ، میں اپنے بیٹے پر بھروسہ کر سکتا ہوں؟“

انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”جی ابا جان...“ بلال نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو باپ نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔

اور اب بلال کے سامنے اصغر شاہ اور منگلا کہیں گئے تھے اور کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئے ہیں۔ گاڑی میں کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔

”شاہ جی، ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ آخر منگلا نے پوچھا تھا۔ اصغر شاہ نے گاڑی بڑی سڑک پر ڈال دی تھی۔

”مسجد...“ اصغر شاہ نے مختصر جواب دیا۔ منگلا نے حیرت سے ان کی جانب دیکھا۔

”مسجد؟ لیکن وہ کس لیے...؟“

”امام صاحب ہی میرے سوالوں کے جواب دے سکتے ہیں، وہ سب سوال جو تم نے میرے ذہن میں ڈالے ہیں اور اب ہر وقت میرے ذہن میں گونجتے رہتے ہیں۔“ اصغر شاہ نے سڑک پر نظریں جمائے جواب دیا تھا۔ ان کے لہجے میں ہلکا سا اضطراب تھا۔

”لل... لیکن شاہ جی...!!“ منگلا گھبرا کر بولا: ”اس طرح تو مسجد میں موجود لوگوں کو مجھ پر شک

ہو جائے گا۔ میری جان بھی جا سکتی ہے۔آپ کو پتا تو ہے کہ لوگ ہمارے بارے میں بات بعد میں کرتے ہیں اور قتل پہلے۔"

"فکر نہ کرو..." اصغر شاہ نے کہا۔"میں اسی لیے اپنے علاقے کی مسجد میں نہیں گیا تاکہ تمہارے لیے کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔ میں کسی ایسی مسجد میں جانا چاہتا ہوں جہاں کوئی ہم دونوں کو نہ جانتا ہو۔"

"ٹھیک ہے شاہ جی..." منگلا نے مری مری سی آواز میں کہا۔

"تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تحقیق کریں، سوال کے جواب ڈھونڈیں۔ اب میں یہی تو کر رہا ہوں۔ تم پریشان کیوں ہو رہے ہو؟" اصغر شاہ نے اسے دیکھا۔

"نہیں شاہ جی، ایسی بات نہیں ہے۔" منگلا نے جلدی سے کہا:

"بے شک تحقیق کرنا آپ کا حق ہے، بلکہ ہمارے مربیوں کا تو یہی کہنا ہے کہ لوگ پوری طرح تسلی کر کے جب ہماری جماعت میں شامل ہوتے ہیں تو ان کا ایمان ہم سے بھی زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ بس مجھے اس بات کی فکر ہے کہ جس سے بھی آپ اس موضوع پر بات کریں گے، وہ کہیں آپ کو بھی ہماری طرح کافر نہ کہنا شروع کر دے۔آپ کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک نہ کیا جائے جیسا ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔ کیونکہ جو بھی ہمارے بارے میں تحقیق کرتا ہے، اسے بھی ہمارا ہی ساتھی سمجھا جاتا ہے۔" منگلا نے تحفظات کا اظہار کیا۔

"نہیں، ایسا کچھ نہیں ہو گا۔" اصغر شاہ نے کہا تھا۔

دوسری طرف منگلا دل میں خوف محسوس کر رہا تھا:

"اف! اب میں کیا کروں؟ اتنی مشکل سے شاہ جی کو اپنی طرف کرنا شروع کیا ہے، وہ مولوی سارا کام خراب نہ کر دے۔"!

اس کا دل گھبرا رہا تھا لیکن اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اصغر شاہ نے گاڑی سیٹلائٹ ٹاؤن کے قریب بنی ایک مسجد کے سامنے روک دی۔

"شاہ جی! پلیز.... کسی کو پتا نہ چلے کہ میں..." منگلا کچھ جھجک سا گیا۔

"مجھ پر تسلی رکھو منگلا... !! کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں کسی کو مشکل میں ڈالنے کا سوچ سکتا ہوں؟"

اصغر شاہ نے کچھ چڑ کر جواب دیا تھا۔ منگلا خاموش ہو گی اور ان کی معیت میں مسجد میں داخل ہو گیا۔ مسجد میں اکا دکا ہی لوگ تھے۔

"السلامُ علیکم بھائی صاحب!" اصغر شاہ نے ایک بندے کو مخاطب کیا تھا جو کندھے پر سفید صافہ رکھے مسجد سے نکلنے ہی والا تھا۔

"وعلیکم السلام... جی..؟"

"امام صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"وہ کسی کام سے باہر گئے ہیں۔ آپ تھوڑی دیر انتظار کر لیں، وہ آتے ہی ہوں گے۔"

اس بندے نے کہا تو اصغر شاہ 'شکریہ' کہہ کر منبر کے قریب قالین پر دوزانو ہو کر بیٹھ گئے اور سر جھکا لیا۔ منگلا بھی ان کے قریب ہی بیٹھ گیا اور کن اکھیوں سے اصغر شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ زیرِ لب کچھ پڑھ رہے تھے۔

....☆....

جیپ اب منال کے گاؤں میں داخل ہو گئی تھی اور ہچکولے کھاتی ہوئی کچی گلیوں میں سے گزر رہی تھی جہاں سیور یج اور بارش کے پانی کی وجہ سے کہیں کہیں کیچڑ بنا ہوا تھا۔ جیپ میں ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر الوینہ کے ڈیڈی بیٹھے ہوئے تھے جبکہ الوینہ اور منال پیچھے کی نشستوں پر تھیں۔ منال کے لیے تو یہ مناظر پیدائش سے ہی دیکھے بھالے تھے البتہ الوینہ کے لیے سب کچھ نیا تھا۔ وہ جیپ کے شیشے سے ناک ٹکائے پرُشوق نگاہوں سے باہر دیکھ رہی تھی۔

ایک کچے گھر کے دروازے پر کپڑے کی بنی چادر ہوا کے دوش پر لہرا رہی تھی اور اس کے پٹ کو ایک ہاتھ سے تھامے اور دوسرے ہاتھ کی شہادت کی انگلی کو اپنے سامنے کے دانتوں پر ٹکائے، منہ کھولے ایک دو ڈھائی سال کا ننگ دھڑنگ بچہ حیرت سے ان کی جیپ کو گھور رہا تھا۔

"O my God!!! that kid doesn't have anything on!!!"

اچانک تعجب، حیرانی اور جھینپی ہوئی ہنسی کے ساتھ الوینہ نے کہا اور نظریں پھیر لیں۔ منال شرمندہ سی ہو گئی۔ ڈرائیور مسکرایا تھا اور ڈیڈی نے قہقہہ لگایا تھا۔

"بس کچھ مائیں اس طرف اتنا دھیان نہیں دیتیں۔" منال نے صفائی دینے کی کوشش کی۔

"اِٹس او کے منال! الوینہ پہلی دفعہ یہ سب دیکھ رہی ہے اس لیے اسے حیرت ہو رہی ہے۔ ڈونٹ

وری۔"

ڈیڈی نے بائیں بازو کی کہنی کو شیشے کی درز پر ٹکائے ہوئے جواب دیا تھا۔

جیپ نے ایک موڑ کاٹا تو سامنے ایک میدان تھا جسے جانوروں کے باڑے کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ ڈرائیور اب بہت احتیاط سے میدان کے درمیان سے گزر رہا تھا جس کے دونوں جانب گائیں اور بھینسیں بندھی تھیں۔ کچھ جگالی کر رہی تھیں اور کچھ ڈکرا رہی تھیں۔ الوینہ نے شیشہ نیچے کر کے انہیں غور سے دیکھنا چاہا لیکن جیسے ہی شیشہ تھوڑا سا نیچے ہوا، گوبر کی ناگوار بدبو فوراً جیپ کے اندر داخل ہوئی۔

"Ewww!!!" الوینہ نے ناک پر ہاتھ رکھتے ہوئے فوراً ناگواری کا اظہار کیا اور تیزی سے شیشہ اوپر کر لیا۔ منال ایک دفعہ پھر شرمندہ ہو گئی لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔ ڈرائیور نے ایک ہاتھ سے اسٹیرئینگ ویل سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے گئیر کے قریب رکھا ہوا ائیر فریشنر اٹھایا اور جیپ میں اسپرے کر دیا۔ جیپ میں چنبیلی اور آرچڈ کی بھینی سی مہک پھیل گئی تھی جس نے گوبر کی بو کو دبا دیا تھا۔

"بس، وہ موڑ مڑیں تو کونے والا گھر ہمارا ہے۔" منال نے سامنے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جاوید اور بابا اسحاق گھر کے باہر ہی کھڑے تھے۔ بابا اسحاق کے چہرے پر اضطراب اور بے چینی نمایاں تھی۔ جاوید بظاہر نارمل تھا لیکن دل میں وہ بھی مہمانوں اور ان کی کالی جیپ سے مرعوب تھا۔

ڈرائیور نے جیپ گھر کے باہر شہتوت کے درخت کی چھاؤں میں کھڑی کر دی تھی۔ جیپ کے رکتے ہی جاوید اور بابا اسحاق ان کی طرف لپکے۔

"یہ میرے ابا اور بھائی ہیں۔" منال نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے تعارف کروایا۔ جیپ سے قدم باہر رکھتے ہی اسے بے ساختہ اپنے گھر والوں پر پیار آیا۔ وہاں کی زمین نم تھی جس کا مطلب تھا کہ گھر والوں نے ان کے آنے سے کچھ ہی دیر پہلے وہاں پانی کا چھڑکاؤ کیا تھا تا کہ گیلی ریتلی زمین پر مہمان جم کر پاؤں رکھ پائیں اور غبار ان کی آنکھوں کو تنگ نہ کرے۔

الوینہ کے ڈیڈی جیپ سے باہر نکلے لیکن پھر اچانک بوکھلا گئے۔ بابا اسحاق نے تیزی سے آگے بڑھ کر ،رکوع کی حالت جتنا جھکتے ہوئے انہیں سلام کیا تھا۔

"ارے ارے...... وعلیکم السلام.... کیا کر رہے ہیں آپ؟ ایسا نہ کریں پلیز...." انہوں نے بابا اسحاق کو کندھوں سے پکڑ کر سیدھا کرتے ہوئے کہا تھا۔ بابا کے عقب میں کھڑے جاوید نے بھی ہاتھ ماتھے تک لے کر انہیں سلام کیا۔

الوینہ تب تک جیپ سے اتر کر اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔ تین طرف سے فصلوں میں گھرا ہوا منال کا گھر اینٹوں اور گارے سے بنا ہوا تھا۔

"یہاں کی ہوا کتنی فریش ہے"!!

الوینہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے ہوا کو اپنے اندر اترتے اور ہر مسام کو تازہ دم ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ جاوید نے اس کی آواز سن کر نظر اٹھا کر الوینہ کی طرف دیکھا اور اس کے حسن کے رعب سے اتنا متاثر ہوا کہ دوسری نظر ڈالنے کی جرات نہ کر سکا۔

"جاوید! پروہنوں کو اندر لے کے جاناں!" بابا اسحاق مرعوبیب سے بھرپور لہجے میں بولے اور پھر الوینہ کے ڈیڈی کو کہنے لگے:

"آجاؤ تسی..... اندر آجاؤ....." اس کے ساتھ ہی وہ تیز قدموں سے بیٹھک کی طرف بڑھے تھے۔

"او نیک بختے..... پردہ کرلے...... مہمان آگئے نے..."!

....☆....

"امام صاحب! کچھ سوال ہیں جنہوں نے میری نیند اڑا دی ہے۔"

گندمی رنگت اور سیاہ داڑھی والے، قدرے فربہ مائل امام صاحب آچکے تھے اور اب وہ تینوں مسجد کے ایک کونے میں بیٹھے تھے۔

"پوچھیں... میری پوری کوشش ہوگی کہ آپ کو تسلی بخش جواب دے سکوں۔" امام صاحب نے جواب دیا تھا۔

"امام صاحب....!" اصغر شاہ نے کہنا شروع کیا۔ منگلا کی تمام حسیات الرٹ ہوگئی تھیں:

"کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہوگئے تھے اور وہ کشمیر میں دفن ہیں۔"

ابھی انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ امام صاحب کے چہرے کی نرمی یکدم دور ہوگئی۔ان کے چہرے کے تاثرات میں سختی آگئی تھی۔

"اس بات کو وہ قرآن کی کچھ آیتوں سے ثابت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ یعنی مسیح کے بارے میں کوئی ایک بھی آیت ایسی نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ زندہ ہیں۔آپ میری رہنمائی فرمائیں کہ کیا واقعی قرآن میں حضرت عیسیٰ کی وفات کا ذکر ہے؟اور جن کے بارے میں احادیث میں ہے کہ وہ دوبارہ زمین پر آئیں گے تو کیا وہ کوئی اور...." ابھی اصغر شاہ کا جملہ مکمل بھی ہوا تھا کہ امام صاحب نے قدرے سختی سے ان کی بات کاٹی۔

"استغفر اللہ...! محترم!! مجھے آپ یہ بتائیں کہ کیا آپ اتنے ہی سادہ ہیں جتنے نظر آرہے ہیں یا سادہ بننے کی اداکاری کررہے ہیں؟ '

ان کی بات سن کر اصغر شاہ اور منگلا دونوں ہی ہکا بکا رہ گئے۔

"کیا مطلب...؟"

"مطلب یہ کہ آپ ڈھکے چھپے الفاظ میں اس بدبخت جماعت کے موقف کو بیان کررہے ہیں جسے حکومت غیر مسلم قرار دے چکی ہے۔ بحیثیت مسلمان حضرت عیسیٰ کے زندہ آسمان پر اٹھا لیے جانے اور دوبارہ نزول کے بارے میں آپ کو تو کوئی ابہام ہونا ہی نہیں چاہیے، کجا یہ کہ آپ سوال اٹھا کر میرے پاس آگئے ہیں!" امام صاحب کا لہجہ تلخ تھا۔

آج تک اصغر شاہ سے کسی نے ایسے لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ان کا چہرہ خفت کے مارے سرخ ہونا شروع ہوگیا لیکن انہوں نے تحمل سے کہا:

"امام صاحب! لیکن وہ تو قرآن کی آیتیں سامنے رکھ دیتے ہیں۔ جیسے وہ کہتے ہیں کہ سورۃ آل عمران کی آیت نمبر پچپن میں اللہ تعالیٰ...." امام صاحب نے ان کی بات دوبارہ کاٹی: "آپ مسلمان ہیں ناں؟"

"جی ہاں، الحمدللہ۔" اصغر شاہ کو اس غیر متوقع سوال پر حیرت ہوئی۔

"لگ تو نہیں رہے۔" امام صاحب نے اطمینان سے کہا تھا۔ منگلا کی ساری پریشانی دور ہوتی جارہی

تھی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" اصغر شاہ کو بھی غصہ آگیا تھا۔

"مطلب یہ کہ اس جماعت کے کسی بندے نے یا کسی ان کی کسی کتاب نے آپ کے سامنے قرآن اور احادیث کی تفسیر پر سوال اٹھائے اور آپ اس گستاخ کو سبق سکھانے یا اس کتاب کو جلانے کے بجائے خاموشی سے ان فضول باتوں کو دل و دماغ میں اتارتے رہے اور پھر اس کی باتوں پر غور بھی فرماتے رہے؟ یہ مسلمانی ہے آپ کی؟" امام صاحب نے طنز سے بھرپور لہجے میں کہا تھا۔ منگلا دل میں مسکرا اٹھا۔

اپنی جذباتیت کی وجہ سے امام صاحب نے خود اس معاملے کو خراب کر کے منگلا کے کام کو آسان کر دیا تھا!

"کیونکہ میں جذباتیت سے نہیں، عقل اور دلیل سے بات کرتا ہوں۔" اصغر شاہ نے سرخ چہرے کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر جواب دیا تھا۔

"علامہ اقبال نے آپ جیسے منطق پسند لوگوں کے بارے میں ہی فرمایا ہے:

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

آپ کو کم از کم اپنے ایمان کو بچانے کے لیے عقل کو چھوڑ دینا چاہیے۔ ہر بات دلیل سے نہیں سمجھی جاتی۔"

امام صاحب نے دل جلا دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔ مسجد میں موجود دو تین لوگ ان کی گرم بحث سن کر ان کے پاس آکر بیٹھ گئے تھے۔

"لیکن میرے نزدیک ہر بات تحمل اور دلیل سے ضرور سمجھی جاسکتی ہے۔"

اصغر شاہ نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو امام صاحب کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"پھر اپنے ایمان کی حفاظت کیجیے محترم! اور یہ دلائل اور سوال کسی اور سے جا کر پوچھیے۔ ہمارے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ ہمارے حبیب حضرت محمد ﷺ نے جو ارشاد فرما دیا، وہ حق ہے۔" یہ کہتے

ہوئے امام احب نے اپنی انگلیوں کو چوم کر انہیں اپنی بند آنکھوں پر لگایا تھا۔

''بے شک، بے شک....'' ارد گرد بیٹھے لوگوں نے بھی عقیدت کے اظہار میں امام صاحب کی تقلید کی تھی۔

''کیسے انسان ہیں آپ! اس جماعت کے چنگل میں پھنس کر اپنے ایمان کو داؤ پر لگا رہے ہیں!'' ایک شخص نے ملامتی انداز میں اصغر شاہ کو کہا۔

''میں کسی کے چنگل میں نہیں پھنسا۔ مجھے کچھ جواب درکار تھے جو مجھے کم از کم اس مسجد سے نہیں ملے۔''

اصغر شاہ نے قدرے برہمی سے اس شخص کو جواب دیا۔

''ایسے لغو سوالوں کے جواب تو شاید ہی کوئی مسلمان دینا چاہے... ہاں البتہ ان احمدیوں سے جو تفسیر کروانی ہے، کروالو اور پھر اپنی عقل کے غرور میں ان کی تفسیر کو مان کر خود بھی ان میں سے ہو جانا..''

امام صاحب نے پھر جلی کٹی سی بات کہی تھی۔ اصغر شاہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''چلو منگلا...'' منگلا بھی فوراً کھڑا ہوا گیا۔ دونوں لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے مسجد کے دروازے کی جناب بڑھ گئے۔

''مجھے تو یہ دونوں اسی جماعت کے بندے لگ رہے ہیں۔'' پیچھے کسی نے باآواز بلند کہا تھا۔ سبھی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

''اس جماعت کے مرزے پر تو...!!'' پیچھے جوش میں بھرے امام صاحب لعنت بھیجنا شروع ہو گئے تھے۔

....☆....

اصغر شاہ نے غصے میں گاڑی کو تیزی سے وہاں سے موڑا تھا اور اب اس علاقے سے نکل کر ایک گلی میں گاڑی روک دی تھی۔ منگلا نے ان کی جانب دیکھا۔

''بات کرنے کی تمیز نہیں ہے، منبر کا احترام نہیں ہے اور امام مسجد بنے بیٹھے ہیں...''

شدت جذبات سے اصغر شاہ کی آواز رندھ سی گئی تھی:

''میں نے کیا غلط بات پوچھ لی تھی ان سے؟ اگر ان کے پاس جواب نہیں تھا تو تمیز سے انکار کر دیتے، اور اگر جواب تھا تو طریقے سے بتا دیتے، ہم بات چیت کرتے اور مجھے سکون مل جاتا... لیکن اس نے الٹا مجھے ہی سنانا شروع کر دیا جیسے سوال کر کے میں نے کوئی بہت بڑا گناہ کر دیا ہے۔''

ان کا دل بھرا بیٹھا تھا۔ منگلا خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا اور وہ دل کی بھڑاس نکالتے رہے:

''مسجد تو اللہ کا گھر ہوتا ہے جہاں سے ہدایت ملتی ہے۔ میں بھی تو ہدایت کی طلب میں گیا تھا لیکن مجھے آگے سے کیا ملا ہے؟''

بات کرتے کرتے اچانک اصغر شاہ نے چونک کر منگلا کی جانب دیکھا۔ ''میں وہاں ہدایت کے لیے گیا تھا... اور جس طرح آگے سے میرے ساتھ برتاؤ کیا گیا، کیا یہ ہدایت ہی کی نشانی تو نہیں؟ یہ اس بات کا اشارہ تو نہیں کہ مجھے ہدایت یہاں سے نہیں مل سکتی۔؟''

''شاہ جی... !ایک بات کہوں؟'' منگلا نے ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنی بات کو جاری رکھا:

''آپ کو ڈاکٹری کا علم سیکھنا ہے تو وہی آپ کو سکھا سکتا ہے جسے اس علم پر عبور حاصل ہو، اسی طرح آپ کا اگر اسلام کا علم سیکھنا ہے تو اس کے لیے آپ کو کسی امام صاحب کے پاس جانے کی نہیں ہے، وہ امامت کے لیے ہیں، اسلام سکھانے کے لیے نہیں۔ اصل اسلام کو سیکھنا ہے تو عالم کے پاس چلیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو منگلا... ! ! میں غلط جگہ چلا گیا تھا۔'' اصغر شاہ نے سر ہلایا تھا:

''مجھے افسوس ہے منگلا! اگر مجھے صرف سوال کرنے پر اتنی لعن طعن سننے کو ملی تو تم لوگوں کا یہ کیا حال کرتے ہوں گے''!

''ہمیں زندہ چھوڑیں تب ناں... !'' منگلا تلخی سے مسکرایا:

''ہمارا تو زندہ رہنا بھی ان لوگوں کے نزدیک حرام ہے... خیر... ہر ایک اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ اگر کسی پر لعنت بھیج کر ان کے نزدیک بات بن جاتی ہے تو انہیں لعنت بھیجنے دیں۔ ہم اس کے عادی ہیں۔ چھوڑیں ان باتوں کو، میں ایک عالم صاحب کو جانتا ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کو اپنے سوالوں

کے مکمل تسلی بخش جواب مل جائیں گے اور درست راستے کا انتخاب کرنا آپ کے لیے بہت آسان ہو جائے گا۔"

منگلا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا، گاڑی کو ایک قادیانی مربی کے ٹھکانے کی سمت موڑ چکا تھا۔

....☆....

الوینہ منال کو اپنے کمرے میں لے گئی اور بابا اسحاق اور جاوید الوینہ کے ڈیڈی کے ساتھ بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ اللہ کا کرم تھا کہ اس دن خزاں کی نرم گرم سی ہوا چل رہی تھی، اس لیے الوینہ اور اس کے ڈیڈی کو محسوس نہیں ہوا اور نہ بجلی کے بغیر ان کا گزارا بہت مشکل ہو جاتا۔

پورے گاؤں میں صرف کمال کا گھر تھا یا باؤ فضل کی دکان جہاں بجلی میسر تھی۔ بابا اسحاق نے نے باؤ فضل کو سویرے ہی کہہ دیا تھا کہ جیسے ہی اسے مہمانوں کی جیپ نظر آئے، اس نے فوراً سے پیشتر کالے رنگ والی ٹھنڈی بوتلیں گھر پہنچا دینی ہے۔

باؤ فضل نے بھی پھرتی دکھائی تھی اور ابھی جیپ بابا اسحاق کے گھر سے چار گلیاں دور تھی کہ باؤ فضل نے اپنی سائیکل پر بوتلوں کے شاپر کو لٹکایا اور تیز تیز پیڈل مارتا ہوا بابا اسحاق کے گھر پہنچ گیا۔ اس کا دل تو بڑا تھا کہ مہمانوں سے مل کر ہی جائے، لیکن پھر سوچا کہ کہیں مہمانوں کو برا ہی نہ لگ جائے، اس لیے ان کے آنے سے پہلے ہی وہاں سے چلا گیا۔

الوینہ کے ڈیڈی کرسی پر بیٹھے تھے جس کی پشت پر اماں نے اپنے جہیز کی پیٹی سے کڑھائی والا کپڑا نکال کر ڈالا ہوا تھا اور کرسی کی نشست کر آرام دہ بنانے کے لیے اس پر چھوٹا سا ایک تکیہ رکھا ہوا تھا۔ کرسی کے آگے لکڑی کا ایک میز تھا جس کے اوپر اماں ہی کی پیٹی میں نہ جانے کب سے بند، زنجیری کڑھائی سے سجا ہوا میز پوش نکال کر بچھایا گیا تھا۔ میز کے دوسری جانب دوسری کرسی تھی۔

"بہت خوشی ہوئی جی، آپ ہمارے غریب خانے پہ آئے ہیں۔"

جاوید کولڈ ڈرنک کی ٹرے لینے باورچی خانے گیا ہوا تھا اور بیٹھک میں عجیب بے آرام اور تکلف والی

خاموشی پھیلی ہوئی تھی جب بابا اسحاق نے خاموشی توڑنے کی غرض سے بات کی: ''میرا نام اسحاق ہے جی، سب مجھے یہاں ساکو کہتے ہیں۔''

''اور میرا نام رستم ہے۔'' الوینہ کے ڈیڈی نے نرم لہجے میں جواب دیا تھا: ''رستم رئیس....''!

جواب میں بابا اسحاق صرف مسکرا کر رہ گئے تھے۔

''اجی ....پانی پیو جی ... بڑا سفر کر کے آئے ہیں آپ لوگ..'' یہ کہتے ہوئے بابا اسحاق نے کولڈ ڈرنک کی ٹرے رستم رئیس کے آگے سرکا دی۔

دوسری طرف الوینہ دلچسپی سے کمرے کو جبکہ منال کی اماں دلچسپی سے الوینہ کو دیکھے جا رہی تھیں۔ایسے میں الوینہ نے خاموشی توڑی:

''ارے منال...! تمہارا کمرہ کتنا سمپل اور کتنا آرام دِہ ہے۔'' الوینہ نے اس کے کمرے تعریف کی تھی لیکن منال کو لگا کہ الوینہ نے بس اس کا دل رکھنے کے لیے یہ کہا ہے۔ سو منال خاموش رہی۔اُسے دل پر ایک بوجھ اور اداسی سی محسوس ہو رہی تھی۔

''یہ پھول بوٹے منال نے خود کاڑھے تھے۔'' اماں نے الوینہ کی دلچسپی بھانپتے ہوئے ایک پیٹی کے اوپر بچھی ہوئی سفید چادر کا پلو پکڑتے ہوئے کہا۔ پلو پر سندھی ٹانکے سے سرخ رنگ کی بوٹیاں بنی ہوئی تھیں۔

''واؤ!!.... منال۔تم نے مجھے کبھی بتایا نہیں کہ تمہیں یہ کام بھی آتا ہے۔'' الوینہ اٹھ کر چادر کے پاس چلی گئی تھی اور اب غور سے ان بوٹیوں کو دیکھ رہی تھی۔

''I am very impressed!''

''اچھا یہ کولڈ ڈرنک تو پی لیں۔ باقی باتیں بعد میں کر لینا۔'' منال نے اس کی توجہ کمرے کی چیزوں سے ہٹانا چاہی تھی۔

بیٹھک میں بابا اسحاق اور رستم رئیس کی بات چیت ہو رہی تھی اور زنان خانے میں اماں کرید کرید کر الوینہ سے اس کے گھر اور خاندان کے بارے میں سوال کر رہی تھیں۔ منال کچھ دیر تو کوفت کے مارے

بیٹھی رہی لیکن جب اماں نے الوینہ سے اس کی ماں کے بارے میں بات کرنی چاہی تو منال نے مداخلت لازمی سمجھی۔

"اماں!! بات سنو...." یہ کہہ کر منال کمرے سے نکل کر باورچی خانے چلی گئی تو اماں کو بھی بادل نخواستہ اٹھنا ہی پڑا۔

"یہ کیا شروع ہو گئی ہو تم.....؟ وہ کیا سوچ رہی ہو گی کہ پہلی دفعہ ہمارے گھر آئی ہے اور اس سے تم کیسے سوال پوچھ رہی ہو۔" باورچی خانے میں منال نے دبے لہجے میں اماں سے ناراضی کا اظہار کیا۔

"ہاہائے...نی کی ہو گیا جے۔!" اماں کو اس کا یوں ٹوکنا برا لگا۔

"نہ تو میں نے کون سا کوئی غلط بات پوچھ لی جو تُو یوں مجھے کھری کھری سنا رہی ہے..؟ تجھے کیا پتا کہ گھر آئے مہمانوں کی کیسے سیوا کرتے ہیں...؟ ماں باپ کا حال پوچھا جاتا ہے.... کوئی فوت ہو گیا ہو تو افسوس کرتے ہیں..." اماں نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

"لیکن اماں...!! شہروں میں ایسا نہیں ہوتا۔"!

منال کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اماں کو کیسے میل ملاپ کے شہری اور دیہاتی طریقوں میں فرق سمجھائے۔

"لے فر خود ہی اس سے باتیں کر..... میں ہُون کچھ نئیں بولاں گی۔"

اماں شاید ناراض ہو گئی تھیں۔ منال کچھ لمحے تو خاموش رہ کر سوچتی رہی کہ اماں کو سمجھائے یا منائے۔ پھر اس نے دونوں ہی باتوں کو ملتوی کر دیا کہ اس کے پاس ابھی اماں کو سمجھانے کا وقت تھا نہ منانے کا۔ اس نے واپس کمرے میں جا کر چپ چاپ الماری سے برتن نکالنے شروع کر دیے۔

"میں کوئی ہیلپ کرواؤں منال...؟" الوینہ نے گلاس خالی کر کے واپس ٹرے میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ارے.. نہیں نہیں......آپ آرام سے بیٹھو یار۔" منال نے فوراً اسے منع کیا تھا۔

....☆....

وہ ایک دو منزلہ کشادہ گھر تھا جہاں اس وقت کچھ لوگ گیٹ سے اندر جا رہے تھے۔

''مغرب کا وقت ہے، لوگ یہاں آکر باجماعت نماز ادا کرنے آتے ہیں۔ آیئے شاہ جی! ہم بھی نماز ادا کرلیں۔''

اصغر شاہ نے لوگوں کو اندر جاتے دیکھا تو ان کی حیرت بھانپ کو منگلا نے بتایا۔

''اوہ اچھا...'' اصغر شاہ نے کہا اور پُر تجسس نگاہوں کے ساتھ وہ بھی اس گھر کی جانب بڑھ گئے جسے منگلا نے 'بیت الذکر' کا نام دیا تھا۔

''یہاں ہمارے ہفتہ وار درس پروگرام ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسلام کا کام کس طرح زیادہ بہتر انداز میں آگے جا سکتا ہے، اس کا لائحہ عمل تشکیل دیا جاتا ہے۔'' منگلا چلتے ہوئے اصغر شاہ کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اصغر شاہ دلچسپی سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

''السلامُ علیکم ورحمتہ اللہ۔'' ان کے قریب سے گزرتے کتنے ہی لوگوں نے انہیں سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام ورحمتہ وبرکاتہ...!!'' منگلا اور اصغر شاہ جواب دے رہے تھے۔ اصغر شاہ کو وہاں آنے سے پہلے جو اضطراب محسوس ہو رہا تھا اور امام صاحب کے رویے کی وجہ سے دل پر جو بوجھ سا تھا، وہ ہٹتا ہوا محسوس ہوا۔ بیت الذکر میں انہیں کہیں سے بھی اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ سبھی مسکرا رہے تھے، سبھی کے انداز میں گرم جوشی تھی۔ سبھی آپس میں ویسی ہی اور انہی موضوعات پر باتیں کر رہے تھے جیسی ان کے سکول میں موجود اساتذہ کرتے تھے۔

''ارے منگلا...!! ذرا ادھر آیئے۔'' کسی نے اسے آواز دی تھی۔ وہ ایک پختہ عمر کے انسان تھے جس کے چہرے پر شفیق سی مسکراہٹ تھی۔

''یہ حضرت شفیق ہیں، ہمارے مربی۔'' منگلا نے ان کی جانب چلتے ہوئے اصغر شاہ کو ان کے بارے میں بتایا تھا۔

''السلامُ علیکم...''

''وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ۔ آج ہمارے گھر کو کس نے رونق بخشی ہے؟'' مربی نے مسکراتے ہوئے

اصغر شاہ کی جانب دیکھا۔ جواب میں وہ بھی مسکرائے۔

''یہ اصغر شاہ ہیں۔'' منگلا نے ان کا تعارف کروایا۔ ''میں نے آپ سے ان کا ذکر کیا تھا۔''

''جی جی! زہے نصیب! مجھے آپ کو یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔'' مربی نے ان کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

''بہت شکریہ۔'' اصغر شاہ نے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے جواب دیا۔ اسی وقت ہال کے ایک جانب کھڑے شخص نے اذان دینی شروع کر دی تھی۔ جو جہاں تھا، وہیں احتراماً کھڑا ہوا گیا۔ سبھی پیٹ پر ہاتھ باندھے، سر جھکائے ادب کے ساتھ اذان سن رہے تھے۔ اصغر شاہ کو دیکھ کر حیرت ہوئی لیکن وہ بولے کچھ نہیں۔

''نماز سے فارغ ہو جائیں، پھر باتیں کریں گے۔''

اذان کے اختتام پر مربی نے اصغر شاہ کے بازو کو دوستانہ انداز میں تھپتھپاتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گئے۔ صفیں بنانے کا مرحلہ آیا تو بھی اصغر شاہ شدید حیران ہوئے۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا عام مساجد میں ہوتا ہے۔ ویسی ہی اقامت، رکوع و سجود، ویسا ہی قیام۔

''تو پھر ہم ہیں اور ان میں فرق کیا ہے؟'' اصغر شاہ مزید الجھ گئے تھے۔

نماز سے فارغ ہو کر سب نمازی درس کی مختصر نشست کے لیے مربی کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔ مربی شفیق نے لوگوں کو عمدہ اخلاق کی تلقین کے ساتھ ساتھ قرآن و سنت کے مطابق زندگی گزارنے کی یاد دہانی کروائی اور لڑائی جھگڑے سے دور رہنے کی نصیحت کی۔ اس کے ساتھ ہی درس کی محفل اختتام پذیر ہوئی اور سبھی نمازی وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اب وہاں صرف منگلا، مربی اور اصغر شاہ رہ گئے تھے۔

رسمی بات چیت کے بعد مربی نے ان سے کہا تھا:

''آپ کچھ متذبذب لگ رہے ہیں۔''

''جی ہاں...'' اصغر شاہ نے بلا جھجھک کہا تھا۔ وہاں کے ماحول نے انہیں اس بات کا یقین دلا دیا تھا کہ وہاں ان کی بات کو تحمل سے سنا جائے گا اور دلیل سے جواب دیا جائے گا۔ ''میں نے آپ لوگوں کے ساتھ

نماز پڑھی ہے، اس سے پہلے بھی میں منگلا کو دیکھتا آرہا ہوں کہ کیسے اس کا رہن سہن، اس کے اعمال سبھی مسلمانوں جیسے ہیں، تو پھر اختلاف کہاں ہے؟''

''دیکھیے...'' مربی مسکرایا: ''ہم یہی تو کہتے ہیں کہ ہم بھی مسلمان ہیں، ہم روزے رکھتے ہیں، نماز زکوۃ ادا کرتے ہیں، اسلام کے سبھی ارکان کی پابندی کرتے ہیں، حرام نہیں کھاتے، لیکن حکومتِ پاکستان اور کچھ علماء کرام ہمیں کافر ثابت کرنے کے درپے ہیں۔ آپ لوگ کہتے ہیں، لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ.... لیکن پھر بھی میری سمجھ سے باہر ہے کہ لوگوں کو ہم سے کیا مسئلہ ہے۔''

مربی نے دکھی انداز میں کہا۔ اصغر شاہ کو ان سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

''لیکن آپ لوگ حضرت عیسیٰ کی وفات کے قائل ہیں۔'' اصغر شاہ نے کہا۔

''ہمارا اگر اس بات پر یقین ہے تو یقیناً ہمارے پاس اس کا ٹھوس ثبوت ہوگا ناں! ہم وہ ثبوت قرآن و حدیث سے ثابت کر سکتے ہیں۔ آپ بتایئے، کیا آپ حضرت عیسیٰ مسیح کے رفع و نزول کو ثابت کر سکتے ہیں؟ ''

مربی کے لہجے میں نرمی تھی۔ اصغر شاہ کے ذہن میں کچھ گھنٹہ پہلے کا سارا منظر گھوم گیا جب انہوں نے امام صاحب کے سامنے یہ بات رکھی تھی۔

انہوں نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

''دیکھیے شاہ جی...!'' مربی نے نرم لہجے میں کہنا شروع کیا: ''ہمارے آباؤ اجداد بھی اسی نظریے کے قائل تھے جو آپ کا اور اکثریت کا نظریہ ہے کہ حضرت عیسیٰ مسیح کو اللہ نے زندہ آسمان پر اٹھا لیا تھا اور انہیں دوبارہ زمین پر بھیجا جائے گا، لیکن پھر اللہ نے ہمارے اوپر احسان فرمایا اور ہمارے حضرت پر کشف کے ذریعے سچ کو آشکار کیا کہ حضرت عیسیٰ مسیح وفات پا چکے ہیں اور جن مسیح موعود کا ذکر احادیث میں ملتا ہے، وہ ہمارے حضرت صاحب ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

''لیکن آپ لوگ اپنے مرزا کو نبی بھی تو مانتے ہیں حالانکہ حضرت محمد ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آ

سکتا۔“ اصغر شاہ نے اعتراض اٹھایا۔ ان کا خیال تھا یہ سوال سن کر مربی طیش میں آجائے گا لیکن اس کے برعکس مربی نے بہت متانت سے جواب دیا:

”ہم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے کہ حضرت محمد آخری نبی نہیں ہیں۔ ہمارے تو بیعت فارم میں بھی یہ شرط ہوتی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کو خاتم النبیین مانا جائے۔“

”اچھا...!! میں نے تو یہی سنا تھا کہ....!!“ اصغر شاہ نے اچھنبے سے کہا۔

”شاہ جی! سنی سنائی پر یقین کرنا چاہئے کیا...؟“ مربی مسکرایا: ”ہم اپنے بچوں کو بچپن سے سکھاتے ہیں کہ سنی سنائی پر یقین نہیں کریں، تحقیق کریں، اور اس معاملے میں آپ سب ہمرے بارے میں پھیلائے ہوئے منفی پروپیگنڈے پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتے ہیں بلکہ اگر کوئی آپ جیسا تحقیق کرنا بھی چاہے تو اسے ہمارا ساتھی مان لیتے ہیں۔ آپ ہی ایمان داری سے بتائیے، کیا یہ روش درست ہے؟“

مربی کے سوال پر اصغر شاہ نے دھیرے سے سر نفی میں ہلا دیا تھا۔

”اگر آپ نے ہمارے بارے میں جاننا ہے تو بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہمارے بارے میں مخالفین کی لکھی اور کہی گئی باتوں کو مانیں یا خود ہم سے پوچھیں؟ بات تو سخت ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ آپ کے علماء کرام چاہتے ہیں کہ وہ جو بتا رہے ہیں، ان پر آنکھیں بند کر کے ’یس سر‘ کہتے ہوئے یقین کرتے جائیں، سوال نہ کریں، تحقیق نہ کریں، کیونکہ انہیں ڈر ہے کہ اگر آپ نے ہمارے بارے میں بغیر کسی بغض کے تحقیق کی تو آپ حق اور صداقت کو پالیں گے۔“

”جی.... ایسا ہی ہے۔“ اصغر شاہ نے شرمندگی سے جواب دیا۔

”ارے شاہ جی...! میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا ہرگز نہیں ہے، مجھے تو اس بات کی دلی خوشی ہے کہ آپ سنی سنائی پر یقین کرنے کی بجائے تحقیق پر یقین رکھتے ہیں اور جذباتیت سے کام لینے کی بجائے دلیل سے کام لیتے ہیں۔“ مربی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو اصغر شاہ طمانیت کے ساتھ مسکرا دیے۔

ان کی دو گھنٹے کی نشست رہی تھی جس کے اختتام پر اصغر شاہ فیصلہ کر چکے تھے۔

''آپ کا بہت شکریہ شفیق صاحب! آپ نے میرے سارے سوالوں اور الجھنوں کا ایک ایک کر کے تسلی بخش جواب دیا ہے۔ یہی سوال اگر میں کسی عالم کے سامنے رکھتا تو مجھے یقین ہے اس نے لاٹھی اٹھا کر میرے اوپر ٹوٹ پڑنا تھا۔''

''شاہ جی، اس رب کا شکر ادا کریں جس نے آپ کو سیدھا راستہ دکھایا ہے۔ ہم تو بس بندہ بشر ہیں۔ جو کام ہمارے سپرد کیا گیا ہے، اس کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔'' مربی نے مسکراتے ہوئے عاجزی سے جواب دیا۔

''اب مجھے آپ بس اتنا بتا دیں کہ آپ کی جماعت میں شامل ہونے کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا؟''

اصغر شاہ کے سوال پر مربی اور منگلا نے مسکراتی آنکھوں کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ اس پورے سیشن میں منگلا خاموش رہا تھا۔

''نہیں شاہ جی...!'' مربی نے انکار میں سر ہلایا:

''میرا مشورہ ہے کہ جلدی نہ کریں۔ ابھی تھوڑا اور وقت لیں سوچنے کے لیے، کیونکہ اگر آپ ہماری جماعت میں داخل ہو گئے اور لوگوں کو پتا چل گیا تو آپ کا سوشل بائیکاٹ کر دیا جائے گا۔ آپ کے دوست احباب، رشتہ دار، سبھی آپ سے قطع تعلقی کر لیں گے۔ یہ بہت بڑا فیصلہ ہے۔ میں آپ کو مخلصانہ مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ آپ تھوڑا سا اور وقت سوچنے کے لیے لے لیں۔ پھر اس کے بعد فیصلہ کریں تاکہ بعد میں آپ کو کسی قسم کا پریشر محسوس نہ ہو اور آپ جماعت چھوڑنے کے بارے میں سوچنے پر مجبور نہ ہو جائیں۔ آپ جماعت میں شامل ہوں، سو بسم اللہ۔ لیکن اسے چھوڑنے کے لیے نہیں۔''

مربی نے انہیں سمجھایا۔

''اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ ربوہ شریف دارالضیافت کر کے کا دورہ کریں۔ وہاں آپ کو ہماری جماعت کی سرگرمیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملے گا کہ کس طرح ہماری جماعت اسلام کو دنیا کے ہر گوشے میں نہایت منظم انداز میں پھیلا رہی ہے۔''

منگلا نے اصغر شاہ کو کہا تو مربی نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

''ویسے مجھے آپ کی باتون سے اتنا اطمینان نصیب ہوا ہے کہ میرا نہیں خیال مجھے مزید کچھ دیکھنے یا آپ کی جماعت کو پرکھنے کی ضرورت ہے، لیکن اگر آپ کو یہی بہتر لگتا ہے تو ٹھیک ہے۔ میں کچھ دن اور سوچ لیتا ہوں اور ربوہ کا چکر بھی لگالیتا ہوں۔''اصغر شاہ نے مطمئن لہجے میں کہا تھا۔ منگلا کھل کر مسکرا دیا۔

.....☆....

کھانا تیار ہو چکا تھا۔ چار پائیاں بچھ گئی تھیں۔ منال نے ان چار پائیوں کے درمیان لکڑی کی ایک پرانی سی میز سجا کر اس کے اوپر پھول دار سفید کپڑا بچھا دیا تھا۔ اب باری تھی کھانا چننے کی.. یہ کام بھی منال نے اکیلے ہی بھاگ دوڑ کر کے بڑی محنت کے ساتھ کیا تھا۔ کھانے کی میز پر رستم رئیس اور الوینہ بھی آ چکے تھے ۔سب لوگوں نے اللہ کا نام لے کھانا شروع کیا۔ رستم رئیس اور بابا اسحاق آپس میں بات چیت کرنے لگے۔

''یہاں کے لوگ پڑھے لکھے ہیں؟'' رستم رئیس نے مرغی کا سالن اپنی پلیٹ میں نکالتے ہوئے پوچھا تھا۔

''نہیں جناب...!! چٹے ان پڑھ ہیں۔'' بابا اسحاق نے کن اکھیوں سے جاوید کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''حکومت نے مکتب اسکول بنایا ہوا ہے لیکن کوئی استاد ہی نہیں آتا جی.....اور آ بھی جائے تو لوگ بچوں کو بھیجتے ہی نہیں۔''

''ہاں، میں نے راستے میں دیکھا تھا، بچے گلیوں میں کھیل رہے تھے۔''

''بس جی..، یہ تو ان کے ماں پیو کو سوچنا چاہیے کہ بچے آوارہ گردی کر رہے ہیں، تو کچھ پڑھ لکھ جائیں تا کہ ان کے بڑھاپے کا سہارا تو بنیں۔''

جاوید جانتا تھا کہ بابا اسحاق بلا واسطہ اسے ہی سنا رہے ہیں، اس لیے سن ان سنی کرتے ہوئے اس نے سالن والا ڈونگا رستم کے قریب کیا۔

''سر جی..! آپ اور لیں ناں...''

''شکریہ.....!!'' رستم رئیس نے مزید سالن اپنی پلیٹ میں نکالا، پھر جاوید سے پوچھنے لگا:

''تم کیا کرتے ہو....؟''

''کرنا کیا ہے رستم صاحب! کوئی کام دھندا ملتا ہی نہیں ہے....بس پھر کوئی بھی ماڑا موٹا کام کر لیتا ہوں دہاڑی وغیرہ....'' جاوید نے کن اکھیوں سے باپ کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اس کی بات سن کر سر جھکائے کھانا کھاتے ہوئے بابا اسحاق نے ایک قہر آلود نگاہ اس پر ڈالی:

''ہونہہ.....!! کام کر لیتا ہے''!!!

''منال کے ذریعے آپ کے گھوڑے کا پتا چلا تھا۔'' رستم رئیس اب اصل موضوع پر آگیا تھا۔

''جی، بس کیا کریں...اس کے اتنے ہی ساہ تھے.... سو پورے ہو گئے تو چلا گیا۔'' بابا اسحاق نے افسردگی سے کہا: ''ویسے اس نے میرا بڑا ہی ساتھ دیا تھا۔''

''آپ کے گاؤں کی طرف کی زمینیں بڑی زرخیز ہیں۔ میں یہاں آتے ہوئے فصلیں دیکھ رہا تھا۔ خوب پیداوار ہو رہی ہے۔''

رستم رئیس نے جان بوجھ کر موضوع بدلا۔

''ہاں جی، اللہ کا کرم ہے۔'' جاوید نے کہا: ''....اور بابا ملنگ کا سایہ ہے۔''

''بابا ملنگ....؟'' رستم رئیس چونکا۔

''ہاں جی...، دوسرے گاؤں میں بہت پہنچے ہوئے ایک بزرگ رہتے تھے۔ پتا نہیں کہاں سے پھرتے پھراتے اس گاؤں پہنچ گئے۔ گاؤں والوں نے بھی ان کی خوب خدمتیں کیں، تو خوش ہو کے انہوں نے اپنا ڈنڈا ایک کھیت کی مٹی پر مارا۔ تب سے جی خوب بھر بھر کر فصلیں اترتی ہیں۔''

''اوہ اچھا.....'' رستم رئیس نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

''ہاں جی، ان کا فیض ہے جو کھیتوں کھیت پھیلتا ہوا ہمارے گاؤں تک آگیا ہے۔'' جاوید نے بہت وثوق سے کہا تھا۔ بابا اسحاق اس دوران خاموش رہے۔

''تو بابا جی کا کیا ہوا...؟''

''بابا جی تو جی کب کے اللہ کو پیارے ہو گئے تھے، لیکن ان کا مزار ہے جہاں اب بھی مرادیں پوری

ہوتی ہیں۔"

"اوہ...! کہیں یہ وہ مزار تو نہیں جو ایک اونچے چبوترے پر ہے؟ اور اس کے گنبد کا رنگ مٹیالا سا ہے؟"

"او جی، پہلے وہ سفید رنگ کا تھا۔ اب بارش اور مٹی پڑ پڑ کر مٹیالا رنگ ہو گیا ہے۔" جاوید ہی جواب دے رہا تھا۔ بابا اسحاق کو اس موضوع میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ چپ چاپ مرغی کے شوربے میں روٹی بھگو بھگو کر کھاتے رہے۔

"میرا خیال ہے میں نے یہاں آتے ہوئے دور سے وہ مزار دیکھا تھا.. مزار کے گرد جالی لگی ہوئی تھی جس پر کالے کپڑے لٹک رہے تھے، وہی ہے ناں؟"

"ہاں جی ہاں جی..!" جاوید خوشی سے بولا: "وہی ہے! بابا ملنگ کو کالا رنگ بہت پسند تھا تو اب جو بھی ان کے مزار پر منت مانتا ہے، وہ کالے رنگ کا کپڑا ضرور باندھ کر آتا ہے۔ رنگ برنگے کپڑے بابا ملنگ کو بہت شودے لگتے تھے۔"

"صحیح......" رستم رئیس نے پُرسوچ لہجے میں جواب دیا اور پھر اس کے لبوں پر پراسرار سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

کھانے کے بعد کچھ دیر انھوں نے اِدھر اُدھر کی باتیں کی پھر الوینہ اور رستم رئیس ڈرائیور کے سنگ واپس چنیوٹ روانہ ہو گئے تھے۔ اس دوران انھوں نے منال کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی لیکن اس نے بصد احترام معذرت کر لی تھی کہ وہ اماں ابا کے ساتھ چھٹی گزار کر اگلے دن بابا اسحاق کے ساتھ ہاسٹل آ جائے گی۔

الوینہ جاتے ہوئے بے پناہ خوش تھی۔ جتنا منال اس کے آنے سے پہلے پریشان تھی اور اپنے گھر کی حالت کے بارے میں حساس ہو رہی تھی، الوینہ کی خوشی دیکھ کر وہ پریشانی رفتہ رفتہ دور ہو گئی تھی۔ البتہ اماں نے منال کے ٹوکنے کا ضرور برا منایا تھا، تبھی باقی سارا وقت وہ خاموش خاموش سی رہیں۔

رستم رئیس نے جاتے جاتے چپکے سے اچھی خاصی رقم بابا اسحاق کے حوال کر دی تھی تاکہ اس سے وہ

اپنے ذریعہ معاش کو کوئی بندوبست کر لے۔ بابا اسحاق رستم رئیس کے اس احسان تلے اتنا دب گئے تھے کہ ممنونیت میں ان کے سامنے بچھے بچھے جا رہے تھے۔

سفر خاموشی سے گزرا تھا۔ الوینہ دلچسپی سے کھڑکی کے باہر گزرتے کھیتوں کھلیانوں کو دیکھ رہی تھی جبکہ رستم رئیس اپنی ران پر رکھے ہاتھ کی انگلیوں کو گاڑی میں گونجتے میوزک کی دھن پر حرکت دیتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھا اور تصور میں منال کو دیکھتے ہوئے برابر مسکرائے جا رہا تھا۔

....☆....

دارالذکر میں کئی گھنٹے گزارنے کے بعد اصغر شاہ کو پر تکلف کھانا پیش کیا گیا تھا، کئی مربین سے شاہ جی کی ملاقات کروائی گئی۔ انھیں اتنی عزت دی گئی کہ انھوں نے ایسا کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اس لیے دو گھنٹے کے بجائے وقت بہت زیادہ لگ گیا تھا۔ واپسی میں کافی دیر ہو گئی۔ بے چین سی نگہت بیگم نے اصغر شاہ کے لیے گھر کا دوازہ کھولتے ہی پوچھا تھا۔

”ارے بھئی... ! کہاں رہ گئے تھے آپ؟ بتائے بغیر چلے گئے اور اتنی دیر سے واپس آئے۔“

”اندر تو آنے دو بیگم !“ اصغر شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ اتنے دنوں کے ذہنی بوجھ کی وجہ سے جو طبیعت پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی، وہ مربی شفیق کی باتوں نے دور کر دی تھی۔

”بچے بھی انتظار کر رہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی سونے کے لیے لیٹے ہیں۔“ نگہت بیگم ان کے پیچھے پیچھے آئیں: ”کھانا کھائیں گے ؟“

”نہیں، میں منگلا کے ساتھ ایک دوست کی طرف گیا تھا۔ وہیں کھانا بھی کھا لیا۔“ اصغر شاہ نے کرسی پر بیٹھ کر جوتے اتارتے ہوئے جواب دیا۔

”بندہ دوست کی طرف بتا کر بھی تو جا سکتا ہے، دل میں سو طرح کے خدشات آ رہے تھے۔“ نگہت بیگم کی پریشانی ناراضی میں بدل رہی تھی۔ اصغر شاہ ہنسے۔

”اچھا بھئی، معاف کر دو۔ آئندہ ضرور بتا کر جاؤں گا۔ اب سزا کے طور پر کان پکڑ لوں کیا؟ دیکھو، مرغ بننے کا مت کہنا، مرغا بننے کی کوشش میں کمر میں چک پڑ جائے گی !“ جواب میں خفا خفا سی نگہت بیگم

نے انہیں گھورا، پھر خود بھی ہنس پڑیں۔

....☆....

''السلامُ علیکم بیٹے! کیسے ہو..؟'' فون کی گھنٹی بجنے پر جیسے ہی بلال نے ریسیور کان سے لگایا، ابا جان کی آواز سن کر خوشی سے اچھل پڑا۔

''امی جی! ابا جان کا فون ہے۔'' اس نے امی کو آواز لگائی تھی۔ ''ابا جان! کیسے ہیں آپ؟''

فون کی دوسری جانب میاں عبدالکریم بیٹے کی بے چینی اور خوشی محسوس کر کے ہنس پڑے۔

''میں ٹھیک ہوں بیٹے۔ تم دونوں کیسے ہو؟''

''ہم بھی ٹھیک ہیں ابا جان۔ میں سکول کی کرکٹ ٹیم کا کپتان بن گیا ہوں''!

''اچھا!!! شاباش، یعنی کچھ سالوں کے بعد تم پاکستان کرکٹ ٹیم کے بھی کپتا بن جاؤ گے!'' انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تو بلال بھی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''تمہارا دوست کیسا ہے؟ اور شاہ جی...؟''

''سب ٹھیک ہیں ابا جی...'' بلال انہیں بتاتے بتاتے رک گیا کہ اصغر شاہ اور منگلا دو دن پہلے کہیں گئے تھے: ''وہ کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ جب کوئی بات پوری طرح مجھے پتا ہی نہیں ہے تو میں کیوں ادھوری بات بتا کر ابا جی کو پریشان کروں۔'' بلال نے دل میں سوچا۔

''وہاں برف پڑی...؟''

''نہیں بھئی، ابھی نہیں پڑی۔'' اس کے سوال پر میاں صاحب ہنسے تھے۔ اسی وقت امی جان آگئیں تو بلال نے ریسیور انہیں تھما دیا۔

''امی جی! میں عمر کے گھر جا رہا ہوں۔'' اس نے انہیں بتایا تو فون پر شوہر کا احوال پوچھتے ہوئے انہوں نے بس سر ہلا دیا۔

....☆....

''سو گئی ہے نیک بختے...؟''

کمرے میں چارپائی پر دراز ابا نے اماں کو مخاطب کیا تھا جو ان کے برابر کی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھیں۔ ساتھ والے کمرے میں لالٹین کی روشنی میں منال پڑھ رہی تھی۔ جاوید اور امداد کا کمرہ پہلے نمبر پر تھا، جسے بطور بیٹھک بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد اماں ابا کا کمرہ اور پھر آخر میں منال کا کمرہ تھا۔

''نہیں..... جاگ رہی ہوں۔'' اماں نے ان کی طرف کروٹ لیتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''جاوید کتھے اے..؟''

''مینوں کی پتا.... بیٹھا ہوؤے گا اپنے یاراں نال۔''

اماں نے بے زاری سے کہا۔ وہ اس بات سے لاعلم تھیں کہ جاوید اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور رستم رئیس کے ساتھ گزرے ہوئے وقت پر سوچ بچار کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں ابا اور اماں کی باتیں آ رہی تھیں لیکن وہ اپنی سوچوں میں گم تھا۔

''تجھے پتا ہے رستم صاحب کتنی رقم دے کر گئے ہیں...؟''

ابا نے محتاط انداز میں کہا تھا۔ جاوید ان کی بات سن کر چونکا اور ان کے کمرے کے بند دروازے کی جانب دیکھا۔

''کتنے..؟''

''بیس ہزار روپے!'' ابا نے کہا تو اماں چونک کر اٹھ بیٹھیں۔ جاوید بھی حیرت سے اٹھ بیٹھا تھا۔

''کتنے...؟'' اماں کو لگا، انہیں سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ جاوید کو بھی یہی لگا کہ اسے بھی سننے میں غلطی ہوئی ہے!

''پورے بیس ہزار روپے نیک بختے...!!'' ابا بھی چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔

''ہا ہائے...! لیکن تُو نے تو شامی ویلے کہا تھا کہ تین ہزار دیے تھے۔''

''تو کیا جاوید کے سامنے منہ بھر کر اصل رقم بتا دیتا تاکہ وہ تجھ سے کسی بہانے نکلوا کر کبوتروں کے دانوں پر اڑا دیتا؟''

ابا نے تھوڑے تیز لہجے میں کہا تو اماں کچھ ثانیے کے لیے خاموش ہو گئیں۔ جاوید نے ان کی بات سن

کر منہ بنایا، لیکن پھر خود ہی مسکرا دیا۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ اس رقم سے گھوڑا خریدنے کی بجائے کوئی دکان ڈال لوں...'' ابا نے پُرسوچ انداز میں اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔

''دکان کیسے ڈالے گا تُو؟ نہ کوئی مال، نہ کوئی تجربہ...!'' اماں نے ان کی سوچ کو در کر دیا تھا:

''میں تو کہتی ہوں.....'' اماں نے کچھ کہنا چاہا لیکن ابا نے ان کی بات کاٹ دی۔

''او تُو رہن دے جو کہتی اے...!!! پیسہ آیا ہے تو مال بھی آجائے گا۔'' ابا نے ہاتھ ہلا کر اپنے کانوں کے گرد منڈلاتے مچھر کو اڑایا۔

''اور تجربے کا کیا ہے، وہ بھی آہی جانا ہے۔''

''ٹھیک ہے، کرو جو کرنا ہے!'' اماں ابا سے ناراض ہو کر لیٹ گئیں اور ابا کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اندر لالٹین کی روشنی میں پڑھائی کرتی منال بیس ہزار کا سن کر حیران رہ گئی تھی اور جاوید گہری مسکراہٹ لیے دوبارہ لیٹ گیا تھا!

اگلے دن منال بابا اسحاق کے ساتھ لاہور کے لیے تیار تھی۔ ناشتا کر کے دونوں باپ بیٹی گھر سے نکلنے لگے تو اماں نے خاص طور پر الوینہ کے لیے الگ سے آم اور لیموں کا اچار ایک چھوٹے سے مرتبان میں ڈال کر اسے تھما دیا۔

''یہ تیری سہیلی کے لیے ہے۔ اسے میری طرف سے بوہتا شکریہ کہنا...''

''او سیانی بی بی...!'' ابا جی نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا: ''....یہ اچار سارا گر جانا اے سامان میں۔ اسے کیسے ساتھ لے کے جائیں...؟''

''جی اماں...!'' منال بھی مرتبان ہاسٹل لے جانے پر ہچکچائی: ''وہ بڑی امیر لڑکی ہے....''

''کیوں...؟ امیروں کو بھوک نہیں لگتی کیا..؟'' اماں بھلا کہاں ہار ماننے والی تھیں۔

''ارے اماں...! یہ اچار جیسی چیزیں وہ لوگ نہیں کھاتے۔ یہ تو بس ہم دیسی لوگ ہی کھا سکتے ہیں۔'' منال نے تنک کر کہا۔

''ہاہائے.... کیوں نہیں کھاتے... سبھی کھاتے ہیں!'' اماں نے ضد کرتے ہوئے کہا: ''امیر ہوئے کہ غریب.... دیسی ہوئے یا پردیسی.... ہے تو وہ بن ماں کے رہنے والی بچی ناں...! اسے گھر میں آم کا خالص اچار ڈال کر دینے والا کون ہو گا؟ مجھے تو بڑا ہی ترس آیا اس پر.... اتنی چھوٹی سی بچی کو چھوڑ کر جاتے ہوئے اس کی ظالم ماں کا کلیجہ نہیں کٹا...؟ ہاہائے...!!!'' اماں کو واقعی الوینہ سے بہت ہمدردی ہو رہی تھی۔

''اچھا اماں..... میں لے جاتی ہوں۔'' منال کو اسی میں عافیت نظر آئی کہ مرتبان اٹھا کر ساتھ لے جائے۔ وہ پہلے ہی اماں کو ٹوک کر انہیں ناراض کر چکی تھی، اس لیے انہیں دوبارہ ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''شاباش دھییے...!! دوسروں کا خیال کرنا چاہیے ناں!'' اماں نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا تو وہ مسکرا اٹھی۔

....☆....

''کیا ہوا؟ منہ کیوں سجایا ہوا ہے؟ کہیں شہد کی مکھی نے تو نہیں کاٹ لیا؟''

بلال عمر کے گھر پہنچا تو گیٹ کے باہر ہی گھاس پر چوکڑی مار کر عمر بیٹھا ہوا تھا اور بے زاری سے گھاس کو توڑ رہا تھا۔

''نہیں۔'' عمر نے خفگی سے جواب دیا۔

''پھر کیا ہوا ہے؟'' بلال اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''تمہیں میں نے بتایا تھا ناں کہ اس جمعے کو ابو نے ہمیں منگلا ڈیم لے کر جانا تھا۔''

''ہاں، تو..؟'' بلال نے پوچھا۔

''اب کہہ رہے ہیں کہ اس جمعے کو نہیں، اگلے جمعے کو جائیں گے۔'' عمر نے خفگی کے ساتھ ایک کنکر کو دور پھینکا۔

''اوہ.... کیوں؟ میں نے تو بسکٹ اور ٹافیاں بھی خرید لی تھیں کہ راستے میں کھاتے ہوئے جائیں

گے۔‘‘ بلال نے حیرت اور دکھ سے کہا۔

’’پتا نہیں یار.... بس وہ کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے منگلا بھائی کے ساتھ کہیں جانا ہے اور اگلے دن واپسی ہو گی ان کی۔‘‘

’’کیا یار.... !!! سارا پروگرام ہی خراب ہو گیا ہے!‘‘ بلال کو بھی کوفت ہوئی تھی: ’’وہ دونوں اگلے جمعے کو نہیں جا سکتے؟‘‘

’’میں نے کہا تھا لیکن وہ کہہ رہے ہیں کہ نہیں، ان کا کام زیادہ ضروری ہے، مزید تاخیر نہیں کر سکتے، ہمارا پروگرام ملتوی ہو سکتا ہے، ان کا نہیں۔‘‘

عمر نے منہ بنا کر کہا تھا۔

’’انہوں نے بتایا نہیں کہ انہیں کہاں جانا ہے؟‘‘ بلال نے پوچھا۔ اس کی چھٹی حس نے اچانک سگنل دینا شروع کیا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔

’’نہیں بھئی، مجھے نہیں پتا، اور بس پلیز، مجھ سے اور سوال مت کرو۔ میرا موڈ پہلے ہی بہت خراب ہے۔‘‘ اس کے سوالوں سے تنگ آ کر عمر نے اسے ٹوکا تھا۔

’’اچھا، کھیلنے تو چلو ناں۔ یا اس پر بھی پابندی ہے؟‘‘ بلال نے اس کی ران پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے کہا تو عمر بھی منہ بنا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

کھیل کے دوران بھی بلال مسلسل یہی سوچے جا رہا تھا کہ اصغر شاہ اور منگلا کو آخر کہاں جانا ہو گا؟

....☆....

اصغر شاہ منگلا کے ساتھ چنیوٹ میں واقع ربوہ پہنچ چکے تھے اور ہر چیز کو دیکھ دیکھ کر بس متاثر ہوتے جا رہے تھے۔ سرسبز دالان سے سجی دار الضیافت کی پوری عمارت میں ٹھنڈے ماربل کا فرش تھا جس پر قدم رکھتے ہی ایک تازگی اور سکون پورے وجود میں بھر جاتا تھا۔ نیچے ایک بڑا اور بہت وسیع مرکزی ہال تھا اور دوسری منزل پر مہمان خانے تھے جہاں راہداری کے دونوں جانب مہمانوں کو ٹھہرانے کے لیے بہت آرام دہ اور ہر بنیادی سہولت سے مزین کمروں کی ایک لمبی قطار تھی۔

اصغر شاہ ہال میں داخل ہوئے تو تعجب سے دیواروں کی طرف دیکھا۔ وہ خوب صورت خطاطی میں قرآن مجید کی آیات والے فریم لگے ہوئے تھے۔ کچھ فریم میں جلی حروف میں کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔ ہال میں میز اور کرسیوں کا انتظام تھا۔ کچھ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے ہوئے، اپنے اپنے مربی سے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

''بہت خوب صورت عمارت ہے۔ میرے ذہن میں تو پسماندہ سی عمارت کا نقشہ تھا۔'' اصغر شاہ تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ منگلا ان کی بات سن کر مسکرایا۔

''حضرت مسیح موعود کو خدا تعالیٰ نے الہام کیا تھا کہ میں آپ کو اور آپ کی جماعت کو اتنا دوں گا کہ آپ کے لیے کافی ہو جائے گا۔ اگر خدا تعالیٰ ان سے یا ہم سے ناراض ہوتا تو کیا ہم اتنے کرم اور عنایت کے مستحق ہوتے؟ ہمارا تو نام ونشان ہی کب کا مٹ چکا ہوتا لیکن نہیں، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں ہمت دی اور ہم پر اکرام کیا۔ تبھی تو ہم اتنے احسن انداز میں اصل اسلام کی تبلیغ کا فریضہ اپنے کندھوں پر اٹھائے، بہترین انداز میں کام کر رہے ہیں۔''

منگلا کے جواب نے اصغر شاہ کے دل کو مزید مطمئن کر دیا تھا۔ باقی کی کسر وہاں موجود مربیوں نے پوری کر دی!

جامعہ احمدیہ میں دینی تعلیم کا اعلیٰ معیار اور فضل عمر ہسپتال میں علاج معالجے کی جدید سہولیات دیکھ کر اصغر شاہ کو ایک لمحے کے لیے گمان ہوا کہ وہ ربوہ جیسے چھوٹے شہر میں نہیں، اسلام آباد جیسے شہر میں کھڑے ہیں!

جماعت کی مرکزی مسجد، مسجدِ اقصیٰ کی تیسری صف میں عشاء کی نماز پڑھتے اصغر شاہ نے سلام پھیرتے ہی دل میں قوی ارادہ کر لیا تھا کہ فجر کی نماز کے فوراً بعد وہ بیعت فارم سائن کر کے جماعت میں شامل ہو جائیں گے۔

''ہدایت مل جائے تو اسے قبول کرنے میں دیر ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔'' ایک مربی کا کہا ہوا جملہ ان کے ذہن میں گونجا تھا۔ انہوں نے طمانیت کے ساتھ مسکراتے ہوئے ساتھ بیٹھے ایک احمدی کے ہاتھ پر اپنا

ہاتھ رکھ کر اسے یہ یقین دلایا تھا کہ اب وہ بھی ان میں سے ہی ہیں...

اگلی صبح فجر کی نماز کے بعد انہوں نے اس جماعت میں اپنی شمولیت کا اعلان کر دیا تھا!

....☆....

عبدل اس وقت رستم کے ساتھ لان میں بیٹھا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتوں کے ساتھ ساتھ چائے اور پکوڑوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اچانک رستم نے باتوں کا موضوع بدلا اور عبدل کو کچھ راز و نیاز کی باتیں بتانے لگا:

''عبدل میاں..! جن جن پراجیکٹس کا آپ نے کہا ہے، ان کے لیے میں رقم جلد فراہم کر دوں گا، آپ بے فکر رہنا۔''

''جی بہتر... باقی یاسر کے بارے میں آپ بے فکر رہیں، میں اس سے خط کے ذریعے رابطے میں ہوں۔'' عبدل نے کہا، اس کے ساتھ ہی وہ لان سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آن بیٹھے تھے۔ باتیں کرتے کرتے گھنٹا گزر گیا تو انھوں نے میز پر مخصوص بوتلیں سجا لیں۔

''میں کل ایک کام کے سلسلے میں ساہیوال کی طرف ایک گاؤں میں گیا تھا۔''

اس نے خاص مشروبِ مغرب کا جام عبدل کی طرف بڑھاتے ہوئے بتایا تو وہ چونکا۔

''پھر... کیسا رہا آپ کا سفر...؟''

''میں نے باتوں باتوں میں کچھ معلومات لیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں بہت آسانی سے کام کیا جا سکتا ہے۔''

''ہوں.... گڈ...''عبدل نے جام کا گھونٹ بھر کر ہنکارا بھرا۔

''اَن پڑھ لوگ ہیں۔ دین کا زیادہ علم ہے نہ دنیا کا....I am pretty sure اگر ہم نے وہاں اپنا کام شروع کیا تو بہت تیزی سے مقامی لوگ ہماری بات سننے لگیں گے۔''رستم نے بھی اپنا جام لبوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''دیکھ لیں...... کہیں کام خراب نہ ہو جائے.... کسی کو ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی تو اچھا نہیں ہو جانا ہے۔''

''نہیں ہوتا...''رستم ہنسا: ''وہ پیری مریدی اور مزاروں وغیرہ پر یقین رکھنے والے لوگ ہیں۔ تم جانتے ہو، ایسے لوگوں پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی.....اور جب انہیں پتا چلے گا کہ راہ حق کیا ہے تو They would be made to go there immediately''

رستم کی بات سن کر عبدل ہنسا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ میں مرکز سے رابطہ کر کے مشورہ کرتا ہوں۔''

عبدل کی بات سن کر رستم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جام کا ایک اور گھونٹ بھرا تھا۔

''آپ کو کل رات کا مال کیسا لگا تھا..؟''رستم نے 'مال' پر زور دے کر عبدل کی جانب جھکتے ہوئے پوچھا تو عبدل پہلے تو اس کا سوال سن کر چونکا، پھر ہنس پڑا۔

''اچھا تھا.... لیکن ویسا مزا نہیں آیا... زمانہ بڑا نڈر ہو گیا ہے، لیکن ہمیں وہی خوفزدہ آنکھوں والا مال ہی پسند ہے، سہما سہما سا''!

عبدل کا جواب سن کر رستم نے قہقہہ لگایا۔

''آپ فکر نہ کریں، اگلی دفعہ ویسے مال کا بھی بندوبست کر دیں گے...!بس منہ بند رکھنے کے لیے ذرا بھاری رقم دینا پڑتی ہے۔''

''جماعت آپ جیسے کھلے دل لوگوں کے لیے ہی تو کہتی ہے کہ آپ کو سو خون بھی معاف ہیں!اب دیکھیں ناں....اپنے ''فرائض'' کے سلسلے میں ہمیں کتنا عرصہ اپنی بیگمات سے دور رہنا پڑتا ہے۔آخر جوان

خون ہے، تو ایسے مواقع پر آپ لوگ ہی کام آتے ہیں۔" عبدل نے روایتی تعریفی انداز میں کہا تھا۔

"میرا یہ مال و دولت بھی تو آپ لوگوں اور ہمارے دینی بزرگوں کی برکت سے ہے ناں..."!

رستم نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ جام کا آخری گھونٹ بھی حلق سے نیچے اتار لیا۔

اب تیسرا جام رستم اپنے اندر انڈیل رہا تھا۔ کمرے میں سگار اور شراب کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی اس کے کمرے سے ایک عورت نکل کر گئی تھی۔ وہ اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا۔ عورت ذات کی حیثیت اس کے نزدیک بس اتنی ہی تھی کہ عورت کے آگے پیسہ پھینکو تو وہ فوراً اپنی عزت قربان کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ اُس کے اِس خیال کو بہت سی عورتیں اور جوان لڑکیاں تقویت دے چکی تھیں۔

ہر ہفتے اس کے فارم ہاؤس کے بیڈ روم میں ماحول وہی رہتا تھا لیکن عورت بدل جاتی تھی، لیکن اب کچھ مختلف ہو گیا تھا... اب اس کے حواسوں پر منال سوار ہو گئی تھی۔ جب رستم نے اسے پہلی بار الوینہ کے ہاسٹل کے گراؤنڈ میں گھاس پر بیٹھے پڑھائی کرتے دیکھا تھا، تبھی سے وہ منال کے معصوم سے حسن سے گھائل ہو گیا تھا۔ اُس سے پہلے تو وہ جسموں کو گھائل کرنے والوں میں سے تھا۔

وہ سگار سلگا چکا تھا اور اب اس کے کش پر کش بھرتے ہوئے کمرے میں ٹہلتا ہوا سوچ رہا تھا کہ کس طرح منال کو حاصل کیا جائے۔ دفعتاً وہ ٹھٹک کر رکا۔ اس کے چہرے پر گہری سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

....☆....

اصغر شاہ اور منگلا ربوہ سے واپس آ چکے تھے۔ بظاہر زندگی ویسی ہی چل رہی تھی جیسی پہلے تھی، لیکن زندگی اب اصغر شاہ کے لیے ویسی ہرگز نہیں تھی جیسی پہلے تھی۔ اب سکول کے بعد ان کا زیادہ سے زیادہ وقت یا تو اپنے اسٹڈی روم میں مطالعہ کرتے گزرتا تھا، جہاں بغیر دستک دیے اندر آنا سختی سے ممنوع تھا، یا پھر مہمان خانے میں منگلا کے ساتھ گفت و شنید کرتے گزرتا تھا۔ ربوہ سے واپسی پر انہیں جماعت کی طرف سے آٹھ جلدوں پر مشتمل قرآن مجید کی تفسیر کا سیٹ بھی تحفے میں دیا گیا تھا جو آج کل ان کے زیرِ مطالعہ تھا۔

"ابو جی! اب تو ہمارے لیے آپ کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔" ایک رات کھانے کی میز پر عمر نے شکوہ کر ہی ڈالا۔ اصغر شاہ نے چاولوں کو اپنی پلیٹ میں نکالتے ہوئے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ عمر اور

رابعہ نے بھی تائیدی نظروں سے اصغر شاہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"نہیں بیٹے! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" اصغر شاہ نے اسے تسلی دینا چاہی۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں بچے!" نگہت بیگم بھی کہہ اٹھیں: "عبدالکریم بھائی کے جانے سے پہلے آپ مغرب کے بعد کا سارا وقت ہمارے ساتھ گزارتے تھے۔ بچوں سے گپ شپ، میرے ساتھ باتیں وغیرہ۔ ہم مل کر ٹی وی دیکھتے تھے۔"

"اب تو آپ سارا وقت منگلا بھائی کے ساتھ گزارتے ہیں۔" عمر نے شکوہ کیا۔

"یا پھر اپنے اسٹڈی روم میں پڑھتے رہتے ہیں اور مجھے بھی اندر نہیں آنے دیتے۔" علی نے منہ بسورا۔

"اور نہ ہی اب آپ نو بجے والی خبریں سنتے ہیں۔" رابعہ بھی خاموش نہیں رہی۔ اصغر شاہ نے چند لمحے سب کے چہروں کی جانب دیکھا، پھر سوچنے لگے کہ اگر دنیا کو میرے بارے میں پتا چل گیا تو وہ میرے ان پیاروں کو مجھ سے چھین لے گی... لیکن اگر میں نے ہی انہیں ہدایت کی طرف نہ بلایا تو ان کا کیا بنے گا؟ ان کے ذہن میں بہت سی سوچوں نے اچانک حملہ کیا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟"

نگہت بیگم نے ان کی سوچوں کے تسلسل کو توڑا تھا۔

"اوہ.... کچھ نہیں..." اصغر شاہ چونکے، پھر مسکراتے ہوئے بولے،

"سوری بچو اور بچوں کی اماں! آج سے ان شاءاللہ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ آپ لوگوں نے اچھا کیا جو مجھے بتا دیا۔"

اس کے بعد خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا گیا تھا۔

جماعت کی طرف سے اصغر شاہ کو خاص ہدایت کی گئی تھی کہ ابھی اس بات کو راز میں رکھیں۔ ان کے مہمان خانے میں بھی ملاقاتیوں کے بھیس میں مربیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

"بھاء شوکت! شاہ جی آپ کو کچھ بدلے بدلے سے لگتے ہیں؟"

ایک دن شوکت اور مراد مل کر گاڑی دھو رہے تھے جب پائپ سے گاڑی کے ٹائر پر پانی کی تیز

بوچھاڑ ڈالتے ہوئے مراد نے پوچھا۔ سرف اور کپڑے سے گاڑی کے شیشے پر جھاگ بناتے ہوئے شوکت نے اسے دیکھا۔

''تمہیں کیوں ایسا لگا؟''

''بس ایسے ہی.... پتا نہیں..... اور اب شاہ جی کے مہمان بھی کافی آنا شروع ہو گئے ہیں۔ پہلے تو شاہ جی منتظر ہی رہتے تھے۔''

مراد نے دوسرے ٹائر پر پانی ڈالا تو اس کی درزوں میں پھنسا کیچڑ گیلا ہو کر بہنے لگا۔

''کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو.... اللہ جانے.... بس اپنے کام سے کام رکھ مرادے! آنے جانے والے پر نظر نہ رکھ.... ماسی مصیبتے کی طرح''!

آخری جملہ اس نے شرارت سے کہا تھا۔ مرادے نے بھی بدلے میں پائپ کا رخ اس کی جانب کر دیا تھا

....☆....

الوینہ اور منال باتیں کرتی ہوئی کلاس روم کی طرف جا رہی تھیں جب سامنے سے شہروز کو آتا دیکھ کر دونوں رک گئیں۔

''ہائے شہروز... !''الوینہ نے چہکتے ہوئے اُسے اشارہ کیا۔

''مجھے تم سے اکیلے میں کچھ بات کرنی ہے۔''

شہروز نے جواب میں سنجیدگی سے کہا تھا۔ الوینہ نے ایک نظر منال کو دیکھا تو وہ معذرت کرتے ہوئے کلاس روکی طرف بڑھ گئی۔ پھر اگلے ہی لمحے شہروز اور الوینہ نے برابر چلتے ہوئے دوسری سمت قدم بڑھا دیے۔

''بھئی جب سے تم اس منال نامی لڑکی سے ملنے جلنے لگی ہو، تب سے تم مجھے لفٹ ہی نہیں کرا رہی!'' شہروز نے ناراض لہجے میں کہا تھا۔ الوینہ نے اس کی جانب دیکھا اور پھر ہنس پڑی۔ کالی جینز کی پینٹ اور سفید ٹی شرٹ میں خفا خفا سا شہروز اس وقت اسے بہت پیارا لگا۔

"Someone is feeling jealous!!" الوینہ نے اس کے بازو پر مکا مارتے ہوئے ہنس کر کہا تو شہروز نے پھولے ہوئے منہ کے ساتھ اسے گھور کر دیکھا، پھر ٹھنڈی آہ بھر کر کہنے لگا:

"I am not jealous!.... صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ ۔آخری دفعہ ہم کب ملے تھے..؟ یاد ہے ناں..بہت دن ہوگئے...ویسے پہلے ہم چاروں کی کیسی محفل جمتی تھی، میں، تم، فہد اور بینش..... لیکن اب تو تم جیسے ہمیں بھول ہی گئی ہو! ہر وقت اس لڑکی منال کے ساتھ پھرتی رہتی ہو"!

شہروز نے کوریڈور میں ریلنگ کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے اس کہا تھا۔

"فہد اور بینش کا تو تم نام بھی نہ لو...!" الوینہ کا موڈ خراب ہوا: "میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ دونوں اندر سے کیا ہیں، لیکن ہاں! میں تم سے ایکسکیوز ضرور کرنا چاہوں گی، ہماری واقعی کچھ دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی....ایسا کرتے ہیں، آج یونی ورسٹی کے بعد کہیں چلیں..؟"

الوینہ نے کہا تو شہروز نے روٹھے پن کے ساتھ اسے دیکھا، پھر بولا:

"اوکے.... لیکن وہاں بھی اپنی اس سہیلی کو مت لے آنا۔ میں چاہتا ہوں وہاں صرف میں اور تم ہوں اور ہماری باتیں.... جیسے پہلے ہوا کرتی تھیں۔"

"یس سر!!" الوینہ نے ایک سپاہی کے سے انداز میں ہاتھ کو ماتھے تک لے جاتے ہوئے کہا تو شہروز آخر کار ہنس ہی پڑا۔

رات کو وہ دونوں ملاقات کی غرض سے ریسٹورینٹ پہنچ چکے تھے۔

"ہاؤ رومانٹک..!!" الوینہ نے ستائشی نظروں سے ریسٹورنٹ کا جائزہ لیا۔ باہر اگرچہ دھوپ تھی لیکن کھڑکیوں پر کالے شیشوں کی وجہ سے اندر بہت کم روشنی آرہی تھی۔ نیم تاریک ماحول کو دھیمے سروں کی موسیقی اور اے سی کی نامحسوس سی تازگی بھری ٹھنڈک مزید خواب ناک بنا رہی تھی۔ ہر میز کے درمیان میں جلتی ہوئی تین موم بتیاں رہی سہی کسر پوری کر رہی تھیں۔

"کیسا لگا پھر...؟" اس کے سامنے کی کرسی پر بیٹھے شہروز نے مسکراتی نظروں کے ساتھ اس سے پوچھا، جو ابھی تک اپنے اطراف میں دیکھ رہی تھی۔ ریسٹورنٹ میں اس وقت بہت تھوڑے لوگ موجود

تھے۔

''واؤ...! جسٹ واؤ...!!'' الوینہ نے تعریف میں سر ہلایا۔

''یہ ریسٹورنٹ پچھلے ہفتے ہی کھلا ہے۔ میرا بڑا دل تھا کہ تمہارے ساتھ یہاں آؤں لیکن تم ہاتھ ہی نہیں آرہی تھیں''!!

شہروز نے منہ بنایا تو الوینہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی کھلکھلاہٹ اس ماحول میں بہت بھلی لگی تھی۔

''اب تو ہاتھ آگئی ناں''!

''ہاں، اسی لیے تو فوراً یہاں لے آیا کہ اب دیدار کیے بنا صبر نہیں ہو پا رہا تھا''!

شہروز نے پُرشوق نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے، میز پر دھرے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ موم بتی کی ٹمٹماتی روشنی میں گہرے جامنی رنگ کی کُرتی پہنے الوینہ اس وقت شہروز کو بہت خاص لگ رہی تھی۔ الوینہ اس کی بات پر کھل کر مسکرائی تھی۔ اس سے پیشتر کہ شہروز کے صبر کا پیمانہ چھلکتا، الوینہ نے نرمی سے اس کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکالا تھا۔

''کھانے کو کچھ منگوائیں...؟ آج میں نے یونی کینٹین سے بھی کچھ نہیں کھایا۔''

''بہت ظالم ہو تم...!'' شہروز نے اس کی حرکت نوٹ کرلی تھی، تبھی منہ بنا کر ملامتی انداز میں بولا اور پھر خود ہی ہنس بھی پڑا۔

....☆....

اُس دن ساتویں جماعت کا کمپیوٹر لیب کا پیریڈ تھا۔ اب تو لڑکے کافی حد تک بنیادی کمپیوٹر پر گرامنگ میں تیز ہو گئے تھے۔

''پلیز سر! آج تو ہمیں پڑھائی کی بجائے کمپیوٹر پر گیم کھیلنے دیں۔ سچ میں پرنسپل صاحب کو نہیں پتا چلے گا۔''

ریحان نے مسکین سی صورت بنا کر کہا تھا۔ منگلا ہنس پڑا۔

"پلیز سر! آج تو صبح سے ٹیسٹ پر ٹیسٹ دیے جا رہے ہیں۔ پہلے میتھس کا ٹیسٹ ہوا، پھر سائنس کا اور اس کے بعد انگلش essay writing کا۔ اب تو دماغ میں فریکشن، آکسیجن اور 'مائی بیسٹ فرینڈ' سب گڈ مڈ ہو گیا ہے!" فاخر نے بے چارگی سے کہا تو سب لڑکے ہنس پڑے۔

"جی سر....."!!

"واقعی سر ایسا ہی ہے۔"

سبھی لڑکے منگلا کو قائل کرنے کی کوششوں میں لگ گئے تھے۔

"اچھا اچھا مظلومو!" بالآخر منگلا نے ان کے اصرار کے آگے ہار مان لی: "لیکن پہلے دس منٹ تو پڑھنا پڑے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ باقی کا آدھا گھنٹہ تم لوگوں کو کمپیوٹر پر گیم کھیلنے دوں گا۔" جواب میں لڑکوں نے خوشی سے تالیاں پیٹی تھیں۔

"اچھا اب...." ابھی منگلا نے اتنا کہا ہی تھا کہ شوکت لیب میں داخل ہوا۔

"سر جی! بلال کو شاہ جی بلا رہے ہیں۔" وہ سکول کے اوقات میں منگلا کو سر کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

"اوکے، جاؤ بلال...!!" منگلا نے کہا تو بلال اٹھ کر لیب سے باہر نکل آیا۔ شوکت اسٹاف روم کی جانب جبکہ بلال پرنسپل آفس کی طرف بڑھ گیا۔

....☆....

"بیٹے! یہ دوائی اپنی امی کو جا کر دے آؤ۔ ان کا فون آیا تھا کہ کوئی دوائی ہے تو بلال کے ہاتھوں بھیج دیں۔ انہیں مائیگرین کا درد ہو رہا ہے۔"

اصغر شاہ نے ایک ہومیوپیتھ دوائی بلال کی طرف بڑھائی تھی۔

"انکل! آپ یہ سب کام کیسے کر لیتے ہیں؟ آپ پرنسپل بھی ہیں، ہومیو ڈاکٹر بھی ہیں، ہر وقت کتابیں بھی پڑھتے رہتے ہیں"!

بلال نے دوائی کی شیشی پکڑتے ہوئے رشک بھرے لہجے میں کہا تو اصغر شاہ ہنس پڑے۔

"بس بیٹے! اللہ توفیق دے دیتا ہے، تعلیم و تعلم اگر میرا پیشہ ہے تو ہومیو پیتھی میرا شوق۔ انسان تو

بیک وقت بہت سے شوق پال لیتا ہے۔ چلو اب فوراً سائیکل پر نکلو اور بغیر وقت ضائع کیے واپس پہنچو۔ تمہاری کمپیوٹر کلاس مِس نہیں ہونی چاہیے۔"

"جی سر...!!" بلال زیرِ لب مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ پرنسپل صاحب کو کیا بتاتا کہ کمپیوٹر کلاس میں پڑھائی تو بس شروع کے دس منٹ ہی ہونی تھی، باقی وقت تو منگلا کی طرف سے انہیں کمپیوٹر گیم کھیلنے کی اجازت ملی ہے، اور یہ 'قیمتی' وقت وہ کیونکر ہاتھ سے جانے دیتا!

امی جان کو دوائی پکڑا کر وہ تیز تیز پیڈل مارتا ہوا واپس سکول پہنچا تھا۔ گرمی اور تیز سائیکل چلانے کی وجہ سے وہ پسینے میں بھیگ چکا تھا۔ وہ کمپیوٹر لیب میں خاموشی سے داخل ہوا تھا کیونکہ سر منگلا کی سختی سے ہدایت تھی کہ اگر کسی کام سے دورانِ کلاس باہر جانا پڑے تو واپسی پر بغیر اجازت لیے کلاس میں آیا جائے تاکہ تدریسی عمل میں خلل نہ پڑے۔

روشنی سے یکدم قدرے تاریک کمپیوٹر لیب میں داخل ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں تھوڑی دیر کو چندھیا سی گئی تھیں۔ لیب میں سر منگلا کچھ بات کر رہے تھے لیکن گرمی سے پریشان بلال ابھی ان کی بات کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس نے کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں موند لیں اور شرٹ کے گریبان کو ہلا کر پسینہ خشک کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران اس کی سماعت میں سر منگلا کا ایک جملہ پڑا۔ پہلے تو بلال کو سمجھ ہی نہیں آئی کہ بات ہو کیا رہی ہے، لیکن جیسے ہی اس کے دماغ نے منگلا کی بات کو سمجھا، اس کی آنکھیں جھٹ سے کھل گئیں۔ وہ فوراً چونک کر سیدھا ہو کر بیٹھا تھا۔

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر کشمیر میں سری نگر کے محلہ خانیار میں ہے۔"

اس سے پیشتر کہ منگلا کچھ اور بھی کہتا، بلال تیزی سے کھڑا ہوا تھا۔ "ایکسکیوز می سر"!

منگلا کو توقع نہیں تھی کہ بلال اس طرح اسے ٹوکے گا۔ اس نے گڑبڑا کر منگلا کی طرف دیکھا: "کہو بلال...! کیا بات ہے؟"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟" بلال نے حیرت اور ناگواری سے پوچھا تھا۔

"وہ...!! میں آپ سب کو یہی بتا رہا ہوں کہ حضرت عیسیٰ کی قبر کشمیر میں ہے۔"

"سر! آپ کس طرح کی بات کر رہے ہیں؟؟" بلال نے تیزی سے کہا تھا۔ اس کی آواز کچھ بلند ہو گئی تھی۔

"کیوں کیا ہوا؟ میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔"

منگلا اپنی حیرت پر قابو پا چکا تھا اس لیے اعتماد سے بولا۔ پوری کلاس ان دونوں کی گفتگو کو حیرانی سے سن رہی تھی۔

"سر! حضرت عیسیٰؑ کا تو ابھی نزول ہونا ہے۔ ان کا نزول تو قیامت کی بڑی نشانیوں میں سے ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ وفات پا چکے ہیں؟"

کچھ عرصہ قبل دادا کے گھر اس نے قیامت کی نشانیوں کے بارے میں ایک کتاب بڑے شوق اور غور سے پڑھی تھی۔ منگلا سے بحث کے دوران اسے وہ کتاب بروقت یاد آئی۔ اس بات پر منگلا کچھ گڑبڑا گیا۔

"ارے نہیں بلال! یہ آپ کو کس نے کہہ دیا کہ ان کا نزول ہونا ہے؟" منگلا نے مسکراتے ہوئے کہا، جیسے بلال کا اعتراض بلاجواز تھا۔

"سر جی! قرآن اور حدیثوں سے ہمیں یہ بات پتا چلی ہے۔" بلال اپنے موقف پر ڈٹ گیا تھا:

" یعنی میں نے آپ کی اور اصغر انکل کی باتوں سے جو سمجھا تھا، وہ درست تھا!" بلال نے دل میں سوچا۔

"ایسی بات ہے تو آپ مجھے قرآن کی ایک بھی آیت ایسی لا کر دکھا دیں جس میں کہا گیا ہو کہ حضرت عیسیٰؑ واپس آئیں گے۔"

منگلا کے لہجے میں جیسے یقین تھا کہ بلال ایسا نہیں کر سکے گا۔

"اور سر، اگر آپ کی بات مان بھی لیں کہ حضرت عیسیٰؑ فوت ہو گئے ہیں، تو پھر دجال جب آئے گا تو اسے کون قتل کرے گا؟ احادیث میں تو یہی ملتا ہے ہمیں کہ حضرت عیسیٰؑ دجال کو قتل کریں گے۔"

بلال کی جرات سے عمر کو بھی حوصلہ ہوا اور اس نے بھی کھڑے ہو کر منگلا سے سوال کر دیا۔

"سر! کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کے نزول کے حوالے سے ساری احادیث نعوذ باللہ

غلط ہیں؟؟' '

محسن بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ سارے لڑکے منگلا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہے تھے۔ منگلا اس صورت حال سے کچھ گھبرا گیا۔

''بس میں نے آپ سے اتنا کہا ہے کہ مجھے کوئی ایک آیت دکھادیں تو میں آپ کے موقف کو مان لوں گا۔''

''ٹھیک ہے سر!'' بلال نے بے خوف ہو کر، سینہ تان کا جواب دیا: ''ہمیں کچھ دن کی مہلت دیں۔ ہم ان شااللہ ضرور پوری تیاری کے ساتھ آئیں گے اور اس موضوع پر بات کریں گے۔''

''جتنی چاہے مہلت لے لیں، لیکن مجھے یقین ہے آپ کو ایک بھی آیت ایسی نہیں ملے گی جو آپ کے اس موقف کی تائید کرتی ہو۔'' منگلا نے سینے پر دونوں بازوؤں کو فولڈ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ نے بلال کے غصے کو اور مہمیز کر دیا تھا۔ اسی وقت کلاس ختم ہونے کی گھنٹی بج گئی تھی۔

....☆....

بابا اسحاق ابھی نہا کر نکلا ہی تھا کہ گھر کے دروازے کے باہر سے کسی نے آواز لگائی۔

''باباساکو...!!!'' وہ انو کمہار کی آواز تھی۔ اصل نام تو انور تھا لیکن بگڑ کر اب 'انو' بن گیا تھا۔

''آتا ہوں بھئی...!'' بابا اسحاق نے جلدی جلدی بالوں میں کنگھی کی اور باہر نکل گیا۔

''میں کیا سرکار سلاما لیکم...''!

''وعلیکم السلام... خیر اے؟'' بابا اسحاق نے اس سے ہاتھ ملایا۔

''آہو.. خیری اے... نمبر دار صاحب نے تینوں بلاوا بھیجا ہے۔ ذرا آجا...'' انو نے مڑتے ہوئے کہا۔ وہ ایک پاؤں پر قدرے زور ڈال کر چلتا تھا۔

''اللہ خیر کرے... چودھری صاب نے کیوں بلایا اے...؟'' بابا اسحاق پریشان ہو گیا۔

''اللہ جانے تے چودھری جانے...'' انو کمہار نے جواب دیا تھا۔ بابا اسحاق اس کے پیچھے پیچھے چودھری کی حویلی کی طرف چل پڑا۔

''سلام چودھری جی...''!!

''اوو علیکم السلام ساکو... کی حال اے؟''

''بس شکر ہے رب دا چودھری جی.. چنگا اے.... تواڈی بڑی مہربانی...''

بابا اسحاق نے چودھری کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا اور اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔

''او کی کردے او تسی! اُٹھ کے اوپر چارپائی تے بیٹھو....''

چودھری جی نے ایک چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ بابا اسحاق ہچکچاتے ہوئے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''ہور سب ٹھیک ہے؟''نمبردار جی نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے پوچھا۔

''جی چودھری جی.....سب خیراں نیں۔''

''تیرے گھر پچھلے جمعراتی کچھ شہری لوگ آئے تھے..... خیر سے آئے تھے؟''چودھری نے پوچھ ہی لیا۔ بابا اسحاق گڑبڑا گیا۔ وہ اس سوال کی پہلے سے توقع کر رہا تھا۔ چھوٹے سے گاؤں میں بڑی سی جیپ کا آنا معمولی بات نہیں تھی۔

''آہو سرکار....او میری دھی پڑھائی کرتی ہے ناں لاہور... اُس کی سہیلی آئی تھی اپنے بابو کے ساتھ....ایسے ای بس گاؤں شاؤں کی سیر کرن واسطے....''

بابا اسحاق نے جان بوجھ کر رقم کا ذکر گول کر دیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر بات نکلی تو کہیں چور اچکا اس کے گھر آکر اتنی بڑی رقم اٹھا کر نہ لے جائے۔

''اچھا اچھا..... یہ شہری لوگ بھی عجیب ہی ہوتے ہیں۔''چودھری ہنسا:

''دیکھنے کی چیزیں تو شہروں میں ہوتی ہیں۔ یہاں تو بس فصلیں ہیں یا کھیت...''

چودھری جی کی بات سن کر ان کے ارد گرد موجود سبھی لوگ بابا اسحاق سمیت ہنس پڑے تھے۔

....☆....

سر سعید ابھی ابھی دسویں جماعت کی کلاس لے کر فارغ ہوئے تھے اور کلاس روم سے نکلے ہی تھے

کہ غصے سے بھرا ہوا بلال اور عمران کے پاس جا پہنچے۔

''سر! مجھے نزول حضرت عیسیٰ کے بارے میں قرآن اور احادیث کے حوالے چاہییں۔'' بلال نے بغیر کسی سلام دعا کے، فوراً اپنا مدعا بیان کیا تھا۔

''کیا ہوا بلال بیٹے؟ مجھے بات تو بتاؤ۔'' سر سعید اس کے غصیلے تاثرات دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

''سر! یہ جو منگلا ہے ناں! یہ اسی جماعت کا بندہ ہے! آپ نے بتایا تھا ناں کہ ان لوگوں کا پہلا وار ہی یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں حضرت عیسیٰ کی وفات اور نزول کے بارے میں شک ڈالتے ہیں۔ یہ بندہ بھی آج ہمارے ساتھ یہی کرنے کی کوشش کر رہا تھا!'' بلال بپھرا ہوا تھا۔

''یہاں نہیں، گراؤنڈ میں چل کر بات کرتے ہیں۔ مجھے تسلی اور آرام سے پوری بات بتاؤ۔'' سر سعید نے اس کا بازو پکڑا اور اسے لے کر سکول گراونڈ کی جانب بڑھ گئے۔ عمر بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ وہاں ایک بینچ پر بیٹھ کر سر سعید نے کہا،

''اب پوری بات بتاؤ۔'' جواب میں عمر نے پورا ماجرا بیان کر دیا تھا۔ تفصیل سننے کے بعد سر سعید نے ان دونوں کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھے تھے۔

''بات سنو تم دونوں! تم دونوں کا جذبہ ایمانی قابل قدر ہے لیکن میرے بچو! ہمارے علماء یہ کہتے ہیں کہ کوئی غیر عالم ان کے ساتھ بحث نہ کرے اور تم دونوں تو ابھی بہت چھوٹے ہو، تم لوگوں کے پاس اس کے مقابلے میں ناکافی علم ہے۔ یہ لوگ بات کو گھما کر کرنے میں اتنے ماہر ہوتے ہیں کہ غیر عالم کو بہت آسانی سے بھٹکا دیتے ہیں۔ مجھے تم دونوں کا ایمان عزیز ہے۔ اس لیے مجھے تھوڑا سا وقت دو، اس سارے معاملے کو میں خود دیکھ لیتا ہوں۔''

''لیکن سر ہمارا ایمان اتنا کمزور نہیں ہے کہ ایسے کسی شخص سے بحث کرنے پر داؤ پر لگ جائے گا۔'' بلال نے احتجاج کیا تھا۔

''تمہیں معاملے کی نزاکت کا اندازہ نہیں ہے بیٹے..!! بس اب یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ ہاں میں اتنا ضرور کہوں گا کہ تم لوگ قرآن کو آج سے تفسیر کے ساتھ پڑھنا شروع کر دو تا کہ تم لوگ سمجھ سکو۔ پھر ان

شااللہ کوئی تمہارے ایمان کو ڈگمگا نہیں پائے گا۔“

سر سعید نے ان دونوں کو یقین دلایا تھا۔تب تک بلال کا غصہ بھی قدرے کم ہو چکا تھا۔

”ٹھیک ہے سر...“!

بلال اور عمر اپنے کلاس روم، جبکہ سر سعید پرنسپل آفس کی جانب بڑھ گئے۔

....☆....

”الوینہ میڈم! باہر آپ کا ڈرائیور آیا ہے۔“آیا جی نے الوینہ کے کمرے میں آکر اسے بتایا تو وہ حیران ہو گئیں۔

”میرا ڈرائیور...؟“

”جی...“!!

”اچھا، میں آتی ہوں۔“الوینہ نے کہا تو آیا جی کمرے سے نکل گئیں۔

”ڈرائیور کیوں آیا ہے؟“الوینہ نے خود کلامی کی اور حیران سی کمرے سے باہر نکل گئی۔ہاسٹل کے گیٹ کے باہر گاڑی سے ٹیک لگائے ڈرائیور کھڑا تھا جو اسے آتا دیکھ کر فوراً مودب انداز میں کھڑا ہو گیا۔

”میڈم..! باس نے گاڑی بھیجی ہے آپ کے لیے کہ آپ کو گھر لے جاؤں۔“اس کے استفسار پر ڈرائیور نے بتایا تھا۔

” Is everything ok?“الوینہ کو حیرت ہوئی۔ابھی پچھلے جمعہ کو تو گھر سے آئی تھی۔

”یس میڈم... لیکن باس کا آرڈر ہے کہ آپ کو گھر لے جاؤں۔انہیں آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“

”اچھا....؟“الوینہ کو تعجب ہوا:”اوکے، تم ten minutes wait کرو، میں آتی ہوں۔“

یہ کہہ کر الوینہ واپس ہاسٹل پلٹ گئی۔

اس نے اپنے جانے کا منال کو بتایا تو اسے بھی بہت حیرت ہوئی۔

”اللہ کرے سب ٹھیک ہو۔پتا نہیں آپ کے ڈیڈی نے آپ کو اس طرح کیوں بلایا ہے۔“

"وہاں جا کر ہی پتا چلے گا۔اب کل ہی میری واپسی ہو گی۔"

"چلیں،آپ خیر سے جائیں اور خیر سے آئیں۔" منال نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد الوینہ گاڑی میں بیٹھی چنیوٹ کی جانب محوِ سفر تھی۔

....☆....

سکول میں بات پھیل چکی تھی۔اصغر شاہ نے منگلا کو اپنے دفتر میں طلب کیا تھا۔

دل میں مطمئن سا منگلا دفتر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو چونک گیا۔وہاں اصغر شاہ کے ساتھ سر سعید بھی موجود تھے۔

"السلامُ علیکم سر...!! مجھے آپ نے بلایا؟"

"وعلیکم السلام...!! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟" اصغر شاہ کے لہجے میں سختی تھی۔منگلا کو حیرت ہوئی۔

"آپ نے کیا سنا ہے سر...؟" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے انجان بننے کی کوشش کی۔

"مجھ تک ساتویں جماعت کے لڑکوں کی تمہارے بارے میں شکایت پہنچی ہے کہ تم نے ان سے حساس موضوع پر بات کرنے کی کوشش کی ہے۔کیا یہ درست ہے؟" اصغر شاہ نے پوچھا تھا۔جواب میں منگلا نے سر جھکا لیا۔

"آپ کی خاموشی بتا رہی ہے کہ آپ نے واقعی لڑکوں سے ایک بالکل غیر متعلقہ موضوع پر بات کرنے کی کوشش کی ہے۔آپ انہیں کیا بتانا چاہتے تھے؟" اب سر سعید نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"سر...! میں نے تو بس ایسے ہی ایک بات کی تھی ان سے.... میرا کوئی خاص مقصد نہیں تھا۔" منگلا نے بات بنانا چاہی۔

"لیکن تمہاری اس حرکت کی وجہ سے سکول کا ماحول بہت تناؤ کا شکار ہو گیا ہے۔"

اصغر شاہ نے مضطرب انداز میں اپنی شہادت کی انگلی کو میز پر ہلکا ہلکا سا مارنا شروع کر دیا تھا۔

"سر! اگر آپ اجازت دیں تو میں ان سے کچھ سوال کر لوں؟" سر سعید نے اصغر شاہ سے پوچھا۔

''جی جی، ضرور....''!

''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ....'' سر سعید نے کھوجتی نگاہوں سے منگلا کو گھورا:

''کیا آپ کو اس بات کا یقین نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ کا دوبارہ نزول ہوگا؟''

''کیوں نہیں سر، مجھے مسیح موعود کے نزول پر پورا یقین ہے۔'' منگلا نے جلدی سے جواب دیا تھا۔

''بس مجھے یہی پوچھنا تھا سر...!'' سر سعید نے اصغر شاہ کی جانب دیکھا: ''کیا میں آپ سے تنہائی میں ایک ضروری بات کر سکتا ہوں؟''

''جی ہاں، بالکل..!'' اصغر شاہ نے جواب دیا۔ پھر منگلا کی جانب دیکھ کر کہنے لگے،

''تم فی الحال گھر جاؤ، بعد میں بات کرتے ہیں۔''

''جی سر..!'' منگلا نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا اور دونوں کو سلام کر کے دفتر سے باہر نکل گیا۔

''فرمائیے سعید صاحب! آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟'' اس کے جانے کے بعد اصغر شاہ نے سر سعید سے کہا تھا۔

''یہی کہ منگلا کا اسی جماعت سے تعلق ہے جسے حکومتِ پاکستان کچھ عرصہ قبل غیر مسلم قرار دے چکی ہے۔'' سر سعید نے پورے وثوق سے جواب دیا تھا۔

''کیا...؟'' اصغر شاہ ان کی بات سن کر ہکا بکا رہ گئے تھے۔

....☆....

''واٹ...؟ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ...؟'' رستم رئیس کی بات سن کر الوینہ اچھل ہی پڑی تھی۔

''جو تم نے سنا ہے..... میں منال سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

رستم رئیس نے اطمینان سے سگار سلگاتے ہوئے جواب دیا اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھالی۔ وہ دونوں اس وقت ٹی وی لاؤنج میں موجود تھے۔

''Unbelievable!!Totally unbelieveable!!!'' الوینہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا:

''وہ میری دوست ہے ڈیڈی! آپ اس کے بارے میں ایسا کس طرح سوچ سکتے ہیں؟ '

''اس کے بھلے کا سوچا ہے، تبھی تو شادی کرنا چاہ رہا ہوں۔'' رستم نے دھواں ہوا میں چھوڑا: ''دیکھو الوینہ...''!

دفعتاً وہ سیدھے ہو کر بیٹھے اور دونوں کہنیوں کو اپنے گھٹنوں پر رکھ کر آگے کی جانب جھکے: ''میں بہت آگے کی سوچ رہا ہوں۔ تمہاری اس کے ساتھ اتنی اچھی فرینڈشپ ہو گئی ہے، کیا تم نہیں چاہو گی کہ تم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے قریب رہو؟ اگر اس کی کہیں اور شادی ہو گئی تو پتا نہیں اس کا شوہر اس سے تمہاری دوستی برقرار رہنے بھی دے گا یا نہیں۔'' ڈیڈی کی بات سن کر الوینہ نے اک گلدان اٹھا کر دیوار پر دے مارا تھا۔

''آپ...آپ ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں ڈیڈی؟''

اب وہ اپنے سر پر ہاتھ رکھے اضطرابی کیفیت میں تیز تیز قدموں سے صوفوں کے درمیان چل رہی تھی۔

''جب میں نے اس کے گھر کی حالت دیکھی تو I felt so sorry for her and her family! بے چارے کس طرح کے گھر میں رہ رہے ہیں۔ حالانکہ اس طرح کے حسن کو تو کسی رئیس کے گھر رہنا چاہیے!! رستم رئیس کے گھر...''!!

الوینہ کی کیفیت کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے رستم رئیس سگار کا کش بھرتے ہوئے اپنی کہے جا رہا تھا۔

گلدان ٹوٹنے کی آواز پر ملازمہ دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی تھی۔

''گیٹ آؤٹ...!!'' اسے دیکھتے ہی الوینہ نے چلا کر کہا تو وہ جن قدموں پر دوڑتی ہوئی آئی تھی، انہی قدموں پر فوراً واپس پلٹ گئی۔

''بڑے لوگوں کے بڑے ڈرامے...!'' ملازمہ نے دل میں سوچا اور منہ بنا کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ سن گن لینے کو دل تو بہت چاہ رہا تھا لیکن رستم کا ڈر بھی تھا کہ اسے پتا چلا تو وہ کہیں اِسے کتوں کے

آگے نہ ڈلوادے!

''یو نو...! میں نے جب اسے پہلی دفعہ دیکھا تھا تو تبھی احساس ہو گیا تھا کہ وہ مختلف ہے! دوسری لڑکیوں سے بہت مختلف...''!

الوینہ نے حیرت سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے اس کی بہترین سہیلی کے بارے میں کیسی باتیں کر رہے تھے! کیا وہ سنجیدہ ہیں یا اُسے زِچ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟ اس نے رستم کے چہرے پر جواب جاننے کی کوشش کی لیکن کوئی اندازہ نہ لگا پائی۔

''سٹاپ اٹ ڈیڈی! جسٹ سٹاپ اٹ...!!'' الوینہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر چلائی تھی: ''وہ میری بیسٹ فرینڈ ہے!! وہ ان ولگر لڑکیوں جیسی نہیں ہے جن میں آپ دلچسپی رکھتے ہیں..... I can't believe آپ میری فرینڈ کو بھی اس کیٹیگری میں رکھ رہے ہیں.... شیم آن یو...''!

آخر میں الوینہ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ایک دم رستم کا چہرہ سرخ ہوا اور وہ جھٹکے سے اٹھ کر اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔

''ولگر نہیں ہے تبھی اس سے شادی کرنا چاہ رہا ہوں...!! سمجھیں تم.....!! اگر اسے بھی بدقماش عورتوں جیسا سمجھا ہوتا تو ابھی ڈرائیور کو لاہور بھیج کر تمہیں بلوا کر تمہیں اپنا ارادہ نہ بتا رہا ہوتا، اُس کو اٹھوا کر اپنے فارم ہاؤس لے جا رہا ہوتا...! تم بہت اچھی طرح جانتی ہو ایسا کرنا میرے لیے بالکل بھی مشکل نہیں ہے''!

الوینہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے رستم کی بات سنی، پھر ڈھے جانے والے انداز میں صوفے پر گر کر رونا شروع ہو گئی۔

''پوری زندگی میں میری صرف ایک ہی فرینڈ بنی ہے۔ جس کے سامنے مجھے کسی بھی قسم کا خول نہیں چڑھانا پڑتا۔ اور آپ...آپ مجھ سے میری وہ سہیلی بھی چھیننا چاہتے ہیں...!'' الوینہ کو دلی صدمہ ہوا تھا۔

''ارے میری جان... میری پیاری بیٹی...''!

رستم نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا:

''چھین تھوڑی رہا ہوں، میں تو ہمیشہ کے لیے اسے تمہارے پاس رکھنا چاہ رہا ہوں۔ تم میری بات سمجھنے کی کوشش تو کرو.. میں کوئی غلط کام تو نہیں کر رہا۔''

اپنے ڈیڈی کی بات سن کر الوینہ نے ایک جھٹکے سے ان کے ہاتھ کو دور کیا اور بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

الوینہ اور رستم کا دوبارہ آمنا سامنا اگلی دوپہر کو ہوا۔ تب تک الوینہ کچھ سوچ چکی تھی۔

''آپ منال سے شادی نہیں کر سکتے...!'' اس نے بڑے ٹھوس انداز میں کہا تو ٹی وی پر رقص کا پروگرام دیکھتے رستم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیوں.. کوئی۔ وجہ۔؟''

''کیونکہ ہمارے مذہب میں غیر مذہب سے شادی نہیں کی جا سکتی۔''

الوینہ نے بہت پُراعتماد لہجے میں کہا۔ رستم حیرت سے کچھ لمحے تو اس کے چہرے کو دیکھتے رہے، پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا..؟'' رستم نے ٹی وی کی آواز آہستہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے کتابوں میں پڑھا ہے۔ ہمارے آغا جانی نے کہا ہے کہ جو شخص ہمارے حلقہ دین میں شامل نہ ہو، وہ مومن نہیں ہے اور کسی غیر سے شادی کرنے سے انہوں نے منع فرمایا ہے۔'' الوینہ کے لہجے کا اعتماد ابھی بھی قائم تھا۔ رستم نے اس کے اعتماد کا لطف لیا۔

''ویسے تو تم نے کبھی ان کی تعلیمات کو غور سے پڑھا نہیں، تم تو مذہب بیزار تھی، پھر اچانک یہ کایا کیسے پلٹ گئی؟''

''اس لیے آپ منال سے شادی کا خیال دل سے نکال دیں۔'' الوینہ نے ان کا سوال ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ حضورِ اعلیٰ نے فرمایا ہے کہ تبلیغ کی نیت سے غیروں میں شادی کی جا سکتی ہے۔'' وہ دوبارہ ٹی وی کی جانب متوجہ ہو گئے جہاں ایک رقاصہ رقص کرنے میں مگن تھی۔

"تو کیا آپ اس سے شادی جماعت کی خدمت کے لیے کر رہے ہیں؟"

الوینہ نے ٹی وی سکرین کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ اس نے دونوں بازوؤں کو سینے پر فولڈ کیا ہوا تھا۔

"ہاں بالکل.... ویسے بھی یہ اچھا آئیڈیا ہے!" رستم مسکرایا: "اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو جائیں گے.... کیا خیال ہے؟"

جواب میں الوینہ پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ کمرے سے نکلی اور تیزی سے باہر کے دروازے کی جانب لپکی۔

"صفدر!! مجھے ہاسٹل ڈراپ کردو...."

اس نے آواز لگائی تو ٹی وی میں مگن رستم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، پھر جلدی سے اٹھ کر اس کے پیچھے لپکے۔ تب تک وہ باہر نکل چکی تھی اور اب باغیچے میں کھڑی، سُتے ہوئے چہرے کے ساتھ گاڑی کی جانب دیکھ رہی تھی جس کے اگنیشن میں ڈرائیور چابی گھما رہا تھا۔

"ابھی سے جا رہی ہو؟ میں نے تو ابھی تم سے اپنا پلان بھی تفصیل کے ساتھ ڈسکس کرنا تھا"!

رستم نے اس کے برابر میں کھڑے ہوئے ہوئے کہا۔ الوینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تمہاری مرضی ہے بھئی.... جانا چاہ رہی ہو تو شوق سے جاؤ....اور اپنی سہیلی سے بات ضرور کرنا اس کے بارے میں جو میں نے تمہیں کہا ہے۔"

الوینہ نے ابھی بھی کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ گاڑی اب ریورس میں اس کے قریب آرہی تھی۔

"جتنی جلدی بات کر لو، اُتنا ہی اچھا ہے..... مجھے نیک کام میں تاخیر پسند نہیں..... ویسے بھی میرا خیال ہے وہ فوراً مان جائے گی۔ اتنے مال و دولت کو کون ٹھکراتا ہے...!! لیکن Just incase اگر وہ نہ مانی تو تم نے ہر حال میں اسے قائل کرنا ہے.... ورنہ تمہیں تو پتا ہی ہے کہ میں جب کسی کو حاصل کرنے کی ٹھان لوں تو اسے حاصل کر کے ہی دم لیتا ہوں۔ چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے..... کچھ بھی...."!!!

رستم نے نارمل انداز میں بہت بڑی دھمکی دے دی تھی۔ الوینہ نے پہلی دفعہ اپنے باپ کی طرف نفرت اور حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور شاک کی حالت میں سر ہلاتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ دور ہوتی گاڑی کی جانب رستم نے مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں الوداعی ہاتھ ہلایا تھا۔

....☆....

''شاہ جی! وہ جی کچھ لوگ باتیں کر رہے ہیں کہ...'' چائے کی ٹرے لے کر مراد کچھ ثانیے قبل ہی مہمان خانے میں داخل ہوا تھا اور ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ منگلا بھی کمرے میں داخل ہوا۔ مراد اسے دیکھ کر بات کرتے کرتے ہچکچا گیا۔ منگلا نے بھی کن اکھیوں سے اسے دیکھا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

''لوگوں کو باتیں کرنے دو مراد...!'' اصغر شاہ نے میز پر اخبار رکھ کر چائے کا کپ اٹھالیا: ''میں اسی سلسلے میں منگلا سے بات کر رہا ہوں۔ بغیر کسی ثبوت کے، صرف ایک سوال کی وجہ سے میں کسی کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیتا۔''

''ٹھیک ہے شاہ جی...!'' مراد نے ایک نظر منگلا پر ڈالی اور کمرے سے نکل گیا۔

''شاہ جی! آپ نے وہاں میری حمایت کیوں نہیں کی؟'' اس کے جانے کے بعد منگلا نے شکوہ کیا۔

''پہلے تم خود محتاط تھے اور اب تم چاہ رہے ہو کہ میں سب کے سامنے تمہارے ساتھ ساتھ اپنی حقیقت بھی ظاہر کر دیتا؟''

اصغر شاہ نے چائے کی بھاپ کے عقب سے اسے گھورا۔

'' مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ابھی کسی کو میرے بارے میں پتا نہ چلے۔ وقت آنے پر سب کو پتا چل ہی جانا ہے۔ تب تک چوری چھپے جتنے بھی لوگوں تک ہدایت پہنچ سکتی ہے، پہنچا دیں۔ ایک دفعہ لوگوں کو میرے بارے میں پتا چل گیا تو میرا بھی اسی طرح بائیکاٹ شروع ہو جانا ہے جیسے تم لوگوں کا ہوتا ہے۔''

اصغر شاہ نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے بتایا تھا۔

''لیکن اب آپ کیا کریں گے؟'' منگلا نے ابھی تک چائے کے کپ کی جانب ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔

''کرنا کیا ہے، تمہیں اسکول سے فارغ کروں گا کچھ عرصے کے لیے، اور جب معاملہ کچھ ٹھنڈا ہو

جائے گا تو دوبارہ بلالوں گا۔ "

اصغر شاہ کے لیے میں سکون تھا، جیسے یہ ان کے لیے بڑی بات نہ ہو۔

"اور وہ سر سعید..!!انہوں نے آپ سے کیا کہنا تھا؟"

"انہیں تمہارے ایک ہی جملے سے یقین ہو گیا تھا کہ تمہارا کس جماعت سے تعلق ہے۔" اصغر شاہ کے ماتھے پر تفکر کی شکنیں ابھریں۔

"اوہ..."!!

"فکر نہ کرو، ان کا بندوبست بھی کرتا ہوں۔"

اصغر شاہ نے چائے کا خالی کپ واپس میز پر رکھا:

" جب تک وہ اس اسکول میں ہیں، ہم اپنے پیغام کو نہیں پھیلا پائیں گے۔ جذبات نے لوگوں کی عقلوں کو بہت محدود کر دیا ہے۔ لیکن میرا یہ عزم ہے کہ میں اپنے ارد گرد رہنے والے لوگوں کو اپنے نبی کی جانب بلاؤں اور حضرت مسیح موعود و مہدی معبود کی تعلیمات کو عام کروں تا کہ لوگ فلاح پا سکیں۔"

"آپ ضرور کامیاب ہوں گے۔" منگلا نے مسکراتے ہوئے کہا اور چائے کے کپ کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

....☆....

اگلے ہی دن منگلا کو اسکول ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ اس نے بھی فوراً اپنا بوریا بستر سمیٹا اور وہاں سے چلا گیا۔

''سر! پلیز آج ہم نے کچھ نہیں پڑھنا۔ آپ ہمیں ان لوگوں کے بارے میں مزید بتائیں۔'' سر سعید ابھی کلاس میں آکر اپنی نشست پر بیٹھے ہی تھے کہ ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فیروز بول اٹھا۔

''جی سر! آپ نے اس دن کہا تھا کہ آپ ہمیں بتائیں گے۔'' بلال نے انہیں یاددہانی کروائی تو سر سعید مسکرائے۔

''اچھا بھئی، ٹھیک ہے۔ آج اسی موضوع پر بات کر لیتے ہیں۔ آپ لوگوں کے لیے ان باتوں کا جاننا بھی بہت ضروری ہے۔''

''سر! کیا واقعی سر منگلا کا اس جماعت سے تعلق تھا؟'' ارسلان نے پُر تجسس لہجے میں پوچھا۔

''ہاں بیٹے! یہ لوگ اپنے نام نہاد نبی کے لیے مسیح موعود جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ منگلا نے بظاہر حضرت عیسیٰ کے لیے مسیح موعود استعمال کیا تھا لیکن مجھے پتا تھا کہ اُس سے اِس کی مراد ان کا اپنا نبی ہے۔ وہی جس کے بارے میں ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ احادیث میں اسی کے نزول کا ذکر ہے۔''

''اوہ...!'' بچے حیران ہوئے

''میرے بیٹو! یہ لوگ حضرت عیسیٰ کی وفات کو قرآن سے ثابت کرنے کے لیے فوراً قرآن کی کچھ آیتوں کی اپنی طرف سے تفسیر کر کے پیش کر دیتے ہیں۔ ان باتوں کو فی الحال تم لوگوں کے لیے سمجھنا مشکل ہے کیونکہ یہ خالصتاً عربی گرامر کے اصول و قواعد کی بات ہے۔ تم لوگ بس اتنا سمجھ لو کہ قرآن مجید کی سورت نساء کی آیت نمبر 155 سے 158 میں یہودیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ پھر انہیں سزا ملی ان کی عہد شکنی پر اور اللہ کی آیتوں سے منکر ہونے پر اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرنے پر اور یہ کہنے پر کہ ہمارے دلوں پر پردے ہیں، (نہیں) بلکہ اللہ نے ان کے دلوں پر کفر کے سبب مہر کر دی ہے، سو ایمان نہیں لاتے مگر کچھ لوگ۔ اور ان کے کفر اور مریم پر بڑا بہتان باندھنے کے سبب سے۔ اور ان کے یہ کہنے پر کہ ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ مسیح کو قتل کیا جو اللہ کا رسول تھا، حالانکہ انہوں نے نہ اسے قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا لیکن ان کو اشتباہ ہو گیا، اور جن لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں، ان کے پاس بھی اس معاملے میں کوئی یقین نہیں ہے، محض گمان ہی کی پیروی ہے، انہوں نے یقیناً انہیں (یعنی حضرت عیسیٰ) کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں اپنی طرف اٹھالیا۔ اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔''

''آپ میں سے کس کس کو حضرت عیسیٰ کے آسمان پر اٹھائے جانے کی تفصیل معلوم ہے؟''

سر سعید نے پوچھا۔ جواب میں کلاس میں موجود سبھی طلباء نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔

''شاباش......!!!!!!'' سر سعید کے لہجے میں خوشی تھی: ''یہود کہا کرتے تھے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ کو سولی چڑھا کر قتل کر دیا، حالانکہ یہودی نہ تو حضرت عیسیٰ ابن مریم کو سولی چڑھا سکے تھے اور نہ ہی قتل کر سکے تھے۔ انہوں نے ایسا کرنے کا منصوبہ ضرور بنایا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو حضرت جبریل کی معیت میں آسمان کی طرف اٹھالیا۔

پھر جب یہودیوں کا نمائندہ حضرت عیسیٰ کو پکڑنے کے لیے کمرے میں داخل ہوا تو اللہ نے حضرت عیسیٰ کی شبیہہ اس پر ڈال دی۔ یہودیوں نے اپنے ہی نمائندے کو حضرت عیسیٰ سمجھ کر سولی دے کر قتل کر دیا، لیکن جب کچھ یہود نے مقتول کو دیکھا تو کہنے لگے کہ اس کا چہرہ تو حضرت عیسیٰ جیسا ہے

لیکن باقی جسم ان جیسا نہیں ہے۔ اور کچھ یہود کہنے لگے کہ نہیں، یہ حضرت عیسیٰ ہی ہیں۔ یوں یہود آپس میں ہی شک میں پڑ گئے۔ اس کو اللہ نے قرآن میں 'ولکن شبہ لھم' کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔''

سر سعید کچھ ثانیے کے لیے ٹھہرے۔ سب پوری توجہ سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ کلاس میں ایسی خاموشی تھی کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنائی دے! وہ طلباء کا یہ انہماک دیکھ کر مسکرائے اور سلسلہ کلام کو دوبارہ جوڑا:

''اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں 'وَمَا قَتَلُوهُ وَ مَا صَلَبُوهُ' اور 'وَمَا قَتَلُوهُ يَقِيناً' کے الفاظ کے ذریعے اسی حق بات کو واضح فرمایا ہے۔ پھر اللہ نے آیت کے اختتام پر کچھ شبہات کا ازالہ فرمایا ہے۔ پہلا شبہ تو یہ ہوتا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ نہ قتل ہوئے، نہ سولی چڑھائے گئے، تو پھر وہ کہاں گئے؟ اس شبے کا ازالہ 'بل رفعه الله اليه' کے ذریعے دیا گیا کہ حق بات یہ ہے کہ اللہ نے انہیں اپنی طرف اٹھالیا ہے۔

اس پر پھر شبہ کہ حضرت عیسیٰ آسمان پر کیسے چلے گئے؟ تو اس کا ازالہ 'وَ كَانَ اللهُ عَزِيزًا' میں دیا کہ حضرت عیسی خود آسمان پر نہیں گئے بلکہ اللہ تعالیٰ لے کر گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو کیوں آسمان پر لے گئے تو آیت کا اختتام 'حَكِيماً' پر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حکمت والے ہیں۔ ان کی حکمتوں اور مصلحتوں کو وہی جانتے ہیں۔ ہمارا کام بس اتنا ہے کہ اللہ کے حکم اور فیصلوں کو دل سے قبول کریں۔''

''لیکن سر! جب اتنی واضح آیت ہے کہ حضرت عیسیٰ کو یہود نہ تو قتل کر سکے اور نہ ہی سولی چڑھا سکے، بلکہ اللہ نے انہیں اپنی طرف اٹھالیا تو پھر یہ بات وہ لوگ مان کیوں نہیں جاتے؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''بیٹے! اگر یہ لوگ یہ بات مان جائیں تو پھر تو ان کے عقیدے کی بنیادیں ہی ہل جائیں!'' سر سعید مسکرائے:

''ان کے سربراہ، یا نام نہاد نبی کہہ لو، اس کا یہی تو دعویٰ تھا کہ 'صلیب' کے معنی سولی پر چڑھانے کے نہیں ہیں بلکہ سولی پر موت دینے کے ہیں۔ اس لیے اس جماعت کے نزدیک 'وَمَا صَلَبُوا' میں سولی

پر چڑھانے کا انکار نہیں ہو رہا بلکہ اس صلیب کا انکار ہے جس کے نتیجے میں موت ہو۔ اس جماعت کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کو یہودیوں نے تھپڑ مارے، گالیاں دیں، کانٹوں کا تاج پہنایا اور طرح طرح کی ذلت دینے والے کام کیے، پھر سولی پر چار کیل ٹھونک کر حضرت عیسیٰ کو لٹکا دیا گیا، لیکن سولی پر انہیں موت نہیں آئی بلکہ آندھی کی وجہ سے وہ سولی سے گرے اور پھر کشمیر ہجرت کر گئے، اور وہیں وفات ہوئی۔"

"اُف...!!" وقار نے جھرجھری سی لی: "یہ لوگ حضرت عیسیٰ کی وفات کے اتنے قائل کیوں ہیں سر..؟"

"کیونکہ اگر یہ لوگ اس بات پر یقین کر لیں کہ حضرت عیسیٰ حیات ہیں اور آسمان پر زندہ ہیں، قیامت کے نزدیک انہیں دوبارہ زمیں پر اتارا جائے گا، تو پھر یہ بے چارے اپنے نام نہاد نبی کے دعوے کا کیا کریں جو کہتا تھا کہ جس مسیح نے آنا تھا، وہ میں ہوں۔ یہ لوگ کسی ایک کو ہی مسیح منتخب کر سکتے ہیں ناں! تو انہوں نے حضرت عیسیٰ کے بارے میں قرآن اور احادیث کو ایک جانب کیا اور اپنے اس لیڈر کو مسیح موعود مان لیا جس کی اپنی باتوں میں اتنا تضاد ہے کہ اس کے پیروکار اس کے اوپر بات کرنے سے کتراتے ہیں، باقی کسی بھی موضوع پر ان سے بحث کروا لو۔ ایسی ایسی حجتیں پیش کریں گے کہ ایک عام مسلمان کا ایمان تو ڈگمگا ہی جائے!" سر سعید نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ نوید نے ہاتھ کھڑا کیا اور سر سعید کی اجازت کا انتظار کیے بغیر ساتھ ہی کھڑا بھی ہو گیا۔

"سر! میں نے ایک کتاب میں حدیث مبارکہ پڑھی تھی کہ حضرت عیسیٰ دمشق میں دو فرشتوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھیں ہوئے آسمان سے اتریں گے۔ کچھ اسی طرح کا مفہوم تھا حدیث کا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا۔"

"جی نوید بیٹے! حضرت محمد ﷺ نے حضرت عیسیٰ کے نزول کے سلسلے میں یہ حدیث بیان فرمائی تھی جو صحیح مسلم میں موجود ہے۔ اس حدیث کے مطابق حضرت عیسیٰ دمشق کی مشرقی جانب سفید مینارے کے پاس آسمان سے اتریں گے۔ اس وقت وہ ہلکے زرد رنگ کی دو چادروں میں ملبوس ہوں گے او اپنے دونوں ہاتھ دو فرشتوں کے کندھوں پر رکھے ہوئے ہوں گے اور جب وہ اپنے سر کو اٹھائیں گے تو اس

سے پانی کے قطرے ٹپکیں گے اور جو کافر بھی آپ کی سانس کی خوشبو پائے گا، وہ مر جائے گا، اور حضرت عیسیٰ کی سانس وہاں تک پہنچے گی جہاں تک ان کی نظر جائے گی، پس حضرت عیسیٰ ابنِ مریم دجال کو تلاش کریں گے اور اسے بابِ لد پر پائیں گے اور اسے قتل کر دیں گے۔''

''تو سر! اگر اس نام نہاد مسیح موعود کا دعویٰ سچا ہے تو کیا یہ بھی دمشق کے سفید مینار پر اترا تھا کیا؟ ویسے دمشق ہے کہاں پر؟'' ریحان نے کھسیانا ہو کر سر کھجایا۔ ساری کلاس اس کا انداز دیکھ کر ہنس پڑی۔

''او بھلکڑ... ! دمشق شام کا دارالخلافہ ہے!'' اس کے برابر میں بیٹھے ہاشم نے اسے کہنی ماری تھی۔

''اوہ، ہاں یاد آگیا!'' ریحان جھینپ سا گیا۔ سر سعید ہنس پڑے۔

''بھئی، اس سوال کا جواب بھی مسیح موعود اور اس کے پیروکاروں کے پاس ہے اور کیا ہی غیر منطقی جواب ہے! حقیقت میں مسیح موعود کو ساری زندگی دمشق دیکھنا نصیب نہیں ہوا، کجا وہاں کے مینار پر فرشتوں کی معیت میں اترنا!! اس نقلی مسیح موعود پر بھی علماء نے یہ اعتراض اٹھائے کہ تم تو قادیان میں ہو، جبکہ حضرت عیسیٰ کا نزول تو دمشق میں ہونا ہے، تو جواب میں پہلے تو اس نے اپنی تصنیف 'ازالہ اوہام: روحانی خزائن جلد تین' کے صفحہ نمبر 209-210 میں لکھا کہ:

''یہ وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں امام صاحب نے لکھی ہے جس کو ضعیف سمجھ کر رئیس المحدثین امام محمد اسماعیل بخاری نے چھوڑ دیا ہے۔''

لیکن جب بعد میں اسے خیال آیا کہ اس حدیث کے الفاظ کو اپنے مطلب کے مفہوم میں ڈھال کر لوگوں سے مال بٹورا جا سکتا ہے تو اس نے 'دمشق کی مشرقی جانب سفید منارے کی یہ تاویل پیش کی کہ دمشق کی مشرقی جانب سے مراد قادیان ہے کیونکہ قادیان دمشق کے مشرق میں ہے، جبکہ سفید منارہ کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے قادیان میں منارہ بنانے کی مہم شروع کر دی۔ پھر اسی حدیث کا حوالہ دے کر 'مسجد شوکت اسلام' کے لیے چندے کی اپیل کر دی اور اس سلسلے میں مختلف اشتہار شائع کروائے گئے۔ اپنے مریدوں کو چندے کے لیے ابھارتے ہوئے اس کے ایک اشتہار کے الفاظ سنیں:

’’سو، واضح ہو گیا کہ ہمارے حضرت محمد ﷺ کی یہ پشین گوئی ہے کہ مسیح موعود خدا کی طرف سے اسلام کے ضعف اور عیسائیت کے غلبہ کے وقت میں نازل ہو گا۔ اس کا نزول ایک سفید منارے کے قریب ہو گا جو دمشق سے مشرق کی جانب واقع ہے، اور اس مینار کا خرچ دس ہزار سے کم نہیں۔ اب جو دوست اس مینار کی تعمیر کے لیے مدد کریں گے، میں یقیناً سمجھتا ہوں کہ وہ ایک بھاری خدمت انجام دیں گے۔‘‘

’’لیکن سر! حدیث کے مطابق تو حضرت عیسیٰ اس مینار پر اتریں گے، یعنی وہاں پہلے سے سفید مینار موجود ہو گا، مگر یہاں تو مسیح موعود نزول کے بعد مینار تعمیر کروا رہا ہے، وہ بھی چندہ مہم شروع کر کے!‘‘ بلال نے تعجب سے کہا تھا۔

’’ہاں بیٹا! اور اللہ کے کرم سے، اس ’’مسیح موعود‘‘ کو اس مینار کو مکمل دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوا اور اس پر چڑھنے کی خواہش دل میں لیے ہی اس جہان سے رخصت ہو گیا۔‘‘ سر سعید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’سر! مجھے بہت حیرت ہو رہی ہے!‘‘ عمر کے لہجے میں افسوس تھا: ’’جس طرح آپ بتا رہے ہیں، اس سے تو بچے بچے کو سمجھ آ جائے کہ کیسے اس نقلی مسیح موعود نے اپنے پیروکاروں کو بے وقوف بنایا، لیکن سر! اس کی جماعت کے لوگ کیسے اس کی ان باتوں اور حرکتوں پر یقین کر لیتے ہیں؟‘ ‘

’’تحقیق کی کمی اور اندھی عقیدت میرے بچو!‘‘ سر سعید نے جواب دیا:

’’وہ لوگ تحقیق نہیں کرتے، جیسے ہم میں سے اکثر مسلمان تحقیق نہیں کرتے اور جو اپنے بڑوں کو کرتے دیکھا، اسی پر اندھا دھند عمل کیے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ان کے کانوں میں بھی جھوٹ کو اتنے تواتر کے ساتھ بولا جاتا ہے کہ سچ کا گمان ہونے لگے۔ قرآن اور احادیث میں سے اپنی مرضی کے معنی نکالنا، کچھ الفاظ کو چھوڑ دینا اور جو الفاظ ان کے حق میں ہوں، ان کو نمایاں کرنا، علماء کرام کی باتوں کو سازشی انداز میں اپنے موقف کی تائید میں استعمال کرنا اور مظلوم کارڈ کھیل کر لوگوں کی ہمدردیاں اپنی جانب کر کے یہ ظاہر کرنا کہ وہ بھی دوسرے مسلمانوں جیسے ہیں، یہ سب باتیں ہیں۔‘‘

ابھی سر سعید مزید کچھ کہنے ہی والے تھے کہ اچانک کمرہ جماعت کے دروازے پر اصغر شاہ نمودار ہوئے۔

''السلامُ علیکم سعید صاحب۔آپ زرا میرے دفتر تشریف لائیے گا،کچھ ضروری بات کرنی ہے۔''

انہوں نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا اور سر سعید کے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے دفتر کی جانب چل پڑے۔ سبھی نے حیرت سے کمرہ جماعت کے خالی دروازے اور پھر سر سعید کی جانب دیکھا۔ وہ بھی کچھ حیران نظر آرہے تھے۔اصغر شاہ نے اس سے پہلے کبھی کسی استاف ممبر سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔

''میں چلتا ہوں پھر...آج کافی باتیں ہو گئیں۔مجھے امید ہے آپ ان باتوں کو یاد رکھیں گے اور اپنے ایمان کی پوری طرح حفاظت کریں گے۔''

سر سعید نے اٹھتے ہوئے کلاس کو کہا۔

''جی سر...ان شاءاللہ ایسا ہی ہو گا۔''سب لڑکوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا تھا۔دفتر کی جانب سپاٹ چہرے کے ساتھ چلتے ہوئے اصغر شاہ دل میں مسکرا رہے تھے۔اتفاق تھا کہ وہ سکول کا راؤنڈ لیتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ سر سعید کا کیا بندوبست کیا جائے کہ ان کی جماعت کی ترویج کا کام آسان ہو جائے۔

ابھی ساتویں کے کمرہ جماعت کے پاس پہنچے ہی تھے کہ سر سعید کی باتیں ان کے کان میں پڑیں جس میں وہ چندے کا ذکر کر رہے تھے۔ خاموشی سے دروازے کے ایک جانب کھڑے ہو کر باتین سنتے اصغر شاہ سے اپنے مسیح موعود کے بارے میں یہ 'گستاخانہ' باتیں برداشت سے باہر تھیں۔وہ فوراً دروازے کے سامنے آئے تھے کیونکہ انہیں سر سعید کو راستے سے ہٹانے کا طریقہ سجھائی دے گیا تھا۔

....☆....

''کیا بات ہے..؟آپ جب سے گھر سے آئی ہیں،خاموش خاموش سی ہیں۔سب ٹھیک تو ہے؟''

منال نے الوینہ کا الجھا الجھا سا انداز نوٹ کر لیا تھا۔وہ اس وقت ہاسٹل میں الوینہ کے کمرے میں موجود تھی۔

"نہیں.... میں ٹھیک ہوں۔" الوینہ نے بددلی سے جواب دیا تھا۔

"اور آپ کے ڈیڈی...؟ وہ بھی ٹھیک ہیں ناں...؟" منال نے پوچھا تو اس کے سوال پر الوینہ چڑ گئی۔

"تمہیں ان کی اتنی فکر کیوں ہو رہی ہے..؟ جب میں نے کہہ دیا کہ سب ٹھیک ہے تو سب ٹھیک ہے"!

یہ کہہ کر الوینہ اپنے بستر پر لیٹ گئی اور سر تک چادر اوڑھ لی: "جاتے ہوئے کمرے کی لائٹ بند کر جانا۔"

یہ واضح پیغام تھا منال کے لیے کہ وہ کمرے سے چلی جائے۔ منال نے حیرت سے سر تک چادر تانے الوینہ کو دیکھا اور پھر آہستگی سے لائٹ بند کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی الوینہ نے فوراً چادر کو اپنے اوپر سے اتار کر دور پھینکا تھا۔

"آئی ایم سوری منال...! آئی ایم سو سوری..."!!!

اس کی آنکھوں کے کناروں سے دو آنسو ڈھلکے اور اس کے بالوں کی طرف بہہ گئے۔ بند آنکھوں کے پیچھے وہ سادہ اور معصوم سی منال کو دیکھ رہی تھی جس کے ساتھ وہ کھل کر ہنستی تھی، عام سے حلیے میں رہتی تھی، جس کے ساتھ ہوتے ہوئے اُسے یہ فکر نہیں ہوتی تھی کہ منال لباس کو بنیاد بنا کر اُسے جج کر رہی ہو گی۔ دفعتاً الوینہ کی بند آنکھوں کے پردے پر ڈیڈی کی شبیہہ اتری تھی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

"تمہیں تو پتا ہی ہے کہ میں جب کسی کو حاصل کرنے کی ٹھان لوں تو اسے حاصل کر کے ہی دم لیتا ہوں... چاہے اس کے لیے مجھے کسی بھی قیمت پر کچھ بھی کرنا پڑے... کچھ بھی....!!!" اس کے ذہن میں رستم کی دھمکی گونجی تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

اگلا پورا دن الوینہ اپنے کمرے تک محدود رہی تھی۔ یونیورسٹی سے بھی اس نے چھٹی کی تھی اور کھانا بھی آیا جی اسے کمرے میں ہی پہنچا دیتی تھیں۔ منال اس کی طرف سے فکرمند تو تھی لیکن خود سے اس کے پاس جانے سے گھبرا رہی تھی۔ آخر میس میں رات کے کھانے سے فارغ ہو کر جب سب لڑکیاں اپنے اپنے

کمروں میں جا رہی تھیں تو الوینہ نے اپنے دروازے پر کھڑے کھڑے سامنے فاطمہ کے ساتھ آتی منال کو آواز دی تھی:

"منال! پلیز میری بات سننا۔ مجھے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" فاطمہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"جاؤ بھئی، تمہارا ابلاوا آگیا ہے...!" فاطمہ نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔ منال نے اس کا طنز نظر انداز کرتے ہوئے الوینہ کو جواب دیا:

"جی، میں آتی ہوں۔"

یہ سن کر الوینہ نے دروازہ دوبارہ بند کر لیا تھا۔ منال اپنے کمرے سے ہو کر دس منٹ میں الوینہ کے پاس پہنچ چکی تھی۔ اسے دیکھتے ہی الوینہ نے تیزی سے اُٹھ کر اسے گلے لگا لیا، اور رونا شروع ہو گئی۔ منال اس کے رونے سے گھبرا گئی۔

"کیا ہوا ہے الوینہ؟ کیوں رو رہی ہیں؟؟" لیکن الوینہ اس کے گلے لگ کر آنسو بہاتی رہی۔

"آئیں، بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" منال نے اس کی کمر تھپتھپاتے ہوئے کہا تو الوینہ نے اپنے آپ کو سنبھالا اور آنسو پونچھتی ہوئی کرسی کی جانب بڑھ گئی۔

"سب سے پہلے تو کل کے لیے معذرت منال...!۔ بس میں بہت ڈسٹرب تھی۔" الوینہ نے ٹشو پیپر سے اپنی ناک پونچھی۔

"ارے نہیں نہیں... معذرت کیوں کر رہی ہیں آپ؟؟... اور آپ روئیں کیوں؟ '

"مجھے تم سے... کچھ کہنا ہے...، مگر.. مگر.. پہلے مجھ سے وعدہ کرو کہ تم میری بات سن کر ناراض نہیں ہو گی۔" الوینہ اور منال کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھی تھیں جب الوینہ نے اپنے ہاتھوں کو آپس ہیں مسلتے ہوئے منال سے پوچھا۔ جواب میں منال دوبارہ حیران ہوئی تھی۔

"بھئی میں کیوں تم سے ناراض ہونے لگی...؟" اس کا جواب سن کر الوینہ تھوڑا سا ہچکچائی، پھر ایک گہرا سانس لینے کے بعد منال کے ہاتھ تھام کر بولی:

''ڈیڈی... میرے۔ڈیڈی شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''اوہ...اچھا....'' منال کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس قسم کا ردِ عمل دے۔ایک جوان بیٹی کے باپ کی شادی کی خبر اسے کچھ عجیب سی لگی تھی۔ ''اس لیے آپ رو رہی تھیں؟؟'' منال نے حیرت سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں....وہ....میں....دراصل....بات یہ ہے کہ....''الوینہ کہتے کہتے رُک گئی۔

''کہ ؟'' منال نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''وہ جس سے شادی کرنا چاہتے ہیں..اس کا نام....منال ہے....۔''الوینہ نے جھجھکتے ہوئے کہا۔

''مطلب...میں سمجھی نہیں کچھ....'' منال کے چہرے پر شدید حیرت تھی۔

''وہ...وہ تم سے.... تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔''الوینہ نے بڑی مشکل سے یہ جملہ ادا کیا تھا۔

''کیا.....؟'' منال کو لگا، اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

''منال...!ڈیڈی واقعی....تم میں انٹرسٹڈ ہیں.....وہ تم سے شادی......''الوینہ نے اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''یہ.....یہ کیا کہہ رہی ہو تم الوینہ...؟'' منال ہکا بکا رہ گئی تھی۔اس نے تیزی سے اپنے ہاتھ پیچھے کھینچ کر انہیں الوینہ کے ہاتھوں سے دور کیا۔

''پلیز...!ریلیکس ہو کر میری بات سننے اور سمجھنے کی کوشش کرو۔''الوینہ نے دوبارہ اس کے ہاتھ تھامنا چاہے:

'' ڈیڈی نے مجھے اسی لیے بلوایا تھا۔وہ تمہارے گھر رشتہ بھیجنا چاہ رہے ہیں۔انہیں تمہاری سیرت بہت اچھی لگی ہے۔''

الوینہ نے جان بوجھ کر 'صوررت' کی جگہ 'سیرت' کا لفظ استعمال کیا تھا، ورنہ رستم رئیس نے ایک دفعہ بھی منال کی سیرت کے بارے میں بات نہیں کی تھی۔

''الوینہ......!!'' صدمے سے منال کی آواز گنگ ہو کر رہ گئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی

طرف دیکھ رہی تھی۔الوینہ نے نظریں چرالیں۔

''پلیز منال....!! تمہیں سوچنے کے لیے وقت چاہئے تو تم لے لو.... لیکن دیکھو.....انکار مت کرنا پلیز.....ڈیڈی نے بہت مان سے.....''

''یہ ناممکن ہے الوینہ !ایسا کیسے ہو سکتا ہے...؟؟'' صدمے سے منال کی آواز جیسے گنگ ہو گئی تھی۔

''یہ ممکن ہے منال!'' الوینہ نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ وہ خود کہاں چاہتی تھی کہ اتنی من موہنی، نازک سی لڑکی کی شادی اس کے Loose Character والے باپ سے ہو لیکن باپ دھمکی دے چکا تھا....

''لیکن میری منگنی ہو چکی ہے الوینہ....!'' منال نے اس کی بات کاٹ کر غصے سے تیز اور اونچے لہجے میں کہا تھا۔

''کیا......؟'' اب حیران ہونے کی باری الوینہ کی تھی۔ منال غصے میں جلدی سے اس کے کمرے سے نکل گئی۔

....☆....

''آپ کی آج کی حرکت سے مجھے بہت افسوس ہوا ہے سعید صاحب..!مجھے آپ سے یہ توقع نہیں تھی۔''!

اصغر شاہ نے دفتر میں میز کے دوسری جانب بیٹھے سر سعید کو کہا تھا۔ سر سعید چونکے۔

''کیسی حرکت سر...؟''

''آپ اس سکول میں فرقہ واریت اور انتہا پسندی کو ہوا دے رہے ہیں۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔''

''لیکن سر.... میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔'' سر سعید اصغر شاہ کی ناراضی کی وجہ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔

''آپ نے پہلے منگلا صاحب پر الزام لگا دیا کہ وہ ایک اقلیت جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔آپ کے

پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔آپ بخوبی جانتے ہیں کہ اس جماعت کے لوگ پہلے ہی کتنے عتاب کا شکار ہیں اور کس طرح اپنی جان بچاتے پھرتے ہیں۔ میرے اسکول میں اسٹاف اور طلباء میں سے ایک ایک فرد میرے لیے برابر ہے۔ اور مجھے آپ سے بھی یہی توقع تھی کہ آپ بھی سب کو جوڑ کر رکھیں گے۔" اصغر شاہ نے برہمی سے کہا۔

"لیکن سر.....!" سر سعید نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔اصغر شاہ کی ساری باتیں ان کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔

"اور ابھی.....آپ طلباء کو انگلش پڑھانے کی بجائے دینیات پڑھانے بیٹھ گئے! آپ کو اس کام کی نوکری تو نہیں دی گئی تھی"!

اصغر شاہ کی بھنویں تنی ہوئی تھیں۔

"سر! بچے اُس واقعے کی وجہ سے الجھن کا شکار تھے۔ان کے ذہن میں کچھ سوال تھے جو انہوں نے مجھ سے پوچھے۔ میں ان کی صرف رہنمائی کر رہا تھا۔" سر سعید کو اب بات کسی حد تک سمجھ آگئی تھی۔ لیکن یہ بات ابھی تک سمجھ نہیں پارہے تھے کہ اصغر شاہ کو اچانک سے کیا ہو گیا ہے۔

"بچے تو بچے ہیں! بجائے اس کے کہ آپ انہیں سب کے ساتھ برابری کے سلوک کی تلقین کرتے اور انہیں مذہبی رواداری کی طرف لاتے، الٹا آپ نے انہیں اس جماعت کے ہی خلاف کرنا شروع کر دیا! کمال ہے سعید صاحب!" آخر الفاظ اصغر شاہ نے طنز سے بھرے ہوئے لہجے میں کہے تھے۔ سر سعید کو ان کا انداز پسند نہیں آیا۔ ناگواری کو ضبط کرتے ہوئے کرسی کے ہتھوں پر ان کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

"بہت معذرت سر..! لیکن میرا خیال ہے کہ ایک استاد صرف اپنے مضمون کا استاد نہیں ہوتا، وہ اپنے طلباء کا روحانی باپ بھی ہوتا ہے اور ایک روحانی باپ ہونے کی حیثیت سے استاد کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے ان بچوں کی ہر قدم پر رہنمائی کرے اور ان کے ذہن کی الجھنوں کو سلجھائے۔"

انہوں نے اب کچھ ٹھوس لہجے میں بات کی تھی۔

"استاد کا یہ فرض بھی بنتا ہے کہ وہ بچوں کو بتائے کہ اسلام میں مذہبی رواداری کتنی اہم ہے اور بغیر

کسی ثبوت کے کسی کے بارے میں غلط گمان کی کیا سزا ملتی ہے۔" اصغر شاہ کا لہجہ ان کے لہجے سے زیادہ ٹھوس تھا۔ سر سعید نے صغر شاہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس لی اپنے اندر اتاری۔

"میں معافی چاہتا ہوں۔ آئندہ آپ کو دوبارہ شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔" انہوں نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے کہا تھا۔

"مگر میں آپ کو اب سکول میں رکھنے سے قاصر ہوں۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن اپنے سکول میں انتہا پسندی اور شر انگیزی نہیں۔"

"سر.....!" سر سعید ایک دفعہ پھر حیران رہ گئے تھے۔ ان کے لیے یہ سب بالکل غیر متوقع تھا۔

"آپ کو ابھی اسی وقت ملازمت سے برخاست کیا جا رہا ہے۔"

اصغر شاہ نے ایک کاغذ پر دستخط کیے اور وہ کاغذ ان کی طرف بڑھا دیا۔ وہ ان کی برطرفی کا نوٹس تھا۔

"سر جی...!" سر سعید نے حیرت سے پہلے اس لیٹر کو اور پھر اصغر شاہ کو دیکھا۔ وہ پین کا ڈھکن لگاتے ہوئے سپاٹ چہرے کے ساتھ انہیں ہی دیکھ رہے تھے۔ سر سعید نے ایک دفعہ پھر گہری سانس لی تھی۔

"ٹھیک ہے سر۔ جیسا آپ کو بہتر لگے۔ میری دو کلاسز رہتی ہیں، میں انہیں پڑھا دوں، پھر نکلتا ہوں۔"

انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا لیکن اصغر شاہ کا جملہ سن کر وہیں رک گئے۔

"نہیں... آپ کو ابھی جانا ہو گا۔ اس اسکول میں اب آپ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

اپنے پانچ سالہ دورِ تدریس میں اصغر شاہ کا یہ روپ سر سعید پہلی دفعہ دیکھ رہے تھے۔

"ٹھیک ہے سر....!" انہوں نے جواب دیا اور ایک ہاتھ میں اپنی برطرفی کا لیٹر تھامے کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے باہر نکلتے ہی اصغر شاہ کے سپاٹ چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ اتر آئی تھی۔

سر سعید کے اچانک سکول چھوڑ جانے سے سبھی حیران و پریشان تھے، لیکن کوئی بھی اصغر شاہ سے پوچھنے کی جرات نہیں کر پا رہا تھا۔ اصغر شاہ اگلی صبح اسمبلی میں سب طلباء اور اسٹاف کو حتمی انداز میں یہ بات

کہہ چکے تھے کہ سکول میں ایسی کوئی بات برداشت نہیں کی جائے گی جو کسی بھی اقلیت جماعت کے لیے مخصوص ہو۔

''آپ نے جو باتین کرنی ہیں، اپنے گھر پر کریں یا سکول کے اوقات سے باہر کریں۔ انہیں لے کر اسکول میں آنا سختی سے منع ہے۔ میں نے یہ اسکول اس علاقے کے بچوں کو تعلیم سے روشناس کروانے کے لیے بنایا تھا، مذہبی بحث کے لیے نہیں۔''

اصغر شاہ اسمبلی گراؤنڈ میں مائیک پر بول رہے تھے اور قطاروں میں کھڑے بچے اور ان کے اساتذہ توجہ سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

''اگر تعلیم آپ کو تحمل، تحقیق اور رواداری نہیں سکھا پاتی تو اس کا مطلب ہے آپ نے اپنی تعلیم سے کچھ نہیں سیکھا۔ ان مذہبی بحثوں میں پڑنے کی بجائے اپنی تعلیم پر توجہ دیں، سالانہ امتحان اگلے ہفتے سے شروع ہیں۔ میں آپ سب سے شاندار رزلٹ کا متمنی ہوں۔''

اصغر شاہ یہ کہہ کر مائیک کے سامنے سے ہٹ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد اپنے اپنے کلاس روم میں جاتے ہوئے طلباء اور اساتذہ سبھی اصغر شاہ کی گفتگو کے بارے میں سوچ رہے تھے لیکن ایک دوسرے سے بات کرنے سے کترا رہے تھے۔

....☆....

رستم رئیس نے ایک اور کام کیا تھا۔ ایک طرف تو اس نے الوینہ کے ذمے منال کو منانے کا کام لگایا، دوسری طرف قیمتی تحائف خرید کر ڈرائیور کے ہاتھوں منال کے گھر والوں کو بھیج دیے۔ شہتوت کے درخت تلے چارپائی پر نیم دراز خزاں کی دھوپ کے مزے لیتا بابا اسحاق جیپ کو گھر کی جانب آتا دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھا اور چپل کو جلدی سے پاؤں میں آڑھا ٹیڑھا گھسیڑتا ہوا اس کی طرف لپکا تھا۔ تب تک ڈرائیور جیپ کو گھر کے آگے روک چکا تھا۔

''سلامالیکم.....'' بابا اسحاق نے قریب آکر حیرانی والے لہجے میں کہا تھا۔

''وعلیکم السلام چاچا...''!

ڈرائیور نے جواب دیا اور جیپ کا پچھلا دروازہ کھول کر اس میں سے سامان نکالنے لگا۔ بابا اسحاق حیرت سے اس کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔

"بھئی یہ کیا ہے...؟" اس نے ڈرائیور کے ہاتھ میں بڑے بڑے شاپر دیکھے تو حیرت سے پوچھا۔

"یہ صاحب جی نے بھجوایا ہے، دروازہ کھولو تو میں اندر رکھ دوں، یا آپ خود ہی رکھ لوگے؟" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"لیکن.... یہ اتنا کچھ...... میرا مطلب ہے کہ..... یہ کیوں....." بابا اسحاق کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو رستم صاحب بھاری رقم دے کر گئے تھے، پھر اتنا سامان بھجنے کی کوئی تک بنتی نہیں تھی۔

"کون آیا ہے....؟" آوازیں سن کر اماں نے دروازے سے باہر جھانکا تو سامنے جیپ اور ڈرائیور کو دیکھ کر جھجک گئیں اور فوراً دوپٹے سے اپنے ہونٹ ڈھانپ کر اپنے تیئں پردہ کر لیا۔

"چاچی..! رستم صاحب نے یہ سامان بھیجا ہے، آپ لوگوں کے لیے واسطے..!"

ڈرائیور نے اگرچہ کلف لگی وردی پہن کر اپنی ٹور بنائی ہوئی تھی لیکن اندر سے وہ بھی دیہاتی ہی تھا۔

"ہاہائے....!!" اماں نے ناک کی پُھننگ پر اپنی شہادت کی انگلی ٹکاتے ہوئے حیرت سے کہا:

"بھئی اب یہ سب کس لیے...؟" وہ چلتی ہوئی ان دونوں کے پاس آگئی تھیں اور اب حیرت سے ڈرائیور کے ہاتھ میں موجود شاپر کو دیکھ رہی تھیں جن میں سے ایک میں کپڑے لتے نظر آرہے تھے اور دوسرے میں سوئیٹر اور شالیں وغیرہ۔

"تُو تو اندر چل، اِدھر کیوں آگئی ایں؟" بابا اسحاق نے اپنی کوفت اماں پر نکالی۔ انہیں اس سارے سامان سے الجھن ہو رہی تھی۔

"جاتی ہوں... جاتی ہوں..!" اماں ڈرائیور کے ہاتھ میں موجود سامان کو گھورتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

"بیٹھک کا دروازہ کھول دے...!"

بابااسحاق نے انہیں آواز لگائی تھی۔ بیٹھک کا ایک دروازے گھر کے اندر کی طرف اور دوسرا باہر کی طرف کھلا تھا تاکہ اگر کوئی غیر مرد آجائے تو گھر کی عورتوں سے اس کا سامنا ہوئے بغیر اسے باہر وں باہر نمٹا دیا جائے۔ کچھ لمحوں بعد بیٹھک سے اندر سے چٹخنی گرنے کی آواز آئی اور اماں نے پٹ کھول دیے۔

''آجاؤ.....'' بابااسحاق نے ڈرائیور سے کہا اور خود اس کے آگے چلتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہو گئے۔

.....☆....

سامان اندر رکھ کر اور چائے پی کر ڈرائیور رخصت ہو گیا تھا۔ جیسے ہی وہ رخصت ہوا، اماں فوراً کمرے میں آئی تھیں۔

''شکر ہے چلا گیا، میں کب سے دیکھ رہی تھی کہ جائے تو میں دیکھوں اُس لڑکی کے باپ نے کیا بھیجا ہے۔''

اماں کو الوینہ کا نام یاد نہیں رہتا تھا تو اسے 'کُڑی' ہی کہتی تھیں۔

''لے، دیکھ لے، شوق پورا کر لے۔'' بابااسحاق نے تفکر بھرے لہجے میں کہا اور خود کرسی پر بیٹھ کر پیچھے کی طرف سر گرا کر ہاتھ سے اپنا ماتھا ملنے لگا۔

''ہاہائے.... !!! ہاہائے !!!'' اماں سامان دیکھتی جارہی تھی اور تعجب کا اظہار کرتی جارہی تھی:

''اتنا مہنگا سامان... ؟ اور وہ بھی اتنا زیادہ... ؟ آپ نے پوچھا نہیں کیوں بھجوایا ہے ؟''

''ارے پوچھا تھا سیانی بی بی.... اس کو تو خود نئیں پتا تھا....''

بابااسحاق نے اسی طرف ماتھا مسلتے ہوئے جواب دیا۔ پھر اچانک سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولے:

''پر، ایک بات ہے.... انھوں نے ایسے ہی سامان نہیں بھیجا... ! ضرور کوئی گل بات اے..''!

''گل بات کون سی ہونی ہے بھلا... ؟ ہمارے پاس کیا ہے جس کا انھیں لالچ ہو سکتا ہے ؟ امیروں کے پاس تو پیسہ ہوتا ہے۔ ویسے بھی آپ کو کیوں اتنی فکر ہے ؟ نئے کپڑے آئے ہیں، سلواؤ اور پہنو..''!

اماں ابھی کچھ سوچنے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ ابھی تو وہ پیکٹ سے کپڑے نکال کر ان کی ملائمت

محسوس کر رہی تھیں۔ بابا اسحاق کو البتہ یہ سب کچھ کھٹک رہا تھا۔

....☆....

''پیپرز کی تیاری کیسی ہو رہی ہے بیٹے؟'' برطانیہ سے عبدالکریم صاحب کا فون آیا ہوا تھا۔

''بہت اچھی...الحمدللہ....آپ کے پیپر کی تیاری کیسی ہو رہی ہے؟''

بلال نے شرارت سے ان سے ان کے ایم فل مقالے کا پوچھا۔ جواب میں وہ ہنس پڑے۔

''میری بھی بس ٹھیک ہی ہو رہی ہے۔ دیکھ لو! اتنی عمر ہو گئی ہے لیکن مجھے ابھی بھی پڑھنا پڑھ رہا ہے!'' عبدالکریم صاحب نے جواب دیا تھا۔

''ابا جی! میں نے آپ کو بہت ضروری بات بتانی تھی۔'' اتنا کہہ کر بلال نے انہیں لیب میں منگلا والے واقعے سے لے کر سر سعید کی برطرفی اور اصغر شاہ کی طرف سے تنبیہی خطاب تک، سب بتا دیا۔ پچھلے ہفتے جب عبدالکریم صاحب کا فون آیا تھا تو بلال گھر پر نہیں تھا اس لیے اس کی بات نہیں ہو سکی تھی۔

''اوہ.....!'' پوری بات سن کر عبدالکریم صاحب نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

''جی ابا جی...! مجھے یہ سب بہت عجیب لگ رہا ہے، جیسے کہیں کوئی گڑبڑ ہے لیکن میں سراغ نہیں لگا پا رہا کہ کہاں کیا گڑبڑ ہے۔''

بلال نے اپنی آواز کو دھیما کرتے ہوئے کہا۔ امی جان دوسرے کمرے میں نماز سے فارغ ہو کر اس کے قریب آکر بیٹھ گئی تھیں۔ بلال نہیں چاہتا تھا کہ ان باتوں کی سن گن امی جان کو ملے ورنہ اصغر شاہ تک بات آسانی سے پہنچ جاتی۔

''میں دیکھتا ہوں اس معاملے کو۔ تم بس اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ اور اب امی سے بات کروا دو۔'' عبدلاکریم صاحب نے کہا تو بلال امی جان کو ریسیور پکڑا کر خود اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔

....☆....

صبح منال نے الوینہ کا انتظار نہیں کیا اور اکیلے ہی یونی ورسٹی آگئی۔ حالانکہ جب سے ان کی دوستی ہوئی تھی، دونوں اکھٹے ہی یونی ورسٹی آتی تھیں اور اکھٹے ہی واپس ہاسٹل جاتی تھیں۔ الوینہ اس کے گریز کی وجہ

جانتی تھی، اس لیے خاموش تھی لیکن کسی حد تک منال کے لیے فکر مند بھی تھی۔ وہ اپنے باپ کا مزاج بہت اچھی طرح جانتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ رستم رئیس کی دھمکی صرف دھمکی نہیں تھی، وہ منال کو حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر لے گا۔

''میں کیا کروں؟...'' ہاسٹل کے باغیچے میں گھاس پر بیٹھی الوینہ کا سوچ سوچ کر دماغ شل ہو گیا تھا۔ ایک طرف منال تھی، اس کی بہت عزیز سہیلی جس نے آج تک کسی لڑکے سے غیر ضروری بات نہیں کی تھی، اور دوسری طرف الوینہ کا باپ تھا، جو ایک اور تتلی کا رس نچوڑنے کو تیار بیٹھا تھا۔

''ویسے ڈیڈی نے کہا ہے کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں، باقی لڑکیوں کی بات اور ہے۔'' اس کے دماغ نے کہا۔

''مگر یہ منال کے ساتھ ناانصافی اور زیادتی نہیں ہو گی کہ باپ کی عمر کے مرد سے اس کی شادی ہو...'' دل نے سوال اٹھایا۔

''زیادتی تو اس کے ساتھ تب بھی ہو جائے گی اگر یہ شادی نہ ہوئی....'' دماغ نے توجیہہ پیش کی:

''تو کیا یہ بہتر نہیں کہ ڈیڈی کے نکاح میں آنے سے اس کا تعلق قانونی اور شرعی تو ہو گا۔''

''یہ سب کر کے تمھیں کیا لگتا ہے، تم منال کو بچا رہی ہو..؟'' دل نے ایک اور سوال اٹھایا۔ الوینہ نے سر جھکا لیا۔

''نہیں.....میں اس کے لیے وہ راستہ منتخب کر رہی ہوں جس میں اس کے لیے کم از کم ذلت اور رسوائی نہیں ہے۔'' اس نے دل کو جواب دیا تھا۔

''کاش میں نے ہاسٹل میں رہنے کی خواہش نہ کی ہوتی.....مجھے علم نہیں تھا کہ میری اس خواہش کا خمیازہ ایک معصوم لڑکی کو بھگتنا پڑے گا۔''

اس نے دونوں ہاتھوں پر اپنے سر کو گراتے ہوئے سوچا تھا۔

....☆....

عبدالکریم صاحب کا ارادہ تھا کہ وہ ایک دو دنوں میں اصغر شاہ کو فون ملا کر ان سے بات کریں گے لیکن کچھ مصروفیات آڑے آگئیں جن کی وجہ سے وہ انہیں فون نہ ملا پائے۔اصغر شاہ کے مطالعے کا دورانیہ بڑھتا جا رہا تھا۔عمر اور رابعہ تو خود تیاری کر لیتے تھے جبکہ نگہت بیگم کو علی کو ساتھ بٹھا کر تیاری کروانی پڑتی تھی اس لیے گھر میں سبھی مصروف تھے۔کسی نے اصغر شاہ کی مصروفیت کو نوٹ نہیں کیا۔

امتحان کے دنوں میں ویسے بھی ان کے گھر میں کرفیو جیسا سماں ہوتا تھا۔روایتی پاکستانی ماؤں کی طرح نگہت بیگم کی بھی ترجیح اپنے سب بچوں کی پہلی پوزیشن ہی ہوتی تھی اور اس معاملے میں وہ بہت سخت تھیں۔

اُدھر بچے اور ان کی ماں پڑھائی میں گم تھے، یہاں اصغر شاہ اپنے مطالعے میں غرق تھے۔جماعت کی طرف سے انہیں قرآن مجید کی مخصوص تفاسیر اور دیگر کتابیں تحفتاً موصول ہوتی رہتی تھیں۔ان کے لیے یہ سب کچھ بہت نیا، بہت منفرد تھا۔انہیں لگ رہا تھا جیسے ان پر ایک نئی دنیا کھل گئی ہو۔اس سے پہلے انہوں نے قرآن کو محض قرآن کے طور پر ہی پڑھا تھا، بغیر کسی ترجمے کے۔

قرآن کا ان کے ساتھ تعلق عقیدت کا سا تھا جس میں قرآن کو بس خوبصورت سے غلاف میں لپیٹ کر، پلکوں سے مس کر کے طاق پر سجایا جاتا ہے یا ہر دوسرے تیسرے دن گھر میں برکت کی غرض سے

ایک صفحہ جلدی جلدی پڑھ لیا جاتا ہے، بغیر کسی ترجمے اور تفسیر کے۔اب زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کیا تھا تو ان کے اندر شوق پیدا ہو گیا تھا کہ قرآن کو سمجھ کر پڑھنا ہے، لیکن بدقسمتی سے، انہیں قرآن کی تفاسیر ملیں بھی تو وہ جو جماعت کے سرغنہ اور دیگر حضرات نے لکھی تھیں۔

یہ مخصوص تفاسیر ان کی اسٹڈی ٹیبل پر دراز میں رکھی ہوئی تھیں اس لیے گھر کے کسی بھی فرد کو ان کے اس رجحان کے بارے میں شک بھی نہ ہو سکا۔

....☆....

''منال...! پلیز میری بات سنو!!''الوینہ کی نظر ہاسٹل گیٹ سے اندر داخل ہوتی منال پر پڑی تھی جو اس سے کنی کترا کر سیدھا اندر جانے کی کوشش کر رہی تھی۔الوینہ تیزی سے اس کی طرف لپکی۔

''پلیز مجھ سے بات کرو.....پلیز.....!!!''الوینہ نے اتنے منت کرتے ہوئے کہا کہ منال کو اس کی بات ماننا ہی پڑی۔

''کہیں...''اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

''یہاں نہیں، میرے کمرے میں چلو، یہاں کسی لڑکی نے ہماری باتین سن لیں تو بلاوجہ ایشو بن جائے گا۔''الوینہ اس کا بازو پکڑ کر اندر جانے لگی تو منال نے فوراً اس سے اپنا بازو چھڑوایا تھا۔پھر مرے مرے قدموں سے اس کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

''لگتا ہے دونوں میں کوئی پھڈا ہو گیا ہے....'' بشریٰ نے سندس کے کان میں کہا تھا جو ان دونوں کے پیچھے ہاسٹل گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھیں۔

''ہونا ہی تھا! امیر اور غریب کی دوستی لمبا عرصہ نہیں چل پاتی....'' سندس نے کندھے اچکا کر جواب دیا تھا۔

اِدھر وہ دونوں کمرے میں پہنچ چکی تھیں؛

''دیکھو منال...! اگر مجھے پتا ہوتا کہ تمہاری منگنی ہو چکی ہے تو میں تم سے یہ بات کرتی ہی نہیں بلکہ جیسے ہی ڈیڈی نے مجھ سے یہ بات کی تھی، میں اسی وقت انہیں منع کر دیتی۔''

''تواب منع کردیں...!'' منال دونوں بازووں کو سینے پر باندھے الوینہ کے کمرے میں کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

''کاش...!! کاش کہ انہیں منع کرنا اتنا آسان ہوتا۔'' الوینہ نے دل میں سوچا۔

''اچھا یہ تو بتاؤ کہ وہ کون ہے، کیا کرتا ہے؟ کہاں ہوتا ہے؟؟ تمہارے گاؤں میں یا کہیں اور...؟''

الوینہ نے ماحول کو ہلکا پھلکا کرنا چاہا لیکن منال بدستور منہ پھلا کر ناراضی سے کھڑکی کی طرف دیکھتی رہی۔ الوینہ نے کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کیا۔

''بتاؤ ناں....''!

''اس کا نام کمال ہے.... دبئی میں کام کرتے ہیں.... ہماری برادری کے ہی ہیں.....اور جب میری پڑھائی ختم ہو جائے گی تو شادی ہو جائے گی۔''

منال نے مختصراً بتایا۔ وہ ابھی بھی براہِ راست الوینہ کی جانب دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

''اوہ!!! اچھا...!!'' الوینہ کے لہجے میں افسردگی اتر آئی۔

''منال...! پلیز اب میری بات آرام سے سنو.. میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا کہ ڈیڈی تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ...بس۔ میری ہی خواہش تھی۔'' الوینہ نے جھوٹ بولا، اس کی بات سن کر منال نے اس کی طرف دیکھا۔ حیرت کا سمندر اس کی بڑی بڑی سی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔

''کیا کہہ رہی ہو....؟''

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں منال...!!'' الوینہ نے سر جھکا لیا:

''یہ میری خواہش تھی......اور اب بھی ہے.....کہ ڈیڈی اور تمہاری۔''

''الوینہ پلیز....!!!'' منال نے اس کی بات کاٹی۔

''نہیں منال! مجھے کہنے دو پلیز...'' الوینہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں: ''تم میری رازدان ہو....اور اس پوری دنیا میں صرف تمہیں علم ہے کہ میں کیسی ہوں، میری سوچ کیسی ہے، اور ہماری فرینڈشپ سے پہلے میں کتنی اکیلی تھی.....مجھے ڈر لگتا ہے منال....کہ جب ہماری اسٹڈیز ختم ہو جائیں گی تو ہماری

فرینڈشپ بھی ختم ہو جائے گی۔''الوینہ سسک اٹھی تھی۔ منال کے دل کو کچھ ہوا۔

''نہیں، شادی کے بعد بھی ہماری دوستی قائم رہے گی۔ مجھے پورا یقین ہے۔''

''لیکن مجھے یقین نہیں ہے۔''الوینہ نے اپنے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے:''پتا نہیں تمہارے شوہر کو ہماری فرینڈشپ اچھی لگے گی بھی یا نہیں۔ تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہو کہ ہمارے معاشرے میں خواتین اپنے شوہروں کی مرضی پر ہی چلتی ہیں۔''الوینہ کی بات کے جواب میں منال خاموش رہی تھی۔ واقعی، کون جانے کہ کمال کو ان کی دوستی پر اعتراض ہوگا یا نہیں۔

''بات تو بہت عجیب لگتی ہے لیکن میں نے بہت آئیڈیل ہو کر سوچا تھا کہ اگر.... ویسا ہو جاتا جیسا میں نے چاہا تھا تو ہم تینوں کتنا خوش رہتے... لیکن خیر... میں تمہاری خوشی میں خوش ہوں منال..... اللہ تمہیں ہمیشہ safe رکھے، خوش رکھے۔''

الوینہ نے بظاہر دعا دی تھی لیکن حقیقت میں وہ اپنے باپ سے منال کی حفاظت کی دعا مانگ رہی تھی۔

''آمین...''منال بس یہی کہہ پائی۔ اس کے پاس اس کے علاوہ اور کچھ کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں.. وہ کسی بھی صورت میں وہ نہیں کر سکتی تھی جو الوینہ چاہ رہی تھی۔

....☆....

ایک شام فون کی گھنٹی بجی تھی۔ اصغر شاہ نے ہی ریسیور اٹھایا اور مربی شفیق کی آواز پہچان کر فون کو اٹھا کر اپنے اسٹڈی روم میں لے گئے۔ فون کی تار اتنی لمبی تھی کہ بآسانی نزدیکی کمروں تک فون کو لے جایا جا سکتا تھا۔ رسمی سلام دعا کے بعد شفیق نے ان سے کہا تھا:

''مجھے منگلا سے علم ہوا تھا کہ آپ کے اسکول میں ایک انگلش استاد کی اسامی خالی ہے؟''

''جی ہاں، وہ اسامی ابھی تک خالی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ امتحانات سے فارغ ہو جائیں، پھر اس کے بارے میں اشتہار دیں گے۔''

اصغر شاہ نے بہت احترام کے ساتھ جواب دیا تھا۔ مربی شفیق کے لیے ان کے دل میں بے پناہ عزت

تھی۔

"صحیح.... میرے پاس ایک صاحب ہیں، نبیل خالد۔ ہماری ہی جماعت کے ہیں۔ انہوں نے انگلش میں ماسٹرز کیا ہوا ہے اور ہماری جماعت کے بارے میں بھی کافی علم رکھتے ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو انہیں اس اسامی کے لیے دیکھ لیں۔"

"جی جی، کیوں نہیں، بلکہ مجھے تو زیادہ خوشی ہو گی کہ جماعت کے لوگوں کو میرے اسکول میں ملازمت ملے۔ اس طرح جماعت کی خدمت میں میرا بھی حصہ شامل ہو جائے گا۔" اصغر شاہ نے خوشی سے کہا۔

"دیکھیے ناں شاہ جی، اگر ہم ہی اپنی جماعت کے بندوں کو آگے نہیں لائیں گے تو کون لائے گا؟ ہماری جماعت کے بڑون نے جماعت کی خدمت میں اپنی زندگیاں تیاگ دیں، کتنے ہی لوگ جان اور مال کی پروانہ کرتے ہوئے جماعت کے موقف پر ڈٹے رہے اور شر پسند لوگوں کے شر کا شکار ہو کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان کے مقابلے میں ہم تو کچھ بھی نہیں کر رہے۔"

مربی نے جذباتی انداز میں کہا۔ اصغر شاہ نے بھی اس کی باتیں سن کر اپنے وجود میں جذبات کو بہتے ہوئے محسوس کیا۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں... اللہ کا شکر کہ مجھے منگلا، آپ اور جماعت کے توسط سے ہدایت مل گئی۔ اس لیے میں جماعت کے لیے کتنا بھی کروں، کم ہی محسوس ہوتا ہے۔ جماعت کا مجھ پر اتنا تو حق بنتا ہے کہ میں اس کی ترویج کے لیے جتنا ہو سکے، کروں۔" اصغر شاہ بھی عقیدت اور جذبات سے بوجھل آواز میں بولے تھے۔ فون کی دوسری طرف موجود مربی شفیق کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

"آپ نے حق کی بات کر ہی دی ہے تو مجھے یاد آیا۔ آپ نے اپنی آمدنی کا سارا ریکارڈ اپنے حلقے کے ناظم مال کو بھجوا دیا ہے؟"

"جی ہاں، وہ تو میں نے پچھلے ہفتے ہی بھیج دیا تھا۔ ساتھ ہی میں نے اپنی آمدنی کا سولھواں حصہ جماعت

کے اکاؤنٹ میں بھیج دیا تھا۔"

اصغر شاہ نے فون ریسیور کی الجھی ہوئی لچک دار تار کو ایک ہاتھ سے سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بتایا۔

"خدا آپ کے اس عمل کو قبول کرے۔آمین۔دیکھیں شاہ جی! یہ چندہ ہماری اپنی جیبوں میں تو جانا نہیں ہے، جماعت کے کاموں میں ہی لگنا ہے۔ اگر ہمارے اس چندے سے کسی کو ہدایت ملتی ہے تو سوچیے، یہ کتنا بڑا کارِ خیر ہے"!

مربی نے اپنے سامنے رکھے کاغذات پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ان کاغذات پر ان کے حلقے کے ہر قادیانی گھرانے کی انکم کی تفصیلات تھیں۔

"سچ پوچھیں تو میرے دل میں اس جماعت کے لیے جو محبت پیدا ہو چکی ہے،اس کے سامنے یہ چندہ مجھے بہت کم لگا۔اگر جماعت مجھ سے میری آمدنی کا نصف حصہ بھی مانگے تو میں دینے کو تیار ہوں۔"اصغر شاہ جذبات سے مغلوب تھے۔مربی کھل کر مسکرایا۔

"تو شاہ جی! دیر کس بات کی؟فرض چندہ تو آپ دے چکے ہیں۔لیکن اگر آپ مزید جماعت کی راہ میں کچھ دینا چاہتے ہیں تو آپ کا جتنا دل چاہے،اتنی رقم دے دیں۔ جس طرح نفلی صدقات ہوتے ہیں،اسی طرح ہمارے مسلک میں بھی صدقات دینے کی ترغیب دی جاتی ہے۔انہیں 'انہیں' 'طوعی چندہ' کہتے ہیں۔ "

"یہ آپ نے بہت عمدہ بات بتائی۔"اصغر شاہ کے لہجے میں خوشی تھی:"میں پہلے کچھ مدرسوں کو رقم بھیجا کرتا تھا تا کہ وہاں کے طالب علموں کی کچھ کفالت ہو سکے، لیکن اب میں وہاں بھیجنے کی بجائے جماعت میں بھیج دیا کروں گا۔ ہماری جماعت کے بچے ہماری رقوم کے زیادہ حق دار ہیں۔ کل کو انہی نے آگے بڑھ کر ہدایت کا پیغام پھیلانا ہے۔"

"آپ کا جماعت کے لیے احساس اور محبت قابلِ رشک ہے۔مجھے بے حد خوشی ہے کہ آپ حق اور سچائی کو جان پائے اور ہماری جماعت میں شامل ہو گئے۔آپ جیسے قدردانوں کی ہماری جماعت کو بہت

ضرورت ہے شاہ جی! اللہ آپ کو بہت نوازے۔'' مربی کے تعریفی کلمات سے اصغر شاہ طمانیت سے مسکرائے۔

''منگلا آپ کے پاس کب آرہا ہے؟''

''میں نے اسے کہا ہے کہ اکتیس مارچ کو رزلٹ نکلنا ہے اور دس اپریل سے دوبارہ کلاسیں شروع ہونی ہیں، تو وہ نو سے جوائن کرلے آکر۔''

''صحیح... میں ایک اور بات بھی کرنا چاہ رہا تھا۔'' مربی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''کہیں ناں، رک کیوں گئے؟'' الجھی ہوئی تار اصغر شاہ کی انگلیوں میں سلجھتی جا رہی تھی۔

''آپ ہمارے لٹریچر میں حضرت جی کے وضع کردہ نظام وصیت اور شرائط کے بارے میں پڑھ چکے ہوں گے۔''

''نہیں، ابھی میری نظر سے نہیں گزرا۔ کیا آپ مجھے اس کے بارے میں بتا سکتے ہیں؟ '

فون کی الجھی تار سلجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ تنگ آکر اصغر شاہ نے تار کو چھوڑ کر اپنی توجہ گفتگو پر مرکوز کر دی۔

''جب آپ ربوہ گئے تھے تو آپ کو بہشتی مقبرہ کی زیارت کا موقع مل سکا تھا؟''

''نہیں، مجھے افسوس ہے کہ وقت کی قلت کی وجہ سے میں اس زیارت سے محروم رہا تھا۔ آپ بتائیے۔''

''اس بہشتی قبرستان میں ہماری جماعت کی بہت ممتاز شخصیات دفن ہیں۔ ہمارے حضرت کی اہلیہ، ان کی اولاد، ڈاکٹر عبدالسلام، چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان اور ان جیسے بہت سے بڑے نام۔ یہ عام نہیں، بہت خاص قبرستان ہے اور یہاں قبر ملنا انتہائی سعادت کی بات ہے۔ جیسے عام مسلمانوں کے لیے مکہ میں جنت البقیع بہت اہم ہے اور وہاں دفن ہونا معمولی بات نہیں ہے، اسی طرح یہ قبرستان بھی خاص ہے۔''

''بے شک! اتنے بڑے لوگوں کے قرب میں جگہ پانا ہی اتنی بڑی سعادت ہو گی!'' اصغر شاہ بولے تھے۔

''جی ہاں، لوگ تو بے تاب ہوتے ہیں کہ مرنے کے بعد انہیں اس قبرستان میں دفن کیا جائے۔ لیکن اس کے لیے ہمارے مرزا صاحب نے چار شرائط رکھی ہیں، جو بھی ان شرائط کو پورا کرلے، اس کو بہشتی قبرستان میں جگہ مل جاتی ہے۔''

''مجھے جلدی سے بتائیے کہ وہ شرائط کیا ہیں؟؟ تاکہ میں اس سعادت سے محروم نہ رہ جاؤں۔''

اصغر شاہ بے چین ہوئے۔ ان کی بے چینی محسوس کرکے مربی مسکرایا۔

''ہمارے اعلیٰ حضرت نے 'الوصیت، روحانی خزائن، جلد بیس، صفحہ تین سو بیس'' میں اس حوالے سے پہلی شرط یہ رکھی ہے کہ بہشتی قبرستان میں تدفین کے خواہش مند کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق کچھ رقم ادا کرے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس قبرستان میں صرف وہی مدفون ہوگا جو وصیت کرے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے ترکے میں سے دسواں حصہ جماعت کو دیا جائے گا تاکہ اسے اسے اشاعتِ اسلام اور تبلیغ احکام قرآن پر خرچ کیا جائے۔ دسویں حصے سے زیادہ بھی دیا جاسکتا ہے لیکن کم ہرگز نہیں۔ تیسری شرط یہ کہ وہ فرد متقی ہو، شرک اور بدعت والے کام نہ کرتا ہو اور سچا اور صاف مسلمان ہو۔ اور آخری شرط یہ ہے کہ اگر کسی کی کوئی جائیداد نہیں ہے لیکن یہ ثابت ہو جائے کہ مرنے والے نے اپنی زندگی دین کے لیے وقف کردی تھی اور صالح تھا، تو وہ بھی اس قبرستان میں دفن ہوسکتا ہے۔''

''کون بدقسمت مسلمان ہوگا جو بہشتی قبرستان میں دفن نہ ہونا چاہے؟'' اصغر شاہ نے تعجب سے کہا تھا: ''آپ مجھے اس وصیت کا طریقہ کار بتادیں۔ میں یہ وصیت لکھنے میں دیر نہیں کرنا چاہتا۔''

''بہت بہتر شاہ جی...!'' مربی نے مطمئن لہجے میں کہا تھا۔ ''موت کا کوئی پتا نہیں، کسی بھی وقت آ سکتی ہے۔ میں منگلا کے ہاتھوں آپ کو کاغذات بھجوادوں گا، یا آپ کسی روز بیت الذکر تشریف لائیں ناں، بہت دن ہوگئے ملاقات کیے ہوئے۔ گپ شپ بھی کریں گے اور یہ کام بھی کرلیں گے۔''

''میں کل ہی حاضر ہوتا ہوں۔ نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔'' اصغر شاہ بھی مسکرائے تھے۔

''کل ملتے ہین پھر۔ اب اجازت دیجیے۔'' الوداعی کلمات کے ساتھ فون بند کیا جاچکا تھا۔ اصغر شاہ نے فون ریسیور کو کریڈل پر رکھ کر فون کو واپس کمرے میں رکھا اور خود باہر نکل گئے۔ دیوار پر لگے فون

اسٹینڈ پر رکھے فون کی تار پہلے سے بھی زیادہ الجھ چکی تھی۔

....☆....

کمرے میں فاطمہ کے ہلکے ہلکے خراٹے گونج رہے تھے لیکن منال کی آنکھوں سیند کوسوں دور تھی۔ جس طرح کا انکشاف الوینہ نے کیا تھا، اس کے بعد سے اس کی نیند کا اڑنا بنتا بھی تھا۔ اس وقت بھی جب گھڑی رات کا ایک بجا رہی تھی، وہ اپنے بستر پر ٹانگوں کو موڑ کر اور ان کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنا کر، گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے کمال تھا!

قدرے سانولی رنگت لیکن تیکھے نقوش والا کمال جسے اس سے محبت تھی اور جو اپنی محبت کو اپنی بساط سے بھر کر شان دار مستقبل دینے کے لیے دبئی کی دھوپ سہہ رہا تھا۔ دوسری طرف رستم رئیس تھے!

قدرے موٹے ہونٹوں پر گھنی مونچھیں اور کالے بالوں میں کہیں کہیں سفید بالوں والے رستم رئیس، جنہوں نے اس کو الوینہ کے ساتھ اپنے محل نما گھر میں دیکھ کر کہا تھا کہ شکر ہے، اس گھر میں بھی رونق آئی۔

”استغفر اللہ...!! یہ میں کیا سوچ رہی ہوں؟“

منال کو اچانک جھرجھری سی آئی تھی: ”الوینہ کے ڈیڈی کیسے میری سوچوں میں آسکتے ہیں؟ لاحول ولا قوۃ الا باللہ..“!!

اس نے فوراً سر جھٹک کر جیسے رستم رئیس کو اپنے ذہن سے نکالنے کی کوشش کی، لیکن پانی کا پورا گلاس ختم کر کے وہ جیسے ہی سونے کے لیے لیٹی تو بند آنکھوں کے سامنے رستم رئیس کی شبیہہ پہلے اور کمال کی شبیہہ بعد میں آئی تھی۔

....☆....

”شاہ جی! سب ٹھیک جا رہا ہے؟“ ایک سہ پہر اصغر شاہ کو میاں عبدالکریم کا فون آ ہی گیا۔ رسمی سلام دعا اور حال چال پوچھنے کے بعد عبدالکریم صاحب نے پوچھا تھا۔ جواب میں کچھ لمحوں کے لیے اصغر شاہ خاموش ہو گئے۔

''ہیلو...؟''عبدالکریم صاحب جواب نہ پا کر سمجھے تھے کہ رابطہ منقطع ہو گیا ہے۔

''جی جی، سب ٹھیک ہے۔''اصغر شاہ نے جواب دیا تھا۔

''یہ منگلا کا کیا ماجرا ہے شاہ جی..؟''عبدالکریم کا سوال سن کر اصغر شاہ نے برا سا منہ بنایا۔

''کچھ نہیں.... کچھ بھی نہیں ...بس چھوٹا سا ایک واقعہ ہوا تھا، واقعہ بھی کیا،اس نے ایک غیر ضروری سوال پوچھ لیا تھا، تو آگے سے ہنگامہ ہی کھڑا ہو گیا۔ مجبوراً مجھے اسے نوکری سے نکالنا پڑا۔''

''لیکن...بلال کہہ رہا تھا کہ اس نے....''ابھی عبدالکریم کچھ کہنے ہی والے تھے کہ اصغر شاہ درمیان میں بول اٹھے۔

''ارے بلال تو بچہ ہے۔ نہ سمجھ اور جذباتی ہے جو اس عمر کے لڑکے ہوتے ہی ہیں۔ منگلا نے ایسی کیا عجیب بات کر دی تھی کہ اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا گیا؟''

''یہ جماعت اسی طرح کے سوالوں سے آغاز کرتی ہے شاہ جی۔''

عبدالکریم صاحب نے نرمی سے کہا۔ حالانکہ وہ اصغر شاہ کے لہجے میں تلخی محسوس کر چکے تھے۔

''کیا جماعت جماعت لگا رکھی ہے آپ سب نے؟'' اب اصغر شاہ تلخی کے اظہار کو روک نہ پائے۔:''جماعت نہ ہو گئی، کوئی بلا ہو گئی جو ہمارے ایمان کو اچکنے کے درپے ہے۔ حقیقت کو کون جانتا ہے کہ یہ جماعت ایمان اچکنے کی کوشش کر رہی ہے یا ایمان بچانے کی؟''

''شاہ جی...!''عبدالکریم صاحب کی چھٹی حس انہیں بہت پہلے سے خبر دار کر تو رہی تھی لیکن اب اصغر شاہ سے بات کرتے ہوئے انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا ہے یا اونچا ہو چکا ہے! قیامت آ رہی ہے یا آکر گزر گئی ہے۔

''بس رہنے دیں میاں صاحب! کوئی اور بات کریں۔''

اصغر شاہ نے بیزاری سے کہا تھا۔ میاں عبدالکریم ان کے اس لہجے کے آگے مزید کیا بات کرتے۔

....☆....

''میں کہیا، خیر تو ہے...؟ عادل بتا ریا سی کہ ایک واری فیر کالی گاڑی آئی تھی...''چاچی بشیراں اپنے

تجسس کو زیادہ دیر دبا نہیں پائی تھیں، تبھی بے چین ہو کر بابا اسحاق کے گھر پہنچ گئیں اور اب کمرے میں چارپائی پر بیٹھی پوچھ رہی تھیں۔ باہر ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔

"ہاں... آئی تھی... منال کی سہیلی نے کچھ کپڑے وغیرہ بھیجے سی منال واسطے..." اماں نے گول مول جواب دیا لیکن چاچی بشیراں کی زیرک نگاہوں سے وہ بڑے بڑے شاپر چھپ نہیں سکے جن کے اندر سے اگرچہ اماں نے سامان نکال کر الماری میں چھپا دیا تھا لیکن شاپر کو چھپانے کی طرف ان کا دھیان نہیں گیا تھا،اور اب وہ دیوار پر کپڑوں کی کھونٹی پر لٹکے ہوئے تھے۔

"لگتا تو ایسے ہے کہ پورے ٹبر کے لیے بھیجے تھے...." چاچی بشیراں نے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا تھا۔

"تے فیر..؟ اگر پورے ٹبر کے لیے بھی بھیجے تو تم کو کیا..؟ ہم منال کے ماں باپ ہیں.. ہمارا خیال کرکے انھوں نے ہمارے لیے بھی بھیج دیے تو کیا ہے؟" اماں کو چاچی بشیراں کی جرح سے کوفت ہو رہی تھی۔

"لے دس... !!" چاچی بشیراں نے اماں کی بے زاری نوٹ کر لی تھی: "وئی تم کیوں جلی بیٹھی ہو..؟ خیر نال کپڑے پاؤ، جم جم پاؤ..."

اس کے ساتھ ہی چاچی بشیراں نے موضوع بدل دیا تھا۔

....☆....

منگلا اور نبیل اصغر شاہ کے مہمان خانے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ قدرے لمبی ناک والا پینتیس سالہ نبیل چہرے مہرے سے کچھ تیز طرار قسم کا لگتا تھا۔

"میرے داد میر قربان بخش نے اس جماعت میں شمولیت اختیار کی تھی۔ ان کی کوششوں سے پورے خاندان نے یہ ہدایت قبول کر لی تھی۔"

وہ اپنے بارے میں بتا رہا تھا اور اصغر شاہ اور منگلا شوق سے سن رہے تھے۔

"ماشاءاللہ ماشاءاللہ..."!!

''کافی عرصے سے میں دینِ اسلام کی ترویج میں اپنا حصہ ڈالنے میں لگا ہوا ہوں۔ بہت سے لوگوں نے میرے ہاتھوں پر ہمارے مسلک کو قبول کیا ہے۔ بلکہ جلال پور جٹاں کے قریب ایک پورے گاؤں نے ہماری جماعت میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ ان کے اس فیصلے سے مولویوں کو خوب غصہ آیا، انہوں نے وہاں کے لوگوں کو لمبی لمبی تقریریں کر کے ہمارے خلاف کرنے کی بہت کوشش کی، ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن ہم نے ان کی ایک نہ چلنے دی اور پورے گاؤں کو اپنی جماعت میں شامل کر کے ہی دم لیا۔''

نبیل نے فخر سے بتایا۔ اس کی بات سن کر اصغر شاہ کے ذہن میں فوراً سیٹیلائٹ ٹاؤن کی مسجد کا امام آیا تھا۔

''آپ کو تو بخوبی اندازہ ہے کہ تعداد میں قوت ہے۔ اس ملک میں نام نہاد مسلمانوں کی اکثریت ہے اس لیے جس کا جو دل چاہتا ہے، ہمارے خلاف قانون بنا لیتا ہے۔ ہماری جماعت کا یہ دیرینہ خواب ہے کہ پاکستان میں ہمیں اکثریت حاصل ہو، اکثریت نہیں تو کم از کم ہم تعداد میں اتنے زیادہ ضرور ہو جائیں کہ ہماری رائے کا بھی وزن ہو۔''

''درست کہہ رہے ہیں آپ....'' اصغر شاہ نے سر ہلایا۔

''آپ کا اس علاقے میں اثر و رسوخ ہے۔ میں تصور کی آنکھ سے آپ کے ہاتھوں بہت سے لوگوں کو صحیح کا مسلمان ہوتے ہوئے دیکھ سکتا ہوں۔''

نبیل نے جوش سے کہا تو اصغر شاہ کی آنکھیں مسکرا اٹھیں۔

''کیوں نہیں، آپ دیکھنا، جلد ایسا ہی ہو گا۔ اب ایسا ہے کہ....'' اصغر شاہ بولے: ''کل سے سکول دوبارہ کھل رہے ہیں۔ منگلا! تمہارے لیے تو لیب ٹیچر کی پوزیشن پہلے سے موجود ہے اور نبیل! آپ کے لیے انگلش ٹیچر کی پوزیشن حاضر ہے۔ کل سے جوائن کر لیں۔''

''بہت شکریہ شاہ جی...!'' نبیل اور منگلا نے ایک ساتھ کہا تھا۔

''میری تو دلی خواہش ہو گی کہ آپ منگلا کے ساتھ میرے مہمان خانے میں ہی قیام کریں، یہاں آپ کو کسی بھی قسم کا کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ کیوں منگلا؟''

سوال کے ساتھ ہی انہوں نے منگلا کی جان دیکھا۔

"بالکل جی..!! میں جتنا بھی عرصہ یہاں رہا، میرا بہترین وقت گزرا۔" منگلا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔ اسی وقت کسی نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تینوں نے چونک کر دیکھا تو دروازہ کھول کر مراد اندر جھانک رہا تھا۔

"منگلا پائین...!" وہ منگلا کی آمد سے لاعلم تھا، تبھی اچانک منگلا پر نظر پڑتے ہی خوشی سے بولا۔ منگلا بھی مسکرا کر کھڑا ہو گیا۔ منگلا کے سابقہ قیام میں دونوں کی بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ نبیل نے دلچسپی سے مراد کو دیکھا جو اب منگلا سے معانقہ کر رہا تھا۔

"یہ بندہ بھی کام کا ہے!" نبیل نے اسے دیکھتے ہوئے دل میں سوچا تھا!

....☆....

اگلی دوپہر رستم رئیس، الوینہ کے ساتھ اپنے پسندیدہ ریستوران میں بیٹھا ہوا تھا۔

"تم نے اس سے بات کر لی...؟"

رستم نے بے تابی سے پوچھا تھا۔ جواب میں الوینہ نے سپاٹ چہرے کے ساتھ اپنے باپ کی جانب دیکھا۔

"ہاں.....وہ پہلے سے ہی انگیجڈ ہے، اس لیے وہ آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔"

"واٹ...؟ انگیجڈ...؟ مطلب وہ منگنی شدہ ہے؟" رستم رئیس کو حیرت ہوئی۔

"یس...." الوینہ نے مختصر جواب دیا اور میز پر رکھے کانٹے سے میز پوش پر ان دیکھی لکیریں کھینچنے لگی۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟" رستم کے لہجے میں غصہ اترا۔

"کیونکہ مجھے بھی پہلے علم نہیں تھا۔ جب میں نے اس سے اس سلسلے میں بات کی تو اس نے مجھے بتایا۔"

الوینہ بدستور میز پوش پر لکیریں لگا رہی تھی۔ رستم نے غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔

''کیا کرتا ہے وہ....؟''

''I am not going to tell you that!''الوینہ نے اپنے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوف لہجے میں کہا تھا۔

''Now you can't marry her. Better leave her alone then!

رستم الوینہ کے اس انداز پر کچھ لمحے تو اسے گھورتا رہا، پھر اچانک اس کے چہرے کے تنے ہوئے عضلات ڈھیلے ہوئے تھے۔

''Sure, as you wish my princess!''انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا اور ویٹر کو آواز دے کر آرڈر لکھوانے لگے۔ الوینہ ان کی اس اچانک کایا پلٹ پر ہکا بکا رہ گئی تھی۔ اسے باپ سے اتنی جلدی مان جانے کی توقع نہیں تھی۔

....☆....

دن تیزی سے گزرتے جارہے تھے۔ نئے تعلیمی سال کے ساتھ ہی منگلا نے بطور کمپیوٹر ٹیچر اور نبیل نے بطور انگلش ٹیچر بظاہر اپنے منصب لیکن پسِ پردہ اپنے اپنے میدان سنبھال لیے تھے۔ منگلا کو دیکھ کر آغاز میں کچھ اساتذہ اور والدین نے اعتراض کیا تھا لیکن اصغر شاہ نے دوٹوک الفاظ میں سب کو کہہ دیا تھا کہ محض مذہبی عقائد کی بناء پر وہ کسی کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیں گے اور جسے اس بات اور منگلا سے کوئی مسئلہ ہے، وہ سکول چھوڑ کر جا سکتا ہے۔

کچھ والدین نے اپنے بچوں کو احتجاجاً کسی دوسرے اسکول میں داخلہ دلوا دیا جبکہ اکثر والدین تھوڑا سا احتجاج کر کے خاموش ہو گئے۔ یہی اساتذہ کے معاملے میں بھی ہوا۔ سوائے سر لیاقت کے، کوئی بھی استاد اپنی لگی لگائی نوکری چھوڑنے کی ہمت نہ کر سکا۔ اکثریت کے سامنے مالی مشکلات آڑے آ گئی تھیں۔

''یہ نوکری چھوڑ دی تو دوسری نوکری کیسے ملے گی؟''ایک استاد نے سوچا تھا۔

''ریحانہ اور شبانہ کا جہیز کیسے جمع ہو گا؟''ایک استاد کے سامنے اس کی دونوں بہنیں آ گئیں۔

''اپنا گھر کی قسطیں کس طرح بھروں گا؟'' ایک استاد کے سامنے پچھلے ہفتے مالک مکان کے ساتھ ہوئی بحث یاد آگئی جو کرایہ بڑھانے کی اطلاع دے رہا تھا۔

''ابو کا علاج..؟'' ایک استاد نے اپنی جیب سے والد کی دوائیوں کی پرچی نکال کر دیکھی جو اس کی بیوی نے صبح اس تاکید کے ساتھ اسے تھمائی تھی کہ سکول سے واپسی پر یہ دوائیاں لیتے آنا۔

''میں نے یہ نوکری چھوڑ دی تو دوسری نوکری پتا نہیں کب ملے، تب تک صرف ابو کی تنخواہ میں گزارا کس طرح ہو گا؟''

ایک استاد کے سامنے اس کے والد آگئے جو کلرکی کی نوکری کرتے کرتے بوڑھے ہو چکے تھے۔ سب کی اپنی اپنی مشکلات اور مجبوریاں تھیں لیکن سبھی نے اپنے آپ کو یہ سوچ کر بہلایا کہ ایک واقعہ تھا جو کب کا گزر چکا ہے۔ ہم میں سے کسی کے پاس یہ ثبوت نہیں کہ منگلا کا اس جماعت کے ساتھ تعلق ہے اور ہو بھی تو میرا ایمان اتنا کمزور نہیں کہ میں کسی کے دو تین جملوں یا سوالوں سے بھٹک جاؤں۔ ویسے بھی اسکول میں اس موضوع پر گفتگو سختی سے منع ہے۔ تو اب ایسا کوئی معاملہ نہیں ہو گا۔

تین چار اساتذہ نے حفظِ ماتقدم کے طور پر منگلا کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ اس سے میل جول اور بات چیت، سب سے گریز کرتے البتہ نبیل سے ان کی اچھی سلام دعا تھی۔ سر لیاقت کی جگہ سر عظمت نے لے لی تھی، وہی سر عظمت جو 'عظمت کمپیوٹر انسٹیٹیوٹ' چلا رہے تھے۔

سر نبیل کے پڑھانے کا انداز دوستانہ تھا، دورانِ تدریس وہ لڑکوں سے گپ شپ بھی کرتے رہتے تھے البتہ مذہبی اور کسی بھی ایسی بات سے گریز کرتے تھے جس سے کوئی مسئلہ کھڑا ہو۔ بلال اور دیگر لڑکوں نے شروع میں تو سر سعید کی کمی کو بہت محسوس کیا تھا لیکن اب پڑھائی میں مصروف ہو گئے تھے۔ بلال البتہ سر سعید سے اب بھی رابطے میں تھا۔

ہفتے میں ایک دن وہ ضرور ان کے گھر کا چکر بھی لگا لیتا تھا جہاں سر سعید اسے ختمِ نبوت کے حوالے سے بہت اچھے انداز میں سمجھاتے تھے۔ رفتہ رفتہ سب معمول پر آگئے۔ اسکول کی فضا ویسی ہی دوستانہ ہو گئی جیسے پہلے تھی۔

''شکر ہے میں نے جذبات میں آکر یہ نوکری چھوڑ نہیں دی۔ایسے ہی ہوا بنا دیا تھا اُس معاملے کو۔''

سر احسان نے ایک دن سوچا تھا،اس بات سے بے خبر کہ اصغر شاہ کی بھرپور پشت پناہی کے ساتھ منگلا، نبیل اور عظمت کی خفیہ کارروائیاں جاری تھیں اور ان کے دو دوست اساتذہ کو چوری چھپے تبلیغ کر کے صرف دو ماہ میں اپنی جماعت میں شامل کیا جا چکا تھا۔

....☆....

''وے کمال.. وے کمال... !'' چاچی بشیراں نے حسبِ عادت 'کمال' کے لام کو لمبا کھینچا تھا:

''مجھے سا کوتے اس کی بیوی کے ارادے ٹھیک نئیں لگدے.. !'' کمال نے دبئی سے انہیں فون ملایا ہوا تھا۔ماں کی بات سن کر وہ پریشان ہو گیا۔

''کیا ہو گیا ماں.. ؟سب ٹھیک تے ہے؟''

''مینوں تے کچھ وی ٹھیک نئیں لگ ریا.. !'' چاچی بشیراں نے دوپٹہ کان کے پیچھے اڑستے ہوئے کہا تاکہ بیٹے کی آواز زیادہ صاف سنائی دے:

''اُن کے گھر ایک وڈّی سی کالی گاڑی آتی جاتی ہے... میں نے پتا کیا تھا.. مگر وہ تو ویسے ہی مکر گئے سب کے سب... اے کوئی گل اے بھلا.؟ بہر حال اندر کھاتے کچھ گڑ بڑ ضرور اے۔'' اماں کی بات سن کر کمال پریشان ہو گیا۔بلکہ وہ مکمل طور پر الجھ کر رہ گیا تھا۔

''اماں! کھل کر بات کروناں، کون سی گڈی؟اور کون آتا جاتا اے؟'' جواب میں چاچی بشیراں نے مرچ مصالحے لگا کر الوینہ اور اس کے باپ کی آمد اور پھر بعد میں سامان کا احوال سنا دیا تھا۔ان کی باتیں سن کر خوش باش سا کمال حد درجے پریشان ہو کر رہ گیا۔

اس کی پریشانی میں کچھ روز مزید اضافہ ہو گیا جب اچانک ہی اگلے دن اسے نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔وہ حیران و پریشان تھا کہ ایسا کیا کر دیا میں نے؟اس نے اپنے تئیں سب سے بات کرنے کی کوشش کی ،پھر اپنے باس سے ملا:

''سر جی... ! مجھے نوکری سے نکال دیا، لیکن کوئی وجہ تو پتا چلے... ؟اگر مجھ سے غلطی ہوئی ہے تو مجھے

بتائیں، میں اسے درست کر دیتا ہوں۔"

کمال نے اپنی نوکری بچانے کی بہت کوشش کی، لیکن جواب میں اسے بس یہی سننے کو ملا کہ کمپنی کو اب اس کی مزید ضرورت نہیں ہے اور اسے اب اپنی ساری جمع پونجی سمیٹ کر واپس پاکستان جانا ہو گا۔

یہ خبر اس کے لیے بہت دل برداشتہ تھی۔ اس کی ساری بنی بنائی امیدوں پر پانی پھر رہا تھا۔ وہ اپنے بوڑھے ماں باپ اور منال کو کیا بتائے گا اپنے نوکری کے بارے میں... یہی سوچ سوچ کر اس کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ نمناک آنکھوں کے ساتھ اس نے یہ اطلاع اپنے گھر والوں کو دی اور دل پر پتھر رکھ کر اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔

"باس! کام ہو گیا ہے!" جیک کو سہلاتے ہوئے رستم کو کسی نے فون پر اطلاع دی تھی۔

"گڈ! اب دوسرا کام بھی ہو جانا چاہیے۔" اس نے شاطر سی مسکراہٹ کے ساتھ اطلاع دینے والے کو کہا اور فون بند کر دیا۔

....☆....

یونی ورسٹی میں دو ہفتے کی چھٹیاں ہوئیں، تو دیکھتے ہی دیکھتے پورا ہاسٹل خالی ہو گیا۔ بابا اسحاق کو منال نے اطلاع دے دی تھی۔ اس لیے وہ عین وقت پر ہاسٹل کے باہر پہنچ چکا تھا۔ میل ملاقات کے بعد منال اور بابا اسحاق ساہیوال جانے والی بس پر سوار ہو چکے تھے۔ اس دوران منال نے محسوس کیا کہ بابا کچھ چپ چاپ سے ہیں۔ ان کی ایسی خاموشی پہلے تو کسی نے نہیں دیکھی تھی۔ منال سے رہا نہ گیا:

"کیا بات ہے ابا...؟"

"ہوں....؟" بابا اسحاق جیسے گہری سوچ سے جاگا تھا: "کچھ کہا تُو نے مجھے..؟"

"میں نے پوچھا ہے کہ سب ٹھیک تو ہے ناں.. تو اتنا چپ چاپ کیوں ہے؟" منال نے اپنا سوال دوبارہ دہرایا۔

"ہاں ہاں دھیے، سب ٹھیک اے..." بابا اسحاق نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر جیسے کچھ سوچ کر منال سے پوچھنے لگے:

''وہ تیری سہیلی.... کی نام سی اوہدا..... ہاں یاد آیا... الوینہ..... وہ ٹھیک ہے ناں؟''

''جی ابا....، وہ بھی ٹھیک ہے، پر تُو کیوں پوچھ رہا ہے ابا...؟''

منال کی نظروں کے سامنے گزرے دن کا منظر گزرا جس میں الوینہ نے ایک دفعہ پھر اس سے معذرت کی تھی کہ اسے اپنے باپ اور منال کی شادی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے تھا، اور یہ کہ یہ موضوع ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے اس لیے منال کو اس کے بارے میں پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔

''بس ایسے ہی... ایویں خیال سا دل میں آیا تھا.. ''

''اوہ۔ ٹھیک.... وہ اچھی ہے ابا... اس کو کیا ہونا...''

بابا اسحاق نہ جانے کیوں اسے رستم رئیس کی جانب سے بھیجے گئے سامان کے بارے میں بتاتے بتاتے رک گئے۔

''کمال پتر وی واپس آرہا اے۔'' بابا اسحاق نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''اچھا...؟ وہ تو ابھی کچھ ہفتے پہلے ہی چھٹی سے واپس گیا تھا۔'' منال کو حیرت ہوئی۔

''ہاں، اب ہمیشہ کے لیے آرہا ہے شاید.... کام ختم ہو گیا اے اس کا...'

' بابا اسحاق نے اپنے صافے کو دوبارہ کندھے پر رکھتے ہوئے بتایا جو بس کے ہچکولوں کی وجہ سے پھسل کر ان کے بازو تک آگیا تھا۔

''اوہ....'' منال کو افسوس ہوا۔ اس کے ذہن میں کمال کے وہ جملے گونجے تھے جو اس نے دبئی جاتے ہوئے کہے تھے:

''تم دیکھنا منال..! میں دبئی میں رہ کر اتنا پیسہ اکٹھا کر لوں گا کہ تم ساری زندگی عیش کرو گی۔ جیسے ہی تمہاری پڑھائی ختم ہونے والی ہو گی تو میں تمہارے لیے بہت بڑی سی کوٹھی بنواؤں گا، بالکل ویسی جیسی شہروں میں ہوتی ہے، اور اس میں ہر کمرے کے ساتھ ہی لیٹرین بنواؤں گا اور باورچی خانہ بھی اندر ہی ہو گا... اور جب تمہاری پڑھائی ختم ہو جائے گی تو میں ہمیشہ کے لیے دبئی سے واپس آجاؤں گا اور بارات لے کر

تمہارے گھر پہنچ جاؤں گا۔‘‘

اور اب.... نہ تو ابھی۔ منال کی پڑھائی ختم ہوئی تھی اور نہ ہی کوٹھی بننا شروع ہوئی، لیکن کمال کی نوکری ختم ہو گئی تھی۔ بس کے ایک زوردار جھٹکے سے منال کا بڑی سی کوٹھی کا سپنا چھن کر کے ٹوٹا تھا۔

....☆....

اور ایک دن اصغر شاہ کے اپنے گھر میں زلزلہ آ ہی گیا!

اصغر شاہ کو اس جماعت میں شامل ہوئے اور اپنے طور پر 'سچا مسلمان' بنے تقریباً سات ماہ ہو چکے تھے۔اس عرصے میں انہوں نے گھر والوں کو اس تبدیلی کے بارے میں نہیں بتایا تھا البتہ اس جماعت کے حوالے سے ان کی ذہن سازی ضرور کرتے رہے تھے کہ یہ لوگ مسلمان ہی ہیں۔ جیسے مسلمانوں کے مختلف فرقے ہیں، اسی طرح اسے بھی ایک فرقہ ہی سمجھا جائے، نہ کہ 'کافر' قرار دے کر اسلام سے ہی خارج کر دیا جائے۔

اصغر شاہ کو اس بات کا تو یقین تھا کہ جب وہ اپنے گھر والوں کو اس جماعت میں شمولیت کی دعوت دیں گے اور انہیں اپنے بارے میں بھی بتائیں گے تو جواب میں کسی قسم کی مزاحمت یا تو ہو گی ہی نہیں، یا پھر بہت کم اور وقتی ہو گی کیونکہ اصغر شاہ کے پاس وسیع مطالعہ اور دلائل تھے، اور ان کے سامنے ایک گھریلو، سیدھی سادھی خاتون تھیں جس کی زندگی شوہر، بچے اور گھر کے گرد گھومتی تھی، اور تین بچے تھے جن کے نزدیک زندگی ابھی تک تو صرف پڑھائی اور کھیل کا نام تھا۔

وہ اصغر شاہ کے دلائل کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ایسا اصغر شاہ کو لگتا تھا! انہیں بس خاندان والوں کے ردِ عمل کی طرف سے تھوڑی سی پریشانی تھی اس لیے انہوں نے ابھی تک اس جماعت میں

شمولیت کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا۔ وہ اتوار کا دن تھا۔ بچے اور اصغر شاہ اسکول میں تھے۔

''پتا نہیں رابعہ نے کہاں رکھ دی ہے کتاب؟''

نگہت بیگم دوپہر کے کھانے کے لیے بہت دنوں سے کوکب خوابہ کی ترکیب سے نرگسی کوفتے بنانا چاہ رہی تھیں لیکن موقع نہیں مل رہا تھا۔ پچھلے ہفتے انہوں نے ٹی وی پر کوکب خوابکا کوکنگ پرا گرام دیکھتے ہوئے ترکیب کو اپنی ڈائری میں نوٹ کیا تھا۔ کل شام کو اصغر شاہ نے مراد کے ہاتھوں گائے کا قیمہ منگوادیا تھا اور اب نگہت بیگم کو وہ ڈائری ہی نہیں مل رہی تھی۔ وہ رابعہ کا کمرہ دیکھ چکی تھیں لیکن وہاں ڈائری نہیں تھی۔ عمر اور علی کے مشترکہ کمرے میں ڈائری کے پائے جانے کا امکان بہت کم تھا لیکن پھر بھی انہوں نے اس کمرے کو بھی چیک کر لیا لیکن ڈائری نے ملنا تھا نہ ملی۔

ڈائننگ روم، ڈرائنگ روم، ٹی وی لاؤنج، سب جگہوں پر دیکھ لیا لیکن ڈائری تو ایسے غائب تھی جیسے گدھے کے سر سے سینگ! اب نگہت بیگم کو کوفت کے ساتھ ساتھ فکر بھی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ صرف کھانے پکانے کی تراکیب پر مشتمل ڈائری ہی نہیں تھی بلکہ اس میں انہوں نے خاندان بھر کے فون نمبر بھی لکھے ہوئے تھے۔ روزمرہ کے کتنے ہی ٹوٹکے اس میں درج تھے، گھریلو بجٹ کے حوالے سے سارا حساب کتاب تھا جو وہ اپنی اس گہرے نیلے رنگ کی ڈائری میں لکھتی تھیں!

''لاپرواہی کی بھی حد ہوتی ہے!! یہاں سب کو بس میں ملی ہوئی ہوں جو ان کا بکھیرا سمیٹے! مجال ہے جو استعمال کے بعد چیز کو واپس اپنی جگہ پر رکھ دیں!'' انہوں نے غصے سے کشنز کو صوفے پر پٹخا!

''یہ لڑکی زرا آئے آج اسکول سے! اس کے سارے رنگ اور ڈرائنگز کوڑے دان میں پھینکوں گی تب اسے پتا چلے گا کہ اپنی چیزوں کو خود سمیٹتے ہیں، ماں کے لیے نہیں چھوڑ جاتے! اور یہ لڑکے''!!

انہوں نے گیم کونسول کے پیچھے جھانکا کہ شاید ڈائری پیچھے گر گئی ہو لیکن وہاں سوائے علی کی پینسل کے، کچھ نہیں تھا۔

''ان کی بھی گیم بند کرواتی ہوں۔ زیادہ ہی سر پر چڑھ گئے ہیں یہ۔'' جھنجھلاہٹ ٹھیک ٹھاک غصے میں بدل چکی تھی۔ انہوں نے علی کی پینسل کو کونسول کے پیچھے سے نکالا اور اسے ٹی وی الماری میں بنے

دراز میں پھینک کر دراز کو زور سے بند کیا۔

''لگتا ہے آج بھی کوفتے نہیں بن پائیں گے!'' غصے کی جگہ اب بے بسی لے رہی تھی۔انہوں نے گھڑی پر نظر ڈالی، کھانا پکانے میں دیر ہو رہی تھی اور نگہت بیگم کی کوشش ہوتی تھی کہ ہر حال میں بچوں کے گھر آنے سے پہلے وہ کھانا پکا کر فارغ ہو جائیں۔

''بس ٹھیک ہے، آلو کی بھجیا ہی بنا لیتی ہوں۔ صبح بڑے خوش ہو کر گئے تھے کہ آج کوفتے کھائیں گے، جب سامنے آلو کی بھجیا آئے گی تو خود ہی عقل آئے گی!'' انہوں نے باورچی خانے جانے کا ارادہ کیا تو نظر غیر ارادی طور پر اصغر شاہ کے اسٹڈی روم کی جانب اٹھ گئی۔

''جہاں پورا گھر چھان مارا ہے، وہیں یہ کمرہ بھی دیکھ لیتی ہوں۔ شاید یہاں ہی مل جائے!'' انہوں نے یہ سوچ کر اسٹڈی روم کی جانب قدم بڑھا دیے۔ وہاں سب کچھ سلیقے سے رکھا ہوا تھا۔ اصغر شاہ کے سلیقے کی تو وہ پہلے دن سے قائل تھیں۔ اپنی ہر چیز کو صاف ستھرا اور ترتیب سے رکھنا اصغر شاہ کو بہت پسند تھا۔

''پتا نہیں یہ بچے پھر کس پر چلے گئے ہیں''!

انہوں نے ستائشی نظروں سے اسٹڈی روم کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ میز پر ڈائری نہیں تھی۔ انہوں نے دراز کھولنے کی کوشش کی لیکن اسے تالا لگا ہوا تھا۔

''گھر والوں سے ایسی کیا رازداری!'' ان کا موڈ دوبارہ خراب ہوا۔ تنگ آ کر وہ کتابوں کی الماری کی جانب بڑھیں کہ شاید اصغر شاہ نے اپنی کتابوں کو ترتیب دیتے ہوئے ان کی ڈائری کو بھی اپنی کتاب سمجھ کر الماری میں نہ رکھ دیا ہو۔

وہ الماری کے پٹ کھولے تیزی سے کتابوں کی قطار کو دیکھ رہی تھیں جب اچانک انہیں کچھ عجیب سا احساس ہوا اور وہ ٹھٹک سی گئیں۔ بھنوؤں کو سکیڑتے ہوئے انہوں نے سب سے اونچی شیلف پر رکھی کتابوں کے نام پڑھنے شروع کیے تو وہ انہیں کچھ عجیب سے لگا۔

' روحانی خزائن'، 'مکتوبات احمد'، القصائد الاحمدیہ، 'الوصیت'، اور دیگر کچھ کتب تھیں جن پر بطور

مصنف 'حضرت مرزا مسیح موعود و مہدی معبود' درج تھا۔ نگہت بیگم نے الجھن کے عالم میں 'روحانی خزائن' کو شیلف سے نکالنا چاہا تو اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا کتابچہ شیلف سے نکل کر زمین پر گر گیا۔

نگہت بیگم نے ایک ہاتھ میں 'روحانی خزائن' کو پکڑ کر، جھک کر دوسرے ہاتھ سے کتابچے کو اٹھایا اور کتابچے کے عنوان پر نظر پڑتے ہی ان کا ہاتھ لرز کر رہ گیا۔ وہاں جلی حروف میں 'جماعت کا مختصر تعارف' درج تھا۔

وہ 'روحانی خزائن' کو شیلف پر کتابوں کے اوپر رکھ کر فرش پر ہی بیٹھ گئی تھیں۔ کانپتے ہاتھوں سے انہوں نے اس کتابچے کو کھولا اور دھڑکتے دل کے ساتھ انہیں پڑھنے لگیں۔ جیسے جیسے وہ اسے پڑھتی جا رہی تھیں، ان کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔

''یا اللہ...!! یہ کتابچہ.... یہ فتنہ ہمارے گھر کہاں سے آگیا؟''

انہوں نے اسے دور پھینک کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ماجرا ہے، کچھ دیر تو وہ اسی طرح سر تھامے فرش پر بیٹھی رہیں، پھر ایک خیال آنے پر اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی، الماری کے پٹ کا سہارا لیتی ہوئی کھڑی ہوئیں اور اس سلسلے کی ایک اور کتاب کو الماری سے باہر نکالا۔ اس پر 'تفسیر حضرت مسیح موعود علیہ السلام' لکھا ہوا تھا۔ نگہت بیگم نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے اسے کھولا تو پہلے ہی صفحے پر کسی نے پین کی نیلی روشنائی سے لکھا ہوا تھا:

''سید اصغر شاہ صاحب کے لیے، جماعت میں شامل ہونے کی خوشی میں ایک تحفہ، شفیق حسین کی جانب سے۔''

اس سے آگے نگہت بیگم سے پڑھا ہی نہیں گیا۔ ان کے قدموں کے نیچے سے جیسے کسی نے زمین کھینچ لی تھی۔ تفسیر کو ہاتھ میں پکڑے، پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔

....☆....

''اماں...! یہ کپڑے اور سوئیٹر کدھر سے آئے ہیں؟'' منال کو الماری میں اپنا بیگ رکھتے ہوئے رستم کی طرف سے بھیجا گیا سامان نظر آگیا تھا۔ اس نے حیرت سے ایک نرم اور اسٹائلش سا سوئیٹر اٹھا کر

اماں کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"تیری سہیلی کے باپ نے بھیجے تھے.... دیکھ تو، کتنے مہنگے نیں..."!

اماں نے بہت شوق سے ایک سوٹ اٹھا کر اسے دکھایا۔

"الوینہ کے ڈیڈی نے؟" منال حیران رہ گئی: "انہوں نے یہ سب کیوں بھیجا ہے...؟ اور ابا نے اسی وقت واپس کیوں نہیں دے دیا؟ '

"ہاہائے...!" اماں نے ملامت والی نظروں سے منال کی طرف دیکھا: "نہ تو..، گھر آئی نعمت کو میں واپس دے دیتی..؟ نی او کیوں..؟"

"اماں...!" منال کو غصہ آگیا۔ پتا نہیں اماں انجان بن رہی تھیں یا انہیں واقعی رستم کے اس التفات کی اصل وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

"کوئی ایسے ہی منہ اٹھا کر کیوں ہمیں سامان دے گا..؟ کیوں ہم پر پیسہ لٹائے گا؟ تُو بات کو سمجھ کیوں نہیں رہی اماں؟"

"بس بس.....!!" اب اماں کو بھی غصہ آگیا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے چپ ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"زیادہ سیانی نہ بن! دو چار جماتاں پڑھ کے تُو اپنے آپ کو بہت سیانی سمجھ بیٹھی اے کہ اب ماں جاہل لگتی ہے... دفع دور.."!!

غصے میں اماں نے ہاتھ میں پکڑا بوسکی کا سوٹ چارپائی پر پٹخا اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔ منال وہیں چارپائی کے کنارے پر ٹک گئی اور اپنے ہاتھ میں پکڑے سوٹ کو الجھے ہوئے انداز میں دیکھنے لگی، پھر اچانک اس نے بھی بے زار ہو کر سوٹ کو ایک طرف رکھا اور خود چارپائی پر لیٹ گئی۔

....☆....

"باؤ کمال...!! ادھر ویکھو..!!" یہ کہتے کہتے منیر بازو کھول کر کمال کی جانب بڑھا تھا جو سامان کی ٹرالی گھسیٹتا ہوا لاہور ائیرپورٹ کے دروازے سے باہر نکلا تھا اور اب اپنوں کی تلاش میں چار جانب دیکھ رہا

تھا۔ منیر کی آواز سن کر اس نے چونک کر دیکھا اور پھر خوشی سے اس کی جانب بڑھا۔ منیر کے برابر میں جمیل اور ابرار بھی بانہیں پھیلائے کھڑے ہوئے تھے۔

وہ چاروں بچپن کے سنگی ساتھی تھے جنھوں نے اکٹھے ہی کچی جماعت میں جانا شروع کیا تھا۔ چاروں کے مزاج بالکل مختلف تھے۔ جہاں جمیل کا دماغ ہر وقت نت نئی شرارتیں سوچتا رہتا تھا، وہیں منیر کو فکر ہوتی تھی کہ اس کے کپڑے اور چیزیں گندی نہ ہو جائیں۔ اسی لیے اگر اس کی تختی پر کالی سیاہی کا ایک بھی قطرہ گر جاتا تو وہ فوراً پوری تختی کو دھونے کے لیے کھالے میں بہتے پانی کی طرف دوڑتا تھا۔ ابرار ڈھیلا ڈھالا سا تھا جس میں چستی نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ جمیل شرارت کر کے بھاگ جاتا تھا اور ابرار اپنی سستی کی وجہ سے استاد جی کے عتاب کا نشانہ بنتا تھا۔

ابرار کو جمیل کے حصے کی پٹائی کھانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا کیونکہ جمیل بدلے میں اسے اپنے گھر سے گڑ کی بنی میٹھی روٹی لا کر دیتا تھا جو ابرار کی پسندیدہ تھی۔ کمال نہ سست تھا، نہ شرارتی، اور نہ ہی صفائی کے معاملے میں جنونی۔ کمال بس کمال تھا! ایک عام سا بچہ جو پڑھائی میں تو اتنا تیز نہیں تھا لیکن محنتی تھا اور اسی محنت کی وجہ سے استاد جی کا پسندیدہ تھا۔

کیا ہوا اگر کمال کے حساب میں سو میں سے سو کی بجائے پچاس نمبر آتے تھے، وہ استاد جی کے کھیتوں کی گوڈی بہت اچھی کر دیتا تھا۔ انہی شرارتوں اور کھلکھلاتی ہنسیوں کے ساتھ وہ چاروں بھی بڑے ہو گئے۔ کمال دبئی جا پہنچا، جمیل نے پلمبرنگ کا کام شروع کر دیا، منیر نے پیرا میڈیکل کا کورس کر لیا تھا اور ابرار گاؤں سے باہر گائے بھینسوں کے چارے کے لیے ایک دکان کھول چکا تھا۔

چاروں اپنی اپنی جگہ زندگی کی چکی گھما رہے تھے اور مطمئن تھے۔ جب کبھی کمال نے پاکستان آنا ہوتا تو جمیل، منیر اور ابرار اسے ائرپورٹ پر لینے ضرور آتے تھے۔ ابھی وہ تینوں کمال سے فرداً فرداً بغل گیر ہو رہے تھے۔

"میرے ویر...! میرے جگر...!" کمال نے خوب بھینچ کر سب کو سینے سے لگایا تھا۔

"او تیری خیر....!! چھوڑ مینوں...!" کمال نے شرارت میں سنگل پسلی سے منیر کو زیادہ ہی زور

سے بھینچ لیا تھا۔ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا تو کمال نے ہنستے ہوئے بازووں کو ڈھیلا کر دیا۔ منیر فوراً اس کے بازوؤں کے حلقے سے باہر نکلا تھا: ”لگتا ہے ادھر دبئی میں بوہتے اونٹ شونٹ کھا کر آیا ہے“! !

منیر کی بات سن کر تینوں دوست قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔ یونہی ہنستے مسکراتے سب ابرار کی کھٹارا سی گاڑی میں بیٹھ گئے۔

”یار ابرار! وہی غزل لگاناں!“ ابرار ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا جبکہ کمال اس کی برابر کی سیٹ پر۔ منیر اور جمیل پیچھے کی نشستوں پر بیٹھے تھے جب منیر نے پیچھے سے ابرار کے کاندھے پر ہاتھ مارا۔

”ہاں یار، کوئی اچھا سا گیت لگاؤ، وہاں دبئی میں تو عربی گیتوں میں ’حبیبی حبیبی‘ جیسے الفاظ سن کر کان پک گئے تھے۔“

کمال نے ہنستے ہوئے کہا۔

”یہ کہہ کہ تجھے سمجھ ہی صرف ’حبیبی‘ آتا تھا..! حبیبی ہیاہیا...!“ جمیل نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تھا۔ پیچھے کی نشستوں پر بیٹھنے کا ایک فائدہ تھا، آگے کی سواریوں کے کندھوں پر آسانی سے ہاتھ مارا جا سکتا تھا۔ اس اثناء میں ابرار کیسٹ پلئیر پر گانا لگا چکا تھا۔

”اوئے ہوئے ہوئے...!“ منیر نے نعرہ لگایا تھا۔

”ہم تم ہوں گے بادل ہو گا..... رقص میں سارا جنگل ہو گا!“ چاروں دوستوں نے شور مچایا تھا۔

”آہا.... کیا سماں باندھا ہے استاد بڑے غلام علی نے..“ جمیل نے ہاتھ لہراتے اور سر لہرا کر ساتھ گنگناتے ہوئے غزل کی تعریف کی۔

”اوئے استاد بڑے غلام علی نے نہیں.. یہ گیت استاد چھوٹے غلام علی نے گایا ہے۔“ ابرار نے ٹوکا۔

”اوہو.. یارو.... یہ استاد چھوٹے غلام علی گایا ہو، یا کسی بڑے اور درمیانے غلام علی نے.... ہمیں تو آم کھانے ہیں گٹھلیوں سے کیا مطلب..؟“

کمال نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

گاڑی میں فل والیم میں گانا لگا ہوا تھا اور چاروں دوست اپنی مستی میں مگن، ابرار کی گاڑی میں

ساہیوال کی جانب رواں دواں تھے۔ گاڑی کے کھلے شیشوں سے آواز باہر تک جا رہی تھی۔

"استغفر اللہ....."!

سڑک کے کنارے ایک عمر رسیدہ بزرگ کے قریب سے ان کی گاڑی گزری تو انہوں نے گاڑی کی عقبی لائٹوں کو گھورتے ہوئے کہا تھا۔

....☆....

امان اللہ نے فون پر بہن کی سسکیاں سنیں تو وہ فوراً اصغر شاہ کی حویلی پہنچے۔ اصغر شاہ کے بڑے بھائی سفیان شاہ بھی پہنچ چکے تھے۔ ڈرائنگ روم میں ایک صوفے پر روتی ہوئی نگہت بیگم بیٹھی ہوئی تھیں، ان کے سامنے دوسرے صوفے پر سر جھکائے اصغر شاہ بیٹھے تھے، ان سے قدرے فاصلے پر امان اللہ بیٹھے ہوئے تھے جبکہ سفیان شاہ صوفوں کے درمیان کی خالی جگہ پر غصے سے دونوں ہاتھوں کو کمر کے پیچھے باندھے چل رہے تھے۔ دیوار کے ساتھ لگے کھڑے حیران پریشان سے رابعہ، عمر اور علی کبھی روتی ہوئی ماں کو دیکھتے، کبھی غصے میں بھرے ہوئے تایا جی کو، اور کبھی خاموش بیٹھے باپ کو۔

"میں دوبارہ تم سے پوچھ رہا ہوں، کیا یہ سچ ہے؟" دفعتاً سفیان شاہ بڑے بڑے قدم اٹھاتے ہوئے اصغر شاہ کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

"جی بھائی جان..!!" اصغر شاہ نے پہلی دفعہ سر اٹھا کر، ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا اور پھر کھڑے ہو گئے۔

"ایسے کس طرح تم کر سکتے ہو؟" سفیان شاہ کی آواز غصے سے بلند ہوئی۔

"ہم آرام سے بھی بات کر سکتے ہیں بھائی جان.... آپ تحمل سے..."

"کیا آرام سے بات کریں تم سے؟" سفیان شاہ چلائے تھے: "تم ہوش و حواس میں تو ہو؟ تمہیں پتا بھی ہے کہ تم نے کیا کر دیا ہے؟"

امان اللہ نے بچوں کو کمرے میں جانے کا اشارہ کیا تھا۔

"جی ہاں...! میں پورے ہوش و حواس میں ہوں اور مجھے بخوبی علم ہے کہ میں نے درست راستے کا

انتخاب کیا ہے۔اصغر شاہ نے سکون سے جواب دیا۔ان کا جواب سن کر نگہت بیگم کی سسکیاں بلند ہو گئیں۔

"یار!!"سفیان شاہ نے جھنجھلا کر اپنے ماتھے کو بائیں ہاتھ سے مسلا: "یہ کیا کر بیٹھے ہو تم...! تمہیں پتا ہے کہ وہ لوگ کافر ہیں اور تمہارا ان کی جماعت میں شامل ہونے کا کیا مطلب ہے، یہ بھی تم جانتے ہو؟"

"آپ کو کیسے پتا کہ وہ کافر ہیں؟ کیا آپ نے تحقیق کی ہے؟"اب اصغر شاہ کی آواز بھی کچھ بلند ہوئی:

"میں نے کی ہے! میں نے ان کے ساتھ نمازیں پڑھی ہیں، بات چیت کی ہے، سوال اٹھائے ہیں، تب کہیں جا کر میں نے یہ مذہب منتخب کیا ہے، آپ نے کیا کیا ہے جو آپ انہیں کافر کہہ رہے ہیں؟"

اصغر شاہ نے پہلی دفعہ 'مذہب' کا لفظ استعمال کیا تھا۔اس سے پہلے وہ اس جماعت کی الگ حیثیت کو مسلکی بنیاد کہتے تھے۔

"تو تم کہہ رہے ہو کہ ہم کافر ہیں؟"سفیان شاہ دوبارہ بپھرے تھے۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ جس طرح آپ اپنے آپ کو کافر نہیں سمجھتے، اسی طرح ہم بھی اپنے آپ کو کافر نہیں سمجھتے۔ جب ہم دونوں کا کلمہ ایک ہے، ارکینِ اسلام ایک ہیں، ان پر عمل کرنے کا طریقہ ایک ہے تو پھر ہم اور آپ الگ کیوں ہیں؟ ہم میں فرق کر کے ایک گروہ کو کافر اور دوسرے کو ہدایت یافتہ کیوں کہا جاتا ہے بھائی؟"

اصغر شاہ نے بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، جسے سفیان شاہ نے ایک جھٹکے سے ہاتھ مار کر اپنے کندھے سے ہٹا دیا۔

"ہم میں اور آپ لوگوں میں بہت فرق ہے اصغر صاحب!"امان اللہ اسے 'شاہ جی' کہتے کہتے رک گئے تھے:

"ہم میں اور آپ میں فرق یہ ہے کہ آپ اور آپ کی جماعت حضرت محمد ﷺ کو آخری نبی نہیں مانتی بلکہ اپنے مرزا کو نام نہاد نبی مانتی ہے۔"

"بالکل نہیں...!"اصغر شاہ نے ان کی بات کاٹی۔"ہمارا ختم نبوت پر بھی اتنا ہی کامل ایمان ہے جتنا آپ لوگوں کا ہے۔ ہم بس یہ کہتے ہیں کہ ہمارے حضرت کو ظلی نبوت ملی ہے، یعنی حضرت محمد ﷺ کے

وسیلہ و طفیل اور فیضان سے ملنے والی نبوت۔"

"جھوٹ! سب جھوٹ!!!" سفیان شاہ غصے سے بولے: "تم تو اتنے پڑھے لکھے تھے اصغر شاہ! تم کیسے بھٹک گئے؟ یہ نبوت اور ظِلی نبوت... یہ سب کیا ہے؟ نبوت بس وہی تھی جو حضرت محمد ﷺ پر ختم ہو چکی ہے۔ تم اور تمہارا نبی جتنے مرضی حیلے کر لے اور اپنے نفس کی خواہش کو اپنی طرف سے جو بھی نام دے دے، وہ کبھی بھی نبی نہیں کہلایا جا سکتا.... معاذ اللہ!!" سفیان شاہ نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"جب آپ آرام سے میری بات سننے پر تیار ہی نہیں ہیں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں، سوائے اس سے کہ اللہ سے آپ کے لیے ہدایت کی دعا مانگتا رہوں۔"

اصغر شاہ نے افسوس بھرے لہجے میں کہا اور دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئے۔

"لوگوں کو پتا چلا تو انہوں نے آپ کی جان کا دشمن بن جانا ہے۔" امان اللہ نے بھی بہن کے برابر میں بیٹھتے ہوئے اپنے بہنوئی سے کہا۔

"بن جائیں، مجھے فرق نہیں پڑتا۔" اصغر شاہ نے بے خوفی سے جواب دیا۔ نگہت بیگم اپنے آنسوؤں کو سنبھال چکی تھیں اور اب نم آنکھوں کے ساتھ خاموشی سے اپنے شوہر کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس شخص کے ساتھ انہوں نے اپنی جوان گزاری تھی اور اب ادھیڑ عمری میں زندگی میں یہ کیسا بھونچال آگیا تھا۔

"تم.... تم تو مرتد ہو گئے ہو اصغر!" سفیان شاہ نے دکھ اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں کہا تھا۔

"یہ آپ لوگ کہتے ہیں بھائی جان...! میرے نزدیک تو میں مسلمان ہوا ہوں۔" اصغر شاہ کے سکون میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

"حضرت محمد ﷺ کو آخری نبی نہ ماننے والا مسلمان ہو ہی نہیں سکتا۔" سفیان شاہ نے قطعی لہجے میں کہا۔

"اور میں حضرت محمد ﷺ کو آخری نبی مانتا ہوں۔ اب بولیں!" اصغر شاہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"تم حضرت محمد ﷺ کو آخری نبی بھی مانتے ہو اور پھر اپنے مرزا کو ظلی نبی بھی مانتے ہو! بہت خوب!" سفیان شاہ طنزیہ مسکرائے۔

"آپ کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آئیں گی بھائی جان...!" اصغر شاہ نے بات ختم کرنے والی انداز میں کہا۔

"آپ نے یہ فیصلہ کرنے سے پہلے کسی عالم سے بات کی تھی؟" امان اللہ نے سوال اٹھایا تو ایک لحظے کے لیے اصغر شاہ خاموش ہو گئے۔

"ہاں... بالکل۔! میں نے اس جماعت میں شامل ہونے سے پہلے ایک امام صاحب سے بات کرنے کی کوشش کی تھی اور محض سوال پوچھنے کی جرأت پر اس نے اسی وقت مجھے کفر کے نمائندہ تک قرار دے دیا تھا۔"

"بس...؟ صرف ایک سے بات کی؟" امان اللہ حیران ہوئے: "آپ نے جب اس اسکول کا آغاز کرنا تھا تو کتنے ہی لوگوں سے مشورہ کیا تھا، یاد ہے آپ کو؟ تعلیمی میدان کے ماہرین سے مشاورت کی تھی کہ اسکول کیسے چلایا جاتا ہے، اندازِ تدریس کیسا ہونا چاہئے وغیرہ..ا۔ور جب عقیدے پر بات آئی تو آپ نے بس ایک امام مسجد سے بات کر کے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا؟"

امان اللہ نے افسوس سے سر ہلایا تھا۔ اصغر شاہ بھی چونکے۔ یہ خیال ان کے ذہن میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ امان اللہ نے سچ کہا تھا، جب انہوں نے اسکول بنانے کا فیصلہ ہی کیا تھا تو بہت سے لوگوں سے مشاورت کی تھی، اور یہاں۔

"ابھی بھی دیر نہیں ہوئی...." ن کی خاموشی محسوس کر کے امان اللہ نے جلدی سے کہا تھا: "ابھی یہ بات ہمارے درمیان ہی ہے... ختمِ نبوت کے حوالے سے میں ایک ادارے کا جانتا ہوں جو اس سلسلے میں کام کر رہے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ ان کے ساتھ کچھ میٹنگز رکھ لیں، جس میں آ کے دل میں جو بھی شکوک ہیں، انہیں ڈسکس کر لیں۔" امان اللہ کو امید کی ایک کرن نظر آئی تھی کہ شاید اصغر شاہ اس طرح دوبارہ پلٹ آئیں۔

''لیکن مجھے تو کوئی شکوک نہیں ہیں اپنے دین کے حوالے سے۔'' اصغر شاہ نے کندھے اچکائے۔

''پلیز آپ امان بھائی کی بات مان لیں۔''

نگہت بیگم نے گلوگیر لہجے میں پہلی دفعہ اصغر شاہ کو کہا: ''اللہ آپ کو ہدایت کا راستہ دکھائے، ورنہ کل قیامت کے دن حضرت محمد ﷺ کو کیا منہ دکھائیں گے؟'' اصغر شاہ ان کی بات کے جواب میں کچھ کہنے ہی لگے تھے کہ کچھ سوچ کر خاموش ہو گئے، پھر امان اللہ سے کہا:

''ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں، تم ان لوگوں سے میری ملاقات کروا دو۔ لیکن میری ایک شرط ہے''!

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے اور تینوں نفوس کے چہروں کی طرف دیکھا۔ سفیان شاہ کے چہرے پر ان کے لیے غصہ تھا، امان اللہ کے چہرے پر امید اور نگہت بیگم کے چہرے پر یاس اور صدمہ۔ اصغر شاہ نے گہری سانس لی۔

''شرط یہ ہے کہ اگر انہوں نے مجھے قائل کر لیا تو میں یہ جماعت چھوڑ دوں گا لیکن اگر وہ مجھے قائل نہ کر سکے تو مجھے تنگ نہیں کیا جائے گا اور مجھے مرضی سے اپنی جماعت کے مذہب اسلام پر عمل کرنے کی اجازت دی جائے گی۔''

ان کی بات پر سفیان شاہ غصے سے کچھ کہنے ہی لگے تھے کہ امان اللہ نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود اصغر شاہ سے کہنے لگے،

''ٹھیک ہے، ہمیں یہ شرط منظور ہے۔''

....☆....

وہ لوگ گاؤں سے ایک گھنٹے کی مسافت پر تھے جب ایک زیرِ مرمت سڑک پر گاڑی کے اترتے ہی دو موٹر سائیکلیں اس کے آگے آ گئیں۔ مجبوراً ابرار کو گاڑی روکنا پڑی۔ سورج کو غروب ہوئے پون گھنٹہ ہو چکا تھا اور آسمان پر اندھیرا حاوی ہوتا جا رہا تھا۔

''اللہ خیر...!'' منیر کے لبوں سے نکلا تھا۔ چاروں چوکنا ہو کر بیٹھ گئے جب موٹر سائیکلوں سے چار

نقاب پوش پستول ہاتھ میں تھامے ان کی جانب بڑھے تھے۔ کمال کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنے قدموں کے پاس رکھے بیگ سے اپنا بٹوہ نکالا اور اسے سیٹ کے نیچے دھکیل دیا۔ اس بٹوے میں اس کی ساری جمع پونجی تھی، اس کے خواب تھے اور اس کا کل سرمایہ تھا جو اس نے دبئی میں محنت مزدوری کر کے جمع کیا تھا۔

"نکلو باہر...! میں نے کہا نکلو باہر...!" ایک نقاب پوش نے اس کی کھڑکی کی جانب آتے ہی چیختے ہوئے کہا تھا:

"کوئی ہوشیاری دکھانے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا..... نکلو.....!" ساتھ ہی اس نے جھٹکے سے کمال کی طرف کا دروازہ کھول دیا تھا۔ باقی نقاب پوشوں نے بھی گاڑی کے دروازے کھول لیے اور اب چاروں کو گھسیٹتے ہوئے باہر نکال رہے تھے۔

"بھائی.....رکو پلیز.....رک جاؤ....." ان چاروں نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن حملہ کرنے والے زیادہ مضبوط تھے اور ان کے پاس اسلحہ بھی تھا۔

"رقم کدھر ہے؟" دوسرے نقاب پوش نے منیر کی پسلیوں میں ٹھوکر ماری تھی۔ وہ درد سے بلبلا اٹھا۔

"کوئی رقم نہیں ہے.... ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔" جمیل نے بہت مشکل سے کہا تھا۔ اس کو ایک نقاب پوش نے زمین پر اوندھے منہ لٹا رکھا تھا۔

"بکواس کرتے ہو.....!" اس کے ساتھ ہی نقاب پوش نے اس کے سر پر زور سے پستول کا بٹ مارا تھا۔ وہ چکرا کر رہ گیا۔

"ائیرپورٹ سے آرہے ہو اور کچھ نہیں ہے تم لوگوں کے پاس.....! سیدھی طرح نکالو ورنہ ابھی کے ابھی اس کے سر میں گولیاں اتاروں گا... بولو.."!

ایک نقاب پوش نے ابرار کو کھڑا کرتے ہوئے عقب سے اس کے بالوں کو پکڑ کر سر کو پیچھے کی طرف کیا اور پستول کی ٹھنڈی نالی اس کی کنپٹی سے لگا دی۔ ایک لمحے میں جمیل کے سامنے ابرار کی پوری

زندگی ایک رِیل کی طرح گھوم گئی۔ یہ ابرار ہی تھا جس نے کمال کو دبئی جانے کے لیے پیسے دیے تھے اور یہ ابرار ہی تھا جس نے ہر مشکل وقت میں آگے بڑھ کر کمال کی سب سے زیادہ مدد کی تھی۔ اس کی شادی کو ابھی سال بھی پورا نہیں ہوا تھا اور بھابھی زیتون بیوہ ہونے جا رہی تھی۔ کمال لرز کر رہ گیا۔ اس کی کنپٹی پر بھی ایک نقاب پوش نے پستول رکھا ہوا تھا۔

"نن..... نہیں..... ! ٹھہرو..... !" کمال بے اختیار چلایا تھا:

"وہ سامنے سیٹ کے نیچے ایک بٹوہ ہے، ساری رقم اس میں ہے... وہ لے جاؤ لیکن میرے دوست کو کچھ نہ کہو۔"

اس کی بات سن کر نقاب پوش نے ابرار کو زور سے ایک جانب زمین پر دھکا دیا اور خود کمال کی بتائی ہوئی سیٹ کی جانب لپکا۔ کچھ ہی ثانیے بعد اسے بٹوہ مل گیا تھا۔ اس نے اسے کھول کر دیکھا۔

"اوئے شاباش..... ! اتنا مال ہے اور کہہ رہے تھے کہ کچھ نہیں ہے، چل نکلو اب..... !" اس نقاب پوش نے خوشی سے کہا اور بٹوہ اپنی شلوار کے اندر بنی جیب میں اڑس کر موٹر سائیکل کی طرف بھاگ گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے نقاب پوشوں نے بھی ان تینوں کو ایک ایک مکا رسید کرنے کے بعد موٹر سائیکل کی طرف دوڑ لگا دی اور ان پر سوار ہو کر آناً فاناً یہ جا وہ جا!

چاروں دوست خوف اور صدمے کی حالت میں اپنی اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئے تھے۔ آخر کار جمیل نے ہمت کی اور اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے سر سے خون کے کچھ قطرے نکل کر اس کی قمیض پر گر رہے تھے۔ ابرار تیزی سے کمال کی طرف آیا۔

"یہ تُو نے کیا کیا کمال.... ؟ تُو نے انہیں کیوں اپنے بٹوے کا بتایا.... ؟ تیری پورے سال کی کمائی تھی اس میں...."!

کمال نے خالی خولی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔ چپ چاپ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے قمیض جھاڑی تھی۔ تب تک منیر بھی اپنی پسلیوں پر ہاتھ رکھے کراہتا ہوا ان کی طرف آ گیا۔ تکلیف کی شدت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ نقاب پوش کی ٹھوکر سے شاید اس کی کچھ پسلیاں

ٹوٹ گئی تھیں۔اس نے اپنا دوسرا ہاتھ کمال کے کندھے پر رکھ دیا تھا جس کی آنکھیں غم کی شدت سے سرخ ہو رہی تھیں۔

’’چلو، گاؤں چلیں.....‘‘

ابرار نے تھکے تھکے انداز میں کہا اور گاڑی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ کمال کے سارے خواب اُدھڑ کر وہیں زیرِ مرمت ٹوٹی سڑک پر بکھر گئے تھے۔چاچی بشیراں اور بابا اسحاق، دونوں کے گھروں پر جیسے مصیبت ٹوٹ پڑی تھی۔ کمال کی اتنے برسوں کی کمائی کا لٹ جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

’’ہائے میں لٹ گئی....! میں برباد ہو گئی....! میرے پتر کی کمائی لٹ کے لے گئے جے!‘‘ چاچی بشیراں سینے پر دوہتڑ مارتے ہوئے دہائیاں دے رہی تھی۔

’’حوصلہ کر بشیراں....!!‘‘اماں نے چاچی بشیراں کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

’’ہائے کیسے حوصلہ کروں؟ بیڑا ڈب جائے اونہاں دا! اونہاں دے ہاتھ ٹوٹ جان...!! ہائے میرے پتر دی کمائی لُٹ گئے‘‘!

ارد گرد کچھ اور خواتین بھی جمع تھیں۔ کمال کے واپس آنے کی خوشی غم میں بدل گئی تھی۔

’’بڑا ہی بُرا ہوا.....!‘‘ایک عورت نے دوسری کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

’’سنا ہے نوکری سے بھی کمپنی والوں نے فارغ کر دیا تھا....اب تو نوکری وی گئی تے پیسہ وی!‘‘ دوسری نے جوابی سرگوشی کی تھی۔

قصبے کے تھانے میں کمال اپنے دوستوں اور بابا اسحاق کے ساتھ تھانیدار کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

’’باؤ جی! پہلی بات تو یہ آپ کس چڑی دماغ والے نے کہا تھا کہ پیسہ جیب میں ڈال کے نکلو؟‘‘

تھانیدار نے دائیں مونچھ کو تاؤ دیتے ہوئے کہا:’’بینک اسی کام کے لیے ہوتے نیں.....تے دوسرا... جس جگہ یہ واردات ہوئی ہے، وہ ساڈا علاقہ نہیں اے! جہاں واردات ہوئی اے، اُدھر کے تھانے جاؤناں...تے تیسری بات.....!‘‘ تھانیدار نے اب بائیں مونچھ کو تاؤ دیا تھا:

’’پیسہ تو آنی جانی شے اے، ہاتھ کا میل ہے جی! شکر کرو کہ جان بچ گئی...! میں تو کہتا ہوں کہ تسی گھر

جاؤ، ان چوٹوں کی کوئی سکائی وائی، مالش کرو، جان بناؤ، پیسہ پھر بن جائے گا..... کیوں حمیدے؟'' تھانے دار نے مفت مشوروں سے انہیں نواز کر داد طلب نگاہوں سے سپاہی کی طرف دیکھا تھا۔

''جی صاحب....!'' سپاہی نے ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

کمال اور اس کے دوست بابا اسحاق کے ساتھ وہاں سے مایوس لوٹ آئے تھے۔

....☆....

''عمر...!'' عمر سکول کی راہداری سے گزر رہا تھا جب بلال نے اسے آواز دی لیکن وہ ان سنی کرتا ہوا چلتا رہا۔ بلال کندھے پر جھولتے اسکول بیگ کو سنبھال کر بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔

''رکو تو.....! کیا ہوا گیا ہے؟'' اس نے عمر کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''کچھ نہیں.....'' عمر نے قدموں کو تیز کیا لیکن بلال نے اس کے کندھے پر اپنی گرفت مظبوط کر لی۔ مجبوراً عمر کو رکنا پڑا لیکن اس نے اپنا چہرہ دوسری جانب موڑ لیا تاکہ بلال اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔

''بتاؤ ناں، کیا ہوا ہے؟ مجھ سے ناراض ہو کیا؟ '

بلال تشویش بھرے لہجے میں پوچھتا ہوا اس کے چہرے کے عین سامنے کھڑا ہو گیا۔ ارد گرد کچھ بچے اپنی کلاس روم کی جانب جا رہے تھے تاکہ اسکول بیگ کو کلاس میں رکھ کر اسمبلی گراؤنڈ میں پہنچ سکیں۔

''یار عمر.... میرے دوست''!

عمر نے آنکھیں اٹھا کر بلال کی جانب دیکھا تو بلال دھک سے رہ گیا۔ وہ سرخ ہو رہی تھیں، جیسے عمر آنسوؤں کو آنکھوں میں اترنے سے روک رہا ہو۔

''کیا ہوا تمہیں؟؟ مجھے تو بتاؤ یار!!'' جواب میں عمر نے فوراً اپنی آنکھوں کو رگڑ کر صاف کیا، پھر چہرے کے تاثرات کو نارمل کرتے ہوئے بلال سے بولا:

''کچھ نہیں۔''

''جھوٹ مت بولو...!'' بلال نے تھوڑی خفگی سے کہا تھا:

''اگر کچھ نہیں ہوا تو پھر یہ چہرہ کیوں اترا ہوا ہے اور آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں۔ تم... تم رو رہے

تھے کیا...؟"

"بکواس نہ کرو!" عمر نے بلال کو اپنے سامنے سے ہٹانا چاہا تھا۔

"اسمبلی کی گھنٹی بج چکی ہے اور آپ دونوں ابھی تک یہیں کھڑے ہیں؟ جلدی سے اسکول بیگ کلاس میں رکھ کر گراؤنڈ میں پہنچیں"!

بلال کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سر سلجوق نے ڈپٹ کر انہیں کہا تھا۔

"سوری سر..."!

دونوں نے جلدی سے قدم اپنے کمرہ جماعت کی جناب بڑھا دیے لیکن چلتے ہوئے بھی عمر اپنے چہرے پر بلال کی گڑی ہوئی نظروں کو محسوس کر رہا تھا۔

"اسکول کے بعد میں تمہارے گھر آجاؤں؟ ایک ضروری بات کرنی ہے۔" بالآخر عمر نے کہہ ہی دیا تھا۔

"ہاں ہاں، ضرور..."!!

بلال نے جواب دیا اور دونوں سکول بیگ کو اپنی نشستوں پر رکھ کر گراؤنڈ کی جانب چل دیے جہاں اسمبلی کے لیے ہر جماعت کی قطار بن رہی تھی۔ چھٹی کے بعد دونوں گراؤنڈ میں ایسی جگہ بیٹھ گئے جہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اب وہ صبح والی بات کرنے لگے تھے۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم...؟" حیرت سے بلال کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ عمر اس وقت اس کے کمرے میں قالین پر سر جھکا کر بیٹھا ہوا تھا اور اپنی نظریں مسلسل اپنے ہاتھوں پر جمائے، اضطرابی حالت میں انہیں رگڑ رہا تھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں بلال...!!" اس کی نظریں ہاتھوں پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

"لل... لیکن .... یہ سب ہوا کیسے...؟ میرا مطلب ہے اصغر انکل....اوہ...!" کہتے کہتے بلال اچانک چونکا:

" جو کچھ تم کہہ رہے ہو، وہ سچ ہے تو پھر مجھے سو فیصد یقین ہے کہ یہ سب منگلا کا کیا دھرا ہے۔

''یہ سب سچ ہے اور ہاں.... اس سب کے پیچھے وہی ہے...'' یہ کہتے ہوئے عمر کی آنکھ سے آنسو نکلااور خاموشی سے اس کے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر گر گیا۔ عمر نے آہستگی سے دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے اسے صاف کیا۔

''اوہ....'' بلال کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا: ''مجھے پہلے ہی اس پر شک تھا۔ جب میں نے اصغر انکل اور منگلا کی باتیں سنی تھیں''!

اس کی بات سن کر عمر نے سر اٹھا کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا مطلب؟'' جواب میں بلال نے اسے ساری تفصیل بتادی، جب وہ عمر کے گھر کے آنگن میں بیٹھا ناول پڑھ رہا تھا جب دیوار کی دوسری جانب سے اس کے کانوں میں اصغر شاہ اور منگلا کی باتوں کی آواز آئی تھی۔

''تم نے مجھے اسی وقت کیوں نہیں بتایا؟'' عمر نے دکھ اور افسوس سے کہا۔

''میں گھبرا گیا تھا عمر...!'' بلال نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ''اور اس وقت خود میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیسی گفتگو ہے اور کس موضوع پر ہے۔ لیکن میں نے ابا جان کو ضرور بتایا تھا۔ انہوں نے منگلا سے پوچھا تو وہ مکر گیا تھا کہ ایسی کوئی بات ہے۔ ' '

''جھوٹا..! مکار... اور فریبی....!!'' غصے سے عمر نے اپنے دائیں ہاتھ کو قالین پر مارا تھا: ''وہ اور سر نبیل، دونوں کل سے غائب ہیں۔ ہمارے گھر میں آگ لگا کر دونوں بھاگ گئے ہیں۔''

''اوہ، اسی لیے دونوں سکول نہیں آئے تھے آج!'' بلال نے کہا۔

''اماں ماموں امی جان اور ہم تینوں کو اپنے گھر لے گئے ہیں۔ جب تک یہ معاملہ صاف نہیں ہو جاتا، امی جان نے کہا ہے کہ وہ واپس نہیں آئیں گی۔''

''اور اصغر انکل...؟ وہ کیا کہتے ہیں؟ ' '

''پریشان ہیں...'' بلال نے گہرا سانس لیا، پھر سر جھکاتے ہوئے طنزیہ انداز میں مسکرایا: ''لیکن اتنے بھی نہیں کہ ہماری خاطر وہ اس فتنے کو چھوڑ دیں۔''

''اوہ....'' بلال نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا اور خود بھی سر جھکا لیا۔ کچھ لمحے اسی خاموشی میں گزر گئے۔

''اب کیا ہو گا...؟'' آخر بلال نے سر اٹھایا۔

''ماموں نے کہا ہے کہ کچھ علماء کے ساتھ ابو بات چیت کریں۔ شاید وہ علماء کرام ابو جان کو قائل کر لیں۔'' عمر نے انگلی سے قالین کو کھرچا۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو...'' بلال نے کہا تھا۔

''اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو ابو جان نے کہا ہے کہ وہ کبھی بھی یہ مذہب.... نہیں چھوڑیں۔''

اس سے آگے عمر سسک اٹھا تھا۔ بلال نے آگے جھک کر عمر کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

....☆....

ابھی اس آفت سے کمال اور منال کے گھر والے سنبھلے نہیں تھے کہ ایک اور آفت آن پڑی۔ صبح فجر ویلے کسی نے زور سے دروازہ بجایا تھا۔

''اللہ خیر...!'' آواز سن کر بابا اسحاق کی آنکھ کھل گئی تھی۔

''کون اے...؟'' انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں پو پھوٹنے کے آثار پھیل رہے تھے۔ اتنے تڑکے کون آسکتا ہے؟

''ابا، میں ہوں، امداد!!'' جواب سنتے ہی بابا اسحاق نے جلدی سے چپل پاؤں میں اڑسی اور تیز قدموں سے تقریباً بھاگتے ہوئے دروازے کی طرف گئے۔

''امداد.....!'' اماں بھی جاگ گئی تھیں اور ابا کے پیچھے پیچھے جا رہی تھیں۔ تب تک ابا دروازے کا کنڈا گرا چکے تھے۔ ایک ہاتھ میں سفری بیگ پکڑے امداد اندر داخل ہوا تھا۔

''ہائے میں مر گئی...!'' اماں کی نظر اس کے پلستر لگے دوسرے بازو پر پڑی تھی جسے گردن سے گھما کر آنے والے ایک پٹے نے سہارا دیا ہوا تھا:

'' امداد......!!'' اماں دل تھام کر رہ گئیں۔

''اسے اندر تو آنے دے۔'' بابا اسحاق بھی اپنی پہلوٹھی کی اولاد کا یہ حال دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے

لیکن انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔اماں ماں تھیں،اس لیے سنبھال نہ سکیں اور وہیں امداد کے سر کو چومتے ہوئے رونے لگ گئیں۔

''میں ٹھیک ہوں اماں....''امداد نے اپنے آپ کو اماں سے چھڑوا کر اندر جانا چاہا تھا۔تب تک منال بھی جاگ کر باہر آچکی تھی۔اس نے بڑے بھائی کی حالت دیکھی وہ بھی گھبرا کر جلدی سے آگے بڑھی تھی۔

''اپنی ماں کو سنبھال دھیے! صبح سویرے بین ڈال کر بیٹھ گئی اے!''ابا نے منال کو کہا اور امداد سے بیگ پکڑتے ہوئے اسے اندر کمرے میں لے گئے۔منال بھی اماں کو بازو سے سہارا دے کر کمرے میں لے آئی تھی۔

پانی وغیرہ پینے کے بعد امداد نے جو احوال سنایا تھا،اس کا لبِ لباب یہ تھا کہ کراچی کی ایک فیکٹری میں اسے کام مل گیا تھا لیکن ایک دن فیکٹری سے واپسی پر دو مشٹنڈوں نے اسے روک کر بلاوجہ پٹائی شروع کر دی تھی۔بازو کی ہڈی بھی اسی پٹائی میں ٹوٹی تھی۔ٹوٹی ہڈی کے ساتھ وہ فیکٹری میں کام نہیں کر سکتا تھا اور فیکٹری کا کام ایک اس کی وجہ سے تاخیر کا شکار نہیں ہو سکتا تھا۔اس لیے فیکٹری والوں نے اسے فارغ کر دیا تھا۔جب کمائی کا کوئی زریعہ نہ رہا تو لیاقت نے بھی اس کے اوپر سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا۔جب روٹی کے لالے پڑے تو امداد کو یہی ایک حل نظر آیا کہ واپس گاؤں ہی چلا جائے۔

''کیڑے پڑیں ان مشٹنڈوں کے پیٹ میں...!!''اماں نے بے ساختہ بد دعا دی تھی۔'تو گل سن میری! تُو نے بہت چنگا کیا کہ تُو واپس آگیا۔آرام سے ادھر ای رہ ہن....کوئی ضرورت نئیں اے انی دور جان دی۔''اماں مامتا کی نظر سے صورت حال کو دیکھ رہی تھیں۔

''کوئی روٹی پانی دے دو...بڑی بھوک لگی اے۔''امداد نے اماں کی بلاؤں سے کچھ بے زار ہو کر منال کو کہا تھا۔

''ہاں ہاں،میں بناتی ہوں۔''منال جلدی سے اٹھ کر باورچی خانے چلی گئی تھی۔

....☆....

میاں عبدالکریم صاحب کے لیے یہ اطلاع کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔

''یہ کیسے ہو گیا بیٹے...؟''

''منگلا..... !'' بلال نے ریسیور میں آہستگی سے کہا تا کہ امی جان تک آواز نہ پہنچے۔ وہ بہت آہستہ آواز میں فون پر عبدالکریم صاحب سے بات کر رہا تھا۔

''اناللہ وانا الیہ رجعون....'' انہوں نے بے اختیار کہا۔ ان کے لہجے میں بے حد دکھ تھا:

''ایمان دشمن میرے دیرینہ دوست کے ایمان میں نقب لگا رہا تھا اور میں لاعلم رہا۔'' انہوں نے تاسف سے کہا۔ بلال سر ہلا کر رہ گیا۔

گھر والوں سے بات کرنے کے بعد عبدالکریم صاحب نے اصغر شاہ کو فون ملایا تھا۔

''تو تم تک بھی اطلاع پہنچ گئی...؟'' اصغر شاہ نے دعا سلام کے بعد ہنستے ہوئے پوچھا۔ عبدالکریم صاحب کو ان کا انداز محسوس کر کے بہت افسوس ہوا۔

''ہاں، بلال نے بتایا ہے.... تم نے مجھ سے کیوں نہیں بات کی اصغر...؟ مجھ سے ذکر تک نہیں کیا۔ زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ ایس خاموشی سے کر لیا''!

عبدالکریم صاحب نے شکوہ کیا۔

''بڑے کام خاموشی سے ہی کیے جاتے ہیں میاں صاحب!'' اصغر شاہ کے لہجے میں اطمیان تھا۔

''ہر کام خاموشی سے کرنے والا نہیں ہوتا۔ کم از کم یہ کام تو نہیں جس پر بندہ ایمان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے''!

عبدالکریم صاحب کی اس بات سے اصغر شاہ چڑ سے گئے۔

''کیا ہو گیا ہے بھئی؟ میرے ایسا کرنے سے کوئی قیامت آگئی ہے کیا... سبھی میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں.. کوئی میری بات بھی تو سن لے... یار تم تو مجھے سمجھنے کی کوشش کرو!'' آخری جملہ اصغر شاہ نے ملتجائی انداز میں کہا تھا۔ عبدالکریم صاحب کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔

''مجھے بتاؤ، کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''یار! تمھیں لگتا ہے کہ مجھ جیسا بندہ بغیر کسی دلیل کے اتنی بڑی بات مان لے گا... تم بتاؤ۔''

''نہیں، مجھے ایسا نہیں لگتا، لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ منگلا نے تمھیں کیا دلائل دیے تھے جو تم اس جماعت کی طرف راغب ہو گئے؟''

عبدالکریم صاحب نے نرمی سے کہا تھا۔

''اس نے مجھے قرآن اور احادیث سے ثبوت دکھائے تھے کہ حضرت عیسیٰ انتقال کر چکے ہیں اور مرزا صاحب ہی وہ مسیح ہیں جن کے آنے کی احادیث میں بشارت دی گئی تھی۔امام مہدی بھی وہی ہیں۔''

''اور نبی بھی...؟'' میاں عبدالکریم نے پوچھا۔

''ہوں... کہہ سکتے ہو،'' اصغر شاہ کے لہجے میں جوش تھا۔انہیں کوئی تو میسر آیا تھا جو تحمل سے ان کا موقف سن رہا تھا:

''لیکن خاتم النبی تو حضرت محمد ﷺ ہی ہیں، ہمارے حضرت تو بس ظلی نبی ہیں.......... جو حضرت محمد ﷺ کی ہی شریعت کو مزید کھل کر بیان کرنے کے لیے تشریف لائے تھے۔''

''لاحول ولا قوۃ...!'' عبدالکریم صاحب نے بے ساختہ دل میں کہا، لیکن اصغر شاہ کی بات میں مداخلت نہیں کی۔

''میں ان کے مربیوں سے ملا تھا، ان کے مرکز ربوہ میں جا کر سب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا تھا، تم یقین نہیں کرو گے لیکن میں سچ کہہ رہا ہوں، جتنا منظم ان کا تبلیغِ اسلام کا طریقہ کار ہے، ویسا کسی کا نہیں ہے۔وہ تو اسلام کی ترویج میں دن رات لگے ہوئے ہیں اور ہم لوگوں نے انہیں ہی کافر قرار دے کر انہیں کونے سے لگایا ہوا ہے''!

اصغر شاہ بولے جا رہے تھے اور عبدالکریم صاحب خاموشی سے سن رہے تھے: ''ان کا جذبہ ایمانی، ان کا اراکینِ اسلام سے لگاؤ، ان کی قرآن سے عقیدت... یہ سب میں دیکھ چکا ہوں، اور جب میرے دل نے اس مذہب کی حقانیت کو قبول کر لیا تو میں کیوں نہ اس مذہب کو اختیار کر لیتا؟''

''مذہب....؟ یعنی آپ قبول کر رہے ہیں کہ آپ کا مذہب ہم سے الگ ہے۔'' عبدالکریم صاحب

نے بات پکڑی تو اصغر شاہ گڑ بڑا گئے۔

''نہیں.... میں مذہبب کو مسلک ہی سمجھتا ہوں۔ مذہب کہہ لین یا مسلک، میرے نزدیک ایک ہی بات ہے۔''

''صحیح.....''عبدالکریم صاحب نے مختصر جواب دیا۔

''مجھے معلوم ہے آپ بھی دوسرے لوگوں کی طرح مجھے ہی غلط سمجھ رہے ہیں.... لیکن....''

اصغر شاہ بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گئے، جیسے تذبذب میں ہوں کہ انہیں یہ بات بتانی چاہیے یا نہیں۔

''لیکن کیا شاہ جی...؟''ان کے پوچھنے پر اصغر شاہ نے گہرا سانس لیا اور تھکے ہوئے انداز میں کہنے لگے،

''آپ وہ واحد فرد ہیں جو میری بات آرام سے سن رہے ہیں۔آپ خود سوچیں، کیا اتنا بڑا فیصلہ، جس میں مجھے اپنے خاندان اور پورے معاشرے کی طرف سے شدید مخالفت واضح نظر آ رہی ہو، کیا میں نے یونہی کر لیا ہوگا؟''

''نہیں...''!

''مجھے ہمارے حضرت نظر آئے تھے خواب میں....''اصغر شاہ نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا تو عبدالکریم صاحب چونکے۔

''کیا مطلب؟''

''جب میں پہلی دفعہ ربوہ گیا تھا، اس جماعت میں شامل ہونے سے پہلے، تو وہاں رات کو جب میں کمرے میں سونے کے لیے لیٹا ہوا تھا تو مجھے ایک خواب آیا تھا۔''اصغر شاہ یوں بول رہے تھے جیسے ابھی بھی وہ خواب انہیں نظر آ رہا ہو:

''میں گھپ اندھیری وادی میں تھا، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا اور میں بس ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھ رہا تھا اور اونچی آواز میں مدد کے لیے پکار رہا تھا کہ کوئی ہے جو میری مدد کرے...اور پھر

اچانک کچھ دور روشنی کا ایک گولہ سا نمودار ہوا۔اس روشنی نے مجھے اس قابل کر دیا کہ میں اپنے ارد گرد کا ماحول دیکھ سکوں اور میں وہ دیکھ کر خوف سے تھرا گیا تھا۔“

اصغر شاہ نے جھر جھری سی لی۔ عبدالکریم صاحب توجہ سے ان کی بات سن رہے تھے:

”میرے دونوں جانب گہری کھائیاں تھیں اور میں ایک پتلی سی پگڈنڈی پر کھڑا ہوا تھا۔اگر روشنی کا وہ گولہ نمودار نہ ہوتا تو میں یقیناً ان میں سے کسی کھائی میں گر جاتا۔ پھر میں نے اس روشنی کی طرف چلنا شروع کر دیا....اور جیسے جیسے میں اس روشنی کے قریب ہوتا جارہا تھا،میرا خوف دور ہوتا جارہا تھا۔“

اصغر شاہ کے لہجے میں عبدالکریم صاحب نے خوشی کو اترتا محسوس کیا۔”اور جب میں اس روشنی کے بالکل پاس پہنچا تو اس روشنی کے عین درمیان میں ایک شخص کھڑا تھا جس کے خدوخال میرے لیے ابھی واضح نہیں تھے۔وہ شخص میری طرف دیکھ کر مسکرایا تھا میاں صاحب...!!اس کے اور میرے درمیان بس تین قدم کا فاصلہ تھا اور جب میں نے یہ تین قدم کا فاصلہ طے کیا تو وہ۔وہ ہمارے حضرت مرزا تھے“!!!

اصغر شاہ کی خوشی اور جذبات کے مارے آواز بھرا گئی۔ عبدالکریم صاحب اپنے ہونٹ بھینچے ان کی بات سن رہے تھے:

”حضرت مرزا نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی جانب کھینچا اور مجھے اپنے سینے سے لگا لیا میاں صاحب...!اور اس لمحے غیب سے مجھے آواز آئی کہ یہی وہ ہین جن کا اللہ نے وعدہ کیا تھا،اور یہی ہیں جنہیں اللہ نے حضرت محمد ﷺ کا نائب اور ظلی نبی بنایا ہے۔ پس ان کی پیروی کرو تاکہ تم نجات پا جاؤ...میاں صاحب...“!

اصغر شاہ نے جذبات سے بوجھل آواز میں انہیں مخاطب کیا:”اس کے فوراً بعد میری آنکھ کھل گئی تھی۔میں پسینے میں شرابور تھا لیکن ایک راحت کا احساس تھا جو میرے اندر موجود تھا،اور تب میں ایمان لے آیا تھا کہ یہی مذہب حق ہے۔“اصغر شاہ خاموش ہو گئے۔کچھ ثانیے اسی خاموشی میں گزر گئے۔

”کچھ کہیں میاں صاحب....“!!

ان کی خاموشی کو محسوس کر کے اصغر شاہ نے پوچھا۔ وہ اس خواب کے بارے میں عبدالکریم صاحب کا ردِ عمل جاننا چاہ رہے تھے۔

''اب کچھ کہنے کو بچا ہی کیا ہے...''

عبدالکریم صاحب نے دل میں انہیں کہا تھا: ''اس خواب کے بارے میں میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ جو انسان سوچتا ہے یا چاہتا ہے، وہی اسے بعض اوقات خواب میں نظر آتا ہے۔ آپ اس جماعت سے غالباً مرعوب ہو گئے تھے اور عقلی طور پر اس جماعت کو سچا مان چکے تھے، بس ایک آخری تسلی درکار تھی آپ کو... جو آپ کے نفس سے اس خواب کی صورت میں آپ کو دے دی۔''

''یعنی آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ خواب اللہ کی طرف سے نہیں تھا بلکہ میرے لاشعور نے خود ہی گھڑا تھا۔'' اصغر شاہ نے ناگواریت سے کہا۔ عبدالکریم صاحب کی خاموش سے انہیں لگا تھا کہ شاید ان کی باتوں سے متاثر ہو کر میاں صاحب بھی اس جماعت میں دلچسپی لینا شروع ہو رہے ہیں۔

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا شاہ جی... بہتر یہی ہے کہ آپ علماء کرام سے بات کریں۔ ان شاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' انہوں نے جواب دیا تھا۔

''میرے لیے ابھی بھی سب ٹھیک ہے، بس آپ لوگوں کو ہی ٹھیک نہیں لگ رہا۔'' یہ کہہ کر اصغر شاہ نے بدمزہ ہو کر فون بند کر دیا۔

....☆....

بابااسحاق بڑے بیٹے امداد کے ساتھ کہیں گیا ہوا تھا، جاوید بھی صبح سے غائب تھااور اماں چاچی بشیراں کی طرف گئی ہوئی تھی۔ گھر میں منال اکیلی تھی جب کسی نے دروازے کا کنڈا کھڑکایا۔

''کون ہے؟''تار پر دھلے ہوئے کپڑے پھیلاتی منال نے پوچھا تھا۔

''میں ہوں منال...'' کمال کی آواز آئی تھی۔ منال نے چونک کر کپڑوں والی بالٹی نیچے رکھی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''اماں گھر پر نہیں ہیں....'' منال نے لکڑی کے دروازے کی باریک سی درز سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ وہاں سے اسے کمال کے صرف بھورے رنگ کے کپڑے ہی نظر آئے۔البتہ کمال کے مخصوص پرفیوم کی خوشبو ہوا کے دوش پر اڑ کر ضرور اس تک پہنچ گئی تھی۔

''مجھے معلوم ہے، وہ ہماری طرف ہیں۔ تبھی تو میں اِدھر آگیا ہوں..... سنو، مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔''کمال نے کہا تھا۔

''لیکن.....گھر پر کوئی نہیں ہے۔''منال دروازہ کھولنے سے ہچکچائی تھی۔

''میں تمہیں کھانے نہیں آیا منال.....! مجھ پر بھروسہ نہیں ہے تمہیں؟'' کمال اس کی ہچکچاہٹ سے چڑ گیا تھا۔اس کا لہجہ محسوس کرکے منال کچھ لمحے تو تذبذب کا شکار رہی، پھر آہستگی سے اس نے کنڈا نیچے

گرادیا۔ دروازہ کھل گیا تھا۔ منال نے ایک نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ وہاں بھورے رنگ کی قمیض شلوار میں بکھرا ہوا سا کمال کھڑا تھا جس کے چہرے پر دکھ کی اذیت بہت نمایاں تھی۔

''جی....؟'' منال نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹاتے ہوئے پوچھا۔ وہ اب اس کے پاؤں کو گھور رہی تھی جو کالے رنگ کی چپل میں اڑسے ہوئے تھے۔

''تمہیں.... سب پتا ہے ناں؟ کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

کمال نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ منال نے اس کے پاؤں کو گھورتے ہوئے بس اثبات میں سر ہلادیا۔

''تو تم نے مجھ سے بات کیوں نہیں کی...؟ میں منتظر تھا کہ تم بھی اماں کے ساتھ میرے گھر آؤ گی۔ میں انتظار ہی کرتا رہا منال۔''

کمال کے لہجے میں موجود شکوے کی کرچیاں جیسے منال کے جسم میں گھس رہی تھیں۔

''میں.... میں نے آنا تھا..... بس پتا نہیں کیوں نہیں آسکی۔'' منال نے اس کے پاؤں سے اپنی نظریں نہیں ہٹائی تھیں۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ خود اپنے، الوینہ اور رستم کے مسئلے میں ذہنی طور پر اتنی الجھی ہوئی تھی کہ اسے کچھ اور سوچنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ جب الوینہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ معاملہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے تو منال نے سکھ کا سانس لیا تھا، لیکن گاؤں آنے پر جب اس نے رستم کی طرف سے بھیجا گیا سامان دیکھا تو وہ دوبارہ پریشان ہو گئی تھی اور اپنی اس پریشانی کو وہ کمال کے ساتھ کس طرح بانٹ سکتی تھی؟

''مجھے معلوم ہے تم کیوں نہیں آئی...'' کمال نے یقین بھرے لہجے میں کہا:

''کیونکہ تم آنا ہی نہیں چاہتی۔'' اس کی بات سن کر منال نے بھنویں سکیڑ کر حیرت سے کمال کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر کرب، دکھ، بدگمانی، ٹھکرائے جانے کا احساس، اور نہ جانے کیا کیا تھا۔

''کیا......؟''

''ہاں منال.... سچ یہ ہے کہ تم آنا ہی نہیں چاہتی۔ نہ میرے گھر اور نہ میری زندگی میں...''!

کمال کے جملے سن کر منال کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا ہو۔

''کمال.....! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ مجھ جیسے کنگلے کی زندگی میں آکر تم نے آخر کرنا بھی کیا ہے! جس کے پاس ایک بوسیدہ سا گھر ہے اور جس کے پاس تمہیں عالی شان زندگی دینے کو کچھ بھی نہیں ہے...! میں تمہارا کوئی بھی خواب پورا نہیں کر سکتا۔ نہ تمہیں بڑی سی گاڑی میں گھما سکتا ہوں۔ نہ تمہیں مہنگے سے مہنگا تحفہ دے سکتا ہوں۔ میرے پاس تو کچھ بھی ایسا نہیں ہے جس کی ایک لڑکی کو چاہت ہوتی ہے۔''

منال دھواں دھواں ہوتے کانوں کے ساتھ یک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی بات سن رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کمال کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے خاموش کر دے..... یا اس کی بات کو کاٹ کر چلا کر کہے کہ نہیں..... ایسا کچھ بھی نہیں ہے.... میں عام لڑکی نہیں ہوں جسے دولت سے غرض ہوتی ہے... مجھے اس وقت اپنے سامنے کھڑے اس بندے سے غرض ہے جس کے دل میں میری محبت کا بیج پھوٹا تھا۔ لیکن وہ کہہ نہ سکی، وہ کچھ بھی کہہ نہ سکی۔

''میں تمہارے قابل نہیں رہا اب منال.... ایک ماسٹرز پاس لڑکی ایک مکینک کے ساتھ کیسے گزارا کر سکتی ہے؟ میں نے بہت چاہا تھا کہ تمہیں حاصل کر سکوں، بلکہ میں نے زندگی میں اک تمہیں ہی تو چاہا تھا، لیکن چاہت مل بھی جائے، یہ ضروری تھوڑی ہے۔''

کمال تلخی سے ہنسا تھا لیکن اس تلخی میں کرب نمایاں تھا۔ منال کو اس کی آنکھوں میں نمی اترتی صاف دکھائی دی تھی۔

''تم سمجھو گی کہ میں جذباتی ہوں.... نہیں منال! میں پہلے جذباتی تھا لیکن اب نہیں ہوں۔ اب حقیقت پسند بن گیا ہوں اور میرا خیال ہے کہ تم بھی حقیقت پسند بن کر سوچ رہی ہو کہ میرے ساتھ تمہارا گزارا نہایت مشکل ہو گا.... شاید ناممکن ہی ہو۔''

''یہ تمہارا خیال ہے کمال.... حقیقت نہیں ہے۔ میں ایسا کچھ نہیں سوچ رہی۔ اپنے خیال پر اتنا اندھا یقین مت کرو پلیز...'' منال کے دل پر آنسو گر رہے تھے لیکن اس کے لبوں پر جیسے قفل لگ گیا تھا۔ اور

اس کی خاموشی کو کمال اس کی تائید سمجھنے کی بہت بڑی غلطی کر رہا تھا۔ خیر، غلطی تو منال بھی خاموش رہ کر کر رہی تھی اور جہاں خاموشی ہو، وہاں بدگمانیوں کو پروان چڑھتے دیر نہیں لگتی۔

''تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی ناں... کوئی بات نہیں.... مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔''

منال کی خاموشی کو کمال نے غلط معنی پہنائے تھے اور ان معنی پر قیاس کرتے ہوئے وہ اپنا فیصلہ سنا کر وہاں سے جا چکا تھا۔ منال وہیں دروازے کے پاس کھڑی رہ گئی۔

کچھ دیر حیرت کا مجسمہ بنے رہنے کے بعد وہ یک دم خیالات سے باہر آئی اور تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے، آخر کمال کو ایسی کیا خبر مل گئی؟ وہ اس طرح کا رویہ کیوں دکھا رہا تھا؟ یہ سوچتے ہوئے رو رو کر منال کی آنکھیں اور ناک کی پھننگ سرخ ہو گئی تھی۔

''کمال نے میرے بارے میں اس طرح کیسے سوچ لیا؟'' کمال کے فیصلے سے زیادہ اسے اس کی سوچ کو جان کر دکھ ہو رہا تھا۔

''وہ میرے بارے میں اس طرح کیسے سوچ سکتا ہے...؟ کیسے؟''

وہ سر منہ لپیٹے اپنی چارپائی پر اوندھے منہ لیٹی ہوئی تھی۔ گھر والے ابھی واپس نہیں آئے تھے۔

''میں اس کا احوال جاننے اور اسے تسلی دینے ان کے گھر نہیں گئی تو اس نے کتنی جلدی میرے بارے میں غلط گمان پال لیا کہ میں لالچی ہوں۔''

یہ سوچتے ہی اس کے بمشکل سنبھلے آنسو دوبارہ رواں ہو گئے تھے۔ ''میں....؟ لالچی......؟ میں نہیں ہوں لالچی....''!

اس کا دل چاہا کہ ابھی اٹھ کر کمال کے پاس جائے اور اس کے گریبان کو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے چلائے کہ وہ لالچی نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو رستم رئیس کا رشتہ نہ ٹھکراتی۔ لیکن اس میں نہ اتنی ہمت تھی اور نہ ہی جرات۔ فیصلہ سنانے والا تو اسے صفائی کا موقع دیے بغیر فیصلہ سنا کر جا چکا تھا، پیچھے تو بس منال کے آنسو ہی بچے تھے، کڑھائی والے تکیے میں جذب ہوتے ہوئے بے وقعت سے آنسو...!

....☆....

بات پھیل ہی گئی! لوگوں کے سوالوں سے تنگ آکر اصغر شاہ نے اسکول کو ایک ہفتے کے لیے بند کر دیا گیا تھا اور مراد سے کہہ دیا تھا کہ کوئی بھی گھر پر ملنے کے لیے آئے تو اسے باہر سے ہی ٹرخا دے۔ ان کا مہمان خانہ اجڑ گیا تھا اور ان کی دوپہر کے کھانے کی رونقیں روٹھ چکی تھیں۔ منگلا اور نبیل ابھی تک واپس نہیں آئے تھے لیکن انہوں نے فون پر اصغر شاہ سے رابطہ ضرور رکھا ہوا تھا۔

''حالات بہتر ہوں تب آنا، ابھی نہیں۔'' اصغر شاہ نے انہیں خود ہی آنے سے منع کر دیا تھا کہ کہیں کوئی ان دونوں کو نقصان نہ پہنچادے۔ اصغر شاہ کا علاقے میں ایک رعب اور اثر ورسوخ تھا اس لیے لوگوں کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ کھل کر اصغر شاہ کے خلاف کچھ بول سکیں، کچھ ان کے سابقہ رویے اور علاقے پر ان کے کیے گئے احسانات کی وجہ سے بھی لوگ اشتعال میں نہیں آئے۔

''شاہ جی! میں یہ نوکری چھوڑ رہا ہوں۔'' اصغر شاہ گھر کی تنہائی سے تنگ آکر مہمان خانے کی طرف چلے گئے تھے جہاں مراد جھاڑو لگا رہا تھا۔ ایک مراد ہی تھا جو ابھی بھی اصغر شاہ کے ساتھ اسی طرح بات چیت کر رہا تھا جس طرح پہلے کرتا تھا، باقی سب نے تو جیسے بائیکاٹ کر دیا تھا۔

''شاہ جی! کھانا لاؤں؟''

''ہاں مرادے! کھانا ہی کھلا دو، بلکہ تم بھی آجاؤ۔ آج ہم دونوں مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ باقی تو کوئی اب میرے ساتھ کھانا بھی نہیں کھانا چاہتا، جیسے میں ناپاک ہو گیا ہوں۔'' اصغر شاہ نے دکھ سے کہا اور کمرے میں جا کر ایک کرسی پر اخبار لے کر بیٹھ گئے۔ تبھی شوکت نے اندر آتے ہی کہا تھا۔

''شاہ جی! میں یہ نوکری چھوڑ رہا ہوں۔'' شوکت پچھلے پیر کو اپنے تایا کے انتقال پر دوسرے شہر گیا ہوا تھا۔ ابھی اس کی واپسی ہوئی تھی اور آتے ہی اس نے یہ بات کی تھی۔ اصغر شاہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ سرخ چہرہ لیے انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''السلامُ علیکم شوکت... کیا حال ہے؟''

''میں بس یہ بتانے آیا تھا کہ میں یہاں مزید کام نہیں کر سکتا...'' شوکت نے ان کے سلام کو نظر انداز کیا تھا۔

''بیٹھ کر بات کر لو، اتنا غصے میں کیوں ہو...؟'' اصغر شاہ نے دوستانہ انداز میں کہا لیکن شوکت ٹس سے مس نہ ہوا۔

''میں نہیں چاہتا کہ میں ایک ایسے شخص کے گھر اور سکول میں کام کروں جسے حضرت محمد ﷺ کی شریعت کو سمجھنے کے لیے کسی دوسرے نبی کی ضرورت ہے۔'' شوکت نے اکھڑے ہوئے انداز میں کہا تھا۔اصغر شاہ اس کا انداز دیکھ کر تپ گئے۔

''جاؤ بھئی جاؤ، جان چھوڑو میری...! ہر ایک کو وضاحتیں دے دے کر تھک گیا ہوں میں! جانا ہے تو جاؤ... مجھے کیا بتانے آئے ہو؟''

اصغر شاہ نے برہمی سے کہا تھا۔ شوکت تاسف اور غصے سے بھری ایک نظر ان پر ڈال کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کھانے کی ٹرے اندر لاتے مراد نے بڑی مشکل سے اپنے آپ اور ٹرے کو اس سے ٹکرانے سے بچایا تھا۔

''یہ بھی چلا گیا!'' مراد نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے پیچھے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔

''جائے میری بلا سے!'' اصغر شاہ نے غصے اور بددلی سے ٹرے کو اپنی طرف کھسکایا تھا: ''تم تو بیٹھو...'' ان کے کہنے پر مراد ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔اصغر شاہ نے سالن اپنی پلیٹ میں ڈالنا شروع کیا ہی تھا کہ مراد نے آہستگی سے کہا تھا۔

''شاہ جی! مجھے اس جماعت کے بارے میں بتائیں۔'' سالن والا چمچ پکڑے ہوئے اصغر شاہ کا ہاتھ وہیں رک گیا۔انہوں نے تعجب اور حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی شاہ جی...'' مراد نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا:

''آپ جیسا پڑھا لکھا اور اتنا ملنسار بندہ اگر اس جماعت میں شامل ہو سکتا ہے تو پھر وہ جماعت ٹھیک ہی ہو گی۔''

اس کی بات سن کر اصغر شاہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ شوکت کی وجہ سے ان کا جو موڈ خراب ہوا تھا، وہ مراد کی اس بات سے فوراً ٹھیک ہو گیا۔ کھانے کے دوران اور بعد میں بھی وہ مراد کو اس

جماعت کے عقیدے کے بارے میں بتاتے رہے تھے۔

....☆....

''اماں ..! منال کہاں ہے؟'' رات کے کھانے پر امداد نے پوچھا تھا۔ مغرب کا وقت تھا۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے رات کا کھانا سورج غروب ہوتے ہی کھالیا جاتا تھا۔ جاوید صبح سے گھر نہیں آیا تھا۔

''اپنے کمرے میں ہووے گی... شاید سر میں درد تھا اس کے...'' اماں نے چٹائی پر سے برتن سمیٹتے ہوئے بتایا۔ وہ تینوں برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''برتن رکھ کے فیر وہ پیسے لا دے جو رستم صاب دے کے گئے تھے۔'' ابا نے اماں کو کہا تھا: ''کل دکان کا کچھ کرتے ہیں۔''

''ہاں ابا... ٹھیک کہا تو نے..!'' امداد بولا۔

اماں نے برتن باورچی خانے میں رکھے اور اپنے کمرے میں چلی گئیں جہاں پیٹی کے اندر انہوں نے رقم والا لفافہ سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ پیٹی سے لفافہ نکال کر انہوں نے باہر برآمدے میں بیٹھے ابا کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''بسم اللہ....!'' ابا نے روشن آنکھوں کے ساتھ لفافہ کھولا تھا۔ مستقل آمدنی کی ایک سبیل جو بننے والی تھی!

لیکن جیسے ہی انہوں نے لفافے سے رقم باہر نکالی، وہ گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔

''کیا ہوا ابا جی...؟'' امداد نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''یہ تو..... یہ تو بس پانچ ہزار ہیں.....!'' ابا کے کپکپاتے ہاتھوں سے نوٹ زمین پر گر گئے تھے۔

''ہائے....!'' اماں لالٹین اٹھا کر جلدی سے ان کے قریب آئیں۔ امداد بھی فوراً آگے بڑھا تھا۔

''غور سے دیکھ.... پورے بیس ہزار تھے!'' اماں کی آواز میں بھی حد درجہ پریشانی امڈ آئی تھی۔ امداد نے زمین پر گرے نوٹ اٹھائے اور انہیں دوبارہ، پھر سہ بارہ گنا۔ اماں نے لالٹین کی لو تیز کر دی تھی تاکہ گننے میں کوئی غلطی نہ ہو جائے یا کوئی نوٹ گننے سے رہ نہ جائے۔

"پانچ ہزار ہیں....!" امداد نے تھکے لہجے میں کہا تھا۔ اماں لالٹین پکڑے پکڑے زمین پر اکڑوں بیٹھ گئیں اور سر پر ہاتھ رکھ لیا۔ ابا جی تیزی سے اٹھے۔

"لا مجھے دے....."

یہ کہتے ساتھ ہی ابا نے اماں کے ہاتھ سے لالٹین لی اور اندر کمرے میں جا کر پیٹی چیک کرنے لگے کہ شاید لفافے میں سے کچھ نوٹ پیٹی میں رکھی رضائیوں میں نہ گر گئے ہوں.... لیکن وہاں کوئی نوٹ نہیں تھا۔ کھٹ پٹ کی آواز سن کر منال نے بھی ہمت کی اور درد سے پھٹتے سر کو سنبھالتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔

"کیا ہوا ابا.....؟" ابا جواب دینے کی بجائے اب رضائیوں کو پیٹی میں ادھر ادھر پٹخ رہے تھے۔ منال ناسمجھی کے عالم میں باہر برآمدے میں آئی جہاں اماں سر پکڑے رو رہی تھیں۔

"اری کیا ہوا اماں....؟"

"ہاہائے!!!" اماں کے رونے کی آواز بلند ہوئی تھی: "کوئی چور اچکا ہمارے گھر سے چوری کر گیا جے..."!

"اوئے جیدے اوئے...!!" ابا جاوید کو آوازیں دیتے ہوئے اندر سے غصے میں بپھرے باہر نکلے تھے:

"اے جیدے ہی کی حرکت ہے..اسی کا کام ہے؛؛؛ بھلا اور کسی کو کیا پتا تھا ہماری رقم کا۔"

"اسی لیے وہ صبح سے غائب ہے..." امداد بھی غصے سے بولا۔

منال اس نئی مصیبت کے سامنے اپنا سر درد بھول گئی تھی۔ ابا غصے سے باہر کے دروازے کی جانب لپکے تھے۔

"چھوڑوں گا نہیں اُسے...ایک بار آ تو لینے دو"!

"اب اُسے ڈھونڈنے کہاں جاؤ گے؟" اماں نے انہیں روکنا چاہا تھا۔

"مینوں جان دے سیانی بی بی...!" ابا غصے سے پھنکارا اور باہر نکل گیا۔ امداد بھی لالٹین اٹھائے ان

کے پیچھے بھاگا تھا۔

''او تیرا ککھ نہ رہے جیدے...!! تُو کسی جوگا نہ رہے..''!

اماں روتے ہوئے بددعائیں دے رہی تھیں۔ منال چپ چاپ اماں کے برابر میں آکر بیٹھ گئی اور ان کے کندھے سے اپنا سر لگا لیا۔

ابا اور امداد سیدھا جاوید کے جگری دوست شفیق کے پاس گئے تھے۔

''او شفیقے...! باہر آ...!'' امداد نے کنڈا زور سے کھٹکھٹاتے ہوئے آواز لگائی تھی۔ رات کے اندھیرے میں اس کی آواز دور تک گئی تھی۔

''کون اے...؟'' اندر سے شفیق نے پوچھا تھا۔

''تُو باہر آ، پھر بتاتا ہوں، میں کون ہوں۔''

امداد نے غصے سے جواب دیا تھا۔ اندر کچھ دیر تو خاموشی رہی، پھر شفیق نے کنڈا گرا کر دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ وہ قدرے صحت مند نوجوان تھا جس کا سر فٹ بال کی طرح گول بنانے میں اس کی ماں نے ٹھیک ٹھاک محنت کی تھی، لیکن اب اس کا پیٹ اس کے سر سے بھی زیادہ گول معلوم ہوتا تھا۔

''بھاء امداد..! ارے... مگر تم کب آئے؟'' اس نے گرم جوشی سے آگے بڑھ کر امداد سے مصافحہ کرنا چاہا تھا لیکن آگے سے امداد نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

''جاوید کدھر ہے..؟ تے ویکھ...!!!.... میرے سے کوئی ڈرامہ نہ کریں... مجھے پتا ہے جیدا کدھر ہوتا ہے''!

اس سے قبل کہ شفیق کوئی بہانہ بناتا، امداد نے پہلے ہی اسے خبردار کر دیا۔ کچھ دیر تو اس نے آئیں بائیں شائیں کرنے کی کوشش کی لیکن امداد اور بابا اسحاق کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ امداد ایک بازو کے ساتھ بھی اس پر حاوی ہونے کے لیے کافی تھا۔

''او پنڈی چلا گیا تھا پرسوں۔''

''پنڈی....؟'' ابا اور امداد دونوں حیران ہوئے۔

”آہو.... دبئی جانے کے لئے ....ایجنٹ نے کہا تھا کہ رقم کا انتظام کر لے تے او دبئی کا ویزہ لگوادے گا۔“

”بغیرت انسان.....!“ بابا اسحاق نے جیدے کو غائبانہ گالی سے نوازا تھا!

....☆....

بالآخر اصغر شاہ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ نگہت بیگم نے ان سے خلع کا مطالبہ کر دیا تھا جسے نہ چاہتے ہوئے بھی اصغر شاہ کو پورا کرنا پڑا اور بقیہ زندگی نگہت بیگم نے اپنی بیٹی رابعہ کے ساتھ اپنے بھائی امان اللہ کے گھر پر گزار دی۔ عمر اور علی اصغر شاہ سے ملتے تھے لیکن نگہت بیگم نے اصغر شاہ سے وعدہ لیا تھا کہ وہ بچوں کو اپنے مذہب کے بارے میں تبلیغ نہیں کریں گے۔ اصغر شاہ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ عاقل بالغ ہونے پر یہ دونوں خود فیصلہ کر لیں گے کہ ہم میں سے کون درست ہے اور کون غلط، اور انہوں نے کس کا عقیدہ اختیار کرنا ہے۔" اصغر شاہ نے جواب میں کہا تھا۔

پہلے صرف شک تھا اس لیے والدین نے کوئی خاص ایکشن نہیں لیا تھا لیکن جب بات ثابت ہو گئی کہ اس اسکول کے پرنسپل اور کچھ سٹاف کا تعلق اس جماعت ست ہے تو بہت سے والدین نے اپنے بچوں کو لرنر سیکنڈری سکول سے نکال کر دوسرے سکولوں میں داخل کروا دیا۔ تقریباً آدھا پرانا اسٹاف اسی وجہ سے اسکول چھوڑ کر چلا گیا اور ان کی جگہ نئے اسٹاف نے لے لی جن کا تعلق بھی اسی جماعت سے تھا۔

عبدالکریم صاحب سال بعد واپس آ گئے تھے لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اصغر شاہ کسی بھی طرح اس جماعت کے بارے میں کوئی بھی بات سننے کو تیار نہیں تھے۔ آہستہ آہستہ ان دونوں کی دوستی بھی ختم ہو گئی۔ بلال ویسے بھی دوسرے اسکول میں داخلہ لے چکا تھا۔ بڑوں میں تو فاصلے تھے لیکن عمر اور بلال

فون پر رابطے میں رہتے تھے۔ دونوں نے مل کر اس جماعت کے بارے میں مکمل چھان بین کی تھی اور باقاعدگی سے سر سعید کے پاس جاتے تھے تاکہ کوئی ان کے دلوں میں ایمان کے حوالے سے کسی بھی قسم کا شک نہ پیدا کر سکے۔

اصغر شاہ کا گھر، مہمان خانہ اور اسکول اب اس جماعت کا گڑھ بن چکا تھا جہاں سے اس مذہب کی تبلیغ اس انداز میں کی جاتی تھی کہ مشتعل ہونے کے لیے لوگوں کے ہاتھ میں کوئی وجہ نہ آپائے۔ علاقے کے لوگوں نے بھی شروع میں تو تھوڑا بہت احتجاج کیا، پھر انہوں نے بھی ان سب کو قبول کر لیا تھا، اس شرط کے ساتھ کہ یہ لوگ کسی اسلامی شعائر کو سرِ عام استعمال نہیں کریں گے۔

اصغر شاہ اور ان کی جماعت کے دیگر لوگوں نے ان کی سب باتین مان لی تھیں، اور لوگ بھی اس بات پر مطمئن تھے کہ ہمارے ایمان محفوظ ہین، حالانکہ درپردہ اصغر شاہ اور ان کے ساتھیوں کی کوششوں سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ علاقے کے افراد ایک ایک کر کے ان کی جماعت میں شامل ہوتے جا رہے تھے۔

....☆....

”میدان بالکل صاف ہے باس..! کچھ کام آپ کے خادموں نے کیا، کچھ کام ان کے اپنے بیٹے نے کر دیا“!

ناشتے کی میز پر کارندے نے رپورٹ پیش کی تھی جسے سن کر رستم نے زور دار قہقہہ لگایا تھا۔ پھر اپنے ڈرائیور کو آواز دے کر کہنے لگا،

”جیپ تیار کرو۔ ہمیں آدھے گھنٹے میں کہیں جانا ہے۔“

آدھے پون گھنٹے بعد جیپ وہاں سے روانہ ہو رہی تھی۔

”ڈیڈی کہاں جا رہے ہیں؟“ الوینہ جم سے اسی وقت واپس آئی تھی اور گیٹ پر کھڑے ہو کر چھوٹے سے تولیے سے اپنے چہرے کو پونچھتے ہوئے اس نے حیرت سے رستم کی جیپ کو دور جاتے دیکھ کر سوچا تھا، پھر کندھے اچکا کر لاپرواہ سے انداز میں کمرے میں چلی گئی۔

''میرے لیے اورنج جوس بنادو۔'' اس نے تولیے کو کرسی پر پھینک کر ملازمہ سے کہا اور خود بھی کرسی پر ڈھے کر ہیڈ فون دوبارہ کانوں میں اڑس لیے۔

منصوبے کے عین مطابق عصر کے قریب رستم کی جیپ بابا اسحاق کے گھر کے سامنے رک چکی تھی۔ بابا اسحاق پہلے ہی شہتوت کے نیچے چارپائی پر سر جھکائے، مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جیپ کو رکتے دیکھا تو حیرت سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اب یہ کیوں آئے بھئی...؟'' بابا اسحاق جیپ کی طرف سست قدموں سے بڑھے تھے لیکن جب اس نے جیپ سے رستم کو اترتے دیکھا تو گڑبڑا کر تیزی سے ان کی جانب بڑھا۔

''میں بابا ملنگ کے مزار پر ایک منت ماننے آیا تھا تو سوچا کہ آپ کی طرف کا بھی چکر لگا کر حال احوال پوچھ لوں۔''

سلام دعا کے بعد رستم نے آنے کی وجہ بتائی تھی۔

''جی جی، جم جم آؤ...'' ابا نے بظاہر خوش دلی سے کہا تھا لیکن دل میں سٹپٹا گئے تھے۔ گھر میں ایسا کچھ تھا نہیں جو وہ رستم رئیس جیسے مہمان کے سامنے رکھتے۔ دوپہر کو منال دھی نے شلجم کا سالن بنایا تھا لیکن شلجم بھی مہمانوں کے سامنے رکھنے والی چیز ہے بھلا؟

بیٹھک میں بیٹھے رستم کی امداد سے بھی ملاقات ہو گئی۔ اس کا پلستر شدہ بازو دیکھا تو امداد نے تفصیل سے اس کا پسِ منظر بتانے کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ وہاں کراچی میں اچھی بھلی نوکری تھی لیکن بازو ٹوٹنے کی وجہ سے نوکری چلی گئی اور اب ان لوگوں کا کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے۔ امداد زیرک اور چالاک انسان تھا اور اس کا چالاک ذہن رستم رئیس کی چال ڈھال سے اس کی امارت کی جھلک دیکھ کر ایک ٹھیک ٹھاک قسم کا منصوبہ بنا چکا تھا جس میں اسے بس گھر والوں کو منانا تھا، خصوصاً منال کو!

''اوہ، مجھے آپ لوگوں کے حالات کو جان کر بہت افسوس ہو رہا ہے۔ میں خود بیمار انسان ہوں، اسی لیے بابا ملنگ کے مزار پر منت ماننے آیا تھا۔''

''آپ کو کیا ہو...ا؟'' امداد نے افسوس بھرے لہجے میں پوچھا۔ کراچی میں کچھ عرصہ رہنے سے اس

کی اردو بہت بہتر ہو گئی تھی۔

''تنہائی خود بہت بڑی بیماری ہے۔'' رستم زخمی مسکراہٹ کے ساتھ بولے:

''میری بیٹی تین سال کی تھی جب میری بیوی مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ وجہ کوئی خاص نہیں تھی، بس اسے میں پسند ہی نہیں تھا۔''!

رستم کے لہجے میں دکھ تھا۔ بابا اسحاق اور امداد خاموشی سے اس کی روداد سن رہے تھے، بلکہ امداد تو خاص دلچسپی لے رہا تھا۔

''تو آپ نے دوبارہ شادی کیوں نہیں کی؟ ' '

''کوئی ملی ہی نہیں....!'' رستم دکھی انداز میں مسکرایا:

''لیکن اب دل چاہتا ہے کہ کوئی ہو جس کے ساتھ باقی ماندہ زندگی گزار سکوں۔ ورنہ اتنی بڑی کوٹھی خالی سی لگتی ہے، لیکن کوئی ملے تب ناں۔''

''ضرور ملے گی جی، ضرور ملے گی۔'' امداد کے لہجے میں جوش تھا۔ بابا اسحاق نے ابرو اچکا کر اس کے جوش کو دیکھا تھا۔

''میں نے اپنے ارد گرد کے لوگوں کو کہا تو ہے کہ اگر کوئی خاتون مجھ سے شادی کرنے پر راضی ہو تو ضرور بتائیں.... میرا تو ارادہ ہے کہ جیسے ہی کوئی مناسب رشتہ ملا، میں فوراً نکاح کر لوں گا۔ بات تو عجیب ہے لیکن..... بیٹی کی عمر بھی شادی والی ہو گئی ہے.... اور باتیں بنانے والے لوگ تو باتیں بناتے ہیں کہ بیٹی کی شادی کی بجائے اپنی شادی کی فکر ہے مجھے..... آپ لوگ مجھے بہت ہمدرد اور سچے دل والے لگے ہیں، آپ بتائیں، کیا جوان بیٹی کا باپ اپنا گھر نہیں بسا سکتا؟''

رستم نے جذباتی انداز میں کہا تھا۔

''لوگوں کی باتوں کو چھوڑیں جی.... !لوگ تو باتین بناتے ہی ہیں''!

امداد نے جذبات میں کرسی کی ہتھی پر مکا مارا تھا: ''مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا! سو ضرورتیں ہوتی ہیں بجی ایک مرد کی، جسے صرف اس کی گھر والی ہی پورا کر سکتی ہے۔ ویسے آپ کیا کیا خواہش ہے؟ آپ کو

کیسے رشتہ چاہیے؟' '

امداد نے پوچھا تھا۔ بابا اسحاق نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ انہیں امداد کے جوش کی وجہ کچھ کچھ سمجھ آ نا شروع ہو گئی تھی!

''بس یہی کہ پڑھی لکھی ہو، سادہ اور سلیقہ شعار ہو، گھر بار سنبھالنے والی ہو.... اور امیر گھر کی تو بالکل بھی نہ ہو، میں ایک امیر زادی سے شادی کر کے پچھتا رہا ہوں، دوبارہ یہ غلطی نہیں کرنا چاہتا۔'' رستم نے دل میں مسکراتے ہوئے بظاہر سنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔

''رستم صاحب...!'' امداد سے خوشی سنبھالی نہیں جا رہی تھی، اس نے بے اختیار کھڑے ہو کر کہا۔

''آپ کی خواہش کے عین مطابق ایک رشتہ ہمارے اپنے گھر میں موجود ہے۔''

''کیا....؟'' اس کی بات سن کر بابا اسحاق ہونق بنے رہ گئے جبکہ رستم بھی فوراً کھڑا ہوا تھا۔

''کیا کہہ رہے ہیں آپ...؟''

''میں منال کی بات کر رہا ہوں رستم صاحب!'' امداد نے باچھیں پھیلائیں تو بابا اسحاق بھی کھڑے ہو گئے۔

''ہوش کر امدادے...! کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تجھے پتا نہیں کہ تیری بہن کمال دی منگ اے.....'' بابا اسحاق نے اسے ٹوکا۔

''ابا...! منگ ہی اے ناں! تے منگنی توڑ دیو! ابھی کون سا ویاہ ہوا ہے...اب ویسے بھی کمالا کسی جوگا نہیں رہا...! سارا پیسہ تے لٹا بیٹھا اے''!

''اوئے امدادے... شرم کر شرم...!'' ابے نے ہنکارا بھرا۔

''ابا... کیا تو چاہتا ہے کہ منال ساری زندگی کمال کے گھر بھوکی مرتی رہے؟ جان دے ابا...''!

رستم کے سامنے ہی دونوں باپ بیٹے میں گرما گرم بحث شروع ہو گئی تھی۔ رستم نے مداخلت ضروری سمجھی اور بولا:

'' مجھے آپ کی بیٹی سے شادی کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے، بلکہ اسے میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں

گا، لیکن چونکہ اس کی منگنی ہو چکی ہے تو میں....'

'امداد نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ٹھہریں رستم صاحب... !آپ بے فکر رہیں... اگر آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو ہمیں بھی نہیں ہے۔ ہم آپ کو دو دن میں جواب دیتے ہیں خیر سے۔''

''لیکن......' بابا نے کچھ کہنا چاہا تو رستم نے انہیں کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

''مجھے امید ہے آپ کا جواب میرے حق میں ہو گا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اپنے بٹوے سے ایک کارڈ نکال کر امداد کی طرف بڑھایا:

''یہ میرا فون نمبر ہے۔ آپ جب چاہیں، مجھ سے فون پر رابطہ کر سکتے ہیں۔''

''شکریہ جی......بہت بہت شکریہ''!

امداد نے لپک کر کارڈ پکڑا تھا۔ بابا اسحاق ہکا بکا ہو کر بس امداد کی پھرتیاں دیکھ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ایک لمحے میں اٹھ کر امداد کا گلا دبا دے۔ کم بخت نے من مرضی کر کے ابے کی ساری عزت خاک میں ملا دی تھی۔

خیر اب رستم جا چکا تھا مگر پیچھے منال کے گھر میں وہ ایک بہت بڑا ہنگامہ چھوڑ گیا تھا۔

''کچھ شرم کر تُو امداد! کچھ شرم کر... !'' ابا نے ملامتی انداز میں امداد کو کہا تھا۔ ان کی اونچی آواز سن کر اماں اور منال بھی وہیں آ گئے۔

''کیوں شرم کروں... ؟'' امداد نے ڈٹ کر کہا تھا: ''میں نے منال کے بھلے کا سوچا ہے۔ اس کمال کے پاس اب کوئی پیسہ نہیں ہے۔ منال کی اگر رستم صاحب سے شادی ہو گئی تو اپنے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔''!

امداد کی بات سن کر اماں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ منال نے بھی حیرت سے پہلے اپنے بھائی اور پھر اپنے باپ کو دیکھا۔

''یہ کیا کہہ رہا ہے تُو... ؟'' اماں نے آگے بڑھ کر پوچھا تھا۔

"اماں! رستم صاحب نے منال کا ہاتھ مانگا ہے۔" امداد نے طمانیت بھرے لہجے میں کہا تو بابا اسحاق غصے سے اس کی طرف بڑھے۔

"مانگا نہیں ہے... اس بے شرم نے خود اپنی بہن کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے کی سازش کی ہے۔"

منال یہ سن کر چکرا سی گئی۔ اس نے دیوار کا سہارا لے کر اپنے آپ کو گرنے سے بچایا اور قریب بچھی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"لل..... لیکن منال تے کمال دی....." اماں نے انگلی دانتوں تلے دبالی تھی۔

"تے فیر کی اے...؟ میں ابھی جا کے منگنی ختم کر دیتا ہوں... یہ کون سا بڑی بات ہے!" امداد نے فوراً حل پیش کیا تھا۔

"تُو منال کی عمر دیکھ تے فیر رستم صاب دی عمر دیکھ! کوئی جوڑ بنتا اے کہیں سے؟"

ابا نے امداد کو شرم دلانے کی کوشش کی لیکن امداد نے جیسے ناک سے مکھی اڑائی۔

"مرد کی عمر نہیں دیکھی جاتی ابا...! مرد بوڑھا ہو کر بھی جوان ہی ہوتا ہے! اور رستم صاحب کون سے ساٹھ ستر کے ہیں اماں..."!

ابے سے مایوس ہو کر امداد اماں کی طرف مڑا۔

"اماں....! تُو سوچ کہ اگر منال کا وہاں ویاہ ہو جاتا ہے تو ہمارے کیسے وارے نیارے ہو جائیں گے"!

جواب میں اماں خاموش رہیں لیکن ان کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ امداد کی بات سے قائل ہوتی جا رہی تھیں۔ رہی منال... تو وہ چارپائی پر بیٹھی بس ٹکر ٹکر سب کے چہرے دیکھ رہی تھی۔

"جاوید سارا پیسہ لے کر بھاگ گیا اے... ہمارا۔ کالو بھی مر گیا اے...... تُو مجھے بتا یہ گھر کیسے چلے گا..؟" امداد نے دوبارہ ابا کو مخاطب کیا تھا:

" رب سوہنے نے اتنا چنگا موقع دیا ہے تو اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھایئے؟ اس کا کہیں تو ویاہ کرنا ہے ناں.... تو کمال نہ سہی، رستم صاحب سہی.... کم از کم یہ تو سکھ سے رہے گی...!" امداد نے ہاتھ سے منال

کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''تیرے نزدیک تو بس پیسہ ای سب کچھ اے.... لیکن پیسہ ای سب کچھ نئی ہوتا پتر..''!

ابا نے تاسف سے کہا۔ وہ بھی چارپائی پر منال کے برابر ہیں بیٹھ گئے تھے۔

''چھوڑ ابا یہ کاغذی باتاں..! پیسہ ای سب کچھ ہوتا اے! جب پیٹ می کچھ نہ ہو اور جیب میں بھی ایک دھیلا تک نہ ہو تو بتا مجھے تجھے سب سے زیادہ پیسے کی طلب نہیں ہو گی؟'' امداد تلخی سے بولا۔

''وے امدادے... اچھا ہوا تم چاروں مجھے گھر پر ہی مل گئے!'' اچانک چاچی بشیراں کی غصے میں بھری آواز آئی تھی۔ ان چاروں نے بیٹھک کے دروازے کی طرف دیکھا تو وہاں دروازے پر چاچی بشیراں کھڑی، غصے سے انہیں گھور رہی تھیں۔ ان کے عقب میں کمال بھی کھڑا تھا۔

''ہم تمھاری طرف ہی آنے لگے تھے چاچی...'' امداد انہیں دیکھ کر پہلے تو تھوڑا سا ہچکچایا کیونکہ برادری کی بات تھی اور دو سال سے تو منگنی چل رہی تھی، لیکن پھر رستم صاحب اور منال کی شادی سے امداد کو جو مالی فائدے ملنے تھے، وہ ذہن میں آتے ہی اس نے بے رخی سے چاچی بشیراں کو کہا تھا۔

''یہ بتاؤ تم لوگ کہ اے؟'' چاچی بشیراں نے کالی گڈی کیا کرنے آئی تھی یہاں...؟''

چارپائی پر پریشان صورت لیے بیٹھی منال کا معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''منال کا رشتہ لینے...!'' اس سے پہلے کہ ابا یا اماں گول مول جواب دیتے، امداد نے بغیر کسی لحاظ کے دھماکہ کر دیا تھا۔ اس کی بات سن کر چاچی بشیراں بھونچکا رہ گئیں جبکہ ابا نے ملامتی نظروں سے امداد کو دیکھا جو اطمینان سے بازو سینے پر باندھے کمال کو دیکھ رہا تھا۔ منال کا سر مزید جھک گیا۔

''اے کی کہہ رہا ہے تو امدادے...! منال تے کمال دی منگ اے۔''

''منگ ہے نہیں.... منگ سی.....اب نئی اے''!

امداد نے تیزی سے آگے بڑھ کر منال کی چوتھی انگلی میں پہنی ہوئی سونے کی انگوٹھی زبردستی اتاری تھی۔

''امداد پائی جان...اے سنو تو سہی....''!

منال نے کمزور سی آواز میں احتجاج کرنا چاہا لیکن امداد نے اس کے احتجاج کو سنی ان سنی کرتے ہوئے انگوٹھی کو چاچی کا ہاتھ آگے کر کے ان کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

کمال.... وہ تو بس سرخ آنکھیں لیے خاموش کھڑا تھا۔ چاچی بشیراں کو پہلے تو سمجھ ہی نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے، جب ان کے ذہن نے صورت حال کا صحیح طرح ادراک کر لیا تو غصے کی ایک تیز لہر ان کے اندر سے اٹھی تھی۔

"ہاں ہاں.... ! گل کِھلا آئی اے کُڑی شہر میں..... ! ! دیکھ لے کمالے.... " ! !

انہوں نے ساکت کھڑے کمال کو جھنجھوڑا: "دیکھ لے ! میں کہتی تھی ناں کہ اس کُڑی سے ویاہ مت کریں، اس دے چال چلن ٹھیک نہیں لگ رہے... لیکن تیری آنکھوں پر پٹی بندھی تھی... شاید اس نے کوئی منتر پڑھ چھوڑا تھا جو تجھے بس یہی نظر آتی تھی... دیکھ لے اب... "!

چاچی کے لہجے میں طنز، غصہ اور اپنی بات کے ٹھیک ثابت ہو جانے کی خوشی تھی۔ اماں کو ان کی بات سن کر غصہ آگیا۔

"زبان سنبھال لے بشیراں.... ! خبردار جو میری کُڑی دے بارے کوئی بری بات کی تو.... "!

"میں تو کروں گی.... اور کروں گی... پورے پنڈ کو بتاؤں گی کہ ساکوتے ممتاز دی کڑی بد چلن تے آوارہ اے... تے شہروں کوئی امیر منڈا پھنسا آئی اے۔" منال نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے تھے جبکہ امداد اور اماں چاچی بشیراں کے یہ الفاظ سن کر طیش میں ان کی جانب بڑھا تھے لیکن ابا فوراً ان کے آگے آئے۔ اماں نے چاچی کو کوسنے دینا شروع کر دیے تھے۔

"اماں... بس چل اب۔" آخر کار کمال کو بھی اپنی ماں کی چلتی زبان کو چپ کروانے کا خیال آیا۔ منال نے بہتے آنسوؤں کے ساتھ اس کی جانب دیکھا تھا۔ کمال کے پاس اس کے حق میں بولنے کے لیے ایک لفظ بھی نہیں تھا۔

"تُو چپ کر..... " چاچی نے کمال کو جھڑکا:

"تے شکر کر اے لڑکی ہمارے گھر نہیں آئی... بد چلن... پیچ.... ! اللہ توبہ توبہ ! ! ! ایسی کڑی اللہ

کسی نوں نے دیوے۔“

”بشیراں..!!“اب بابا اسحاق دھاڑا تھا۔لاڈلی بیٹی کے بارے میں ان کے گھر میں کھڑے ہو کر کوئی ایسے اول فول کسی طرح بول سکتا ہے؟

”کمال...!اپنی بے بے کو لے کے جا یہاں سے....“

”ہاں ہاں... ہمیں ای نکالو..بس اپنی دھی نوں مت روکنا....اللہ جانے کہاں منہ مار کے آئی ہے اور تم سارے اِتنے بے شرم کہ کُڑی کو کچھ نہیں کہتے،الٹا ہمیں چپ کرا رہے او...!!“ چاچی بشیراں کی زبان شعلے اگل رہی تھی۔

”ہاں..!میں ہوں بد چلن....!میں ہوں آوارہ..!خوش اب....؟“

اچانک منال کھڑے ہو کر چلائی تھی۔سب کی بولتی زبانوں کو اچانک بریک لگی تھی۔منال کمال کی جانب مڑی اور غصے سے چلائی:

”میں لالچی ہوں....خود غرض ہوں......مجھے بس پیسے کی چاہت ہے...خوش اب..؟“

پھر منال نے امداد کی طرف رخ کیا۔غصے اور غم سے اس کی آواز پھٹ سی رہی تھی:

”رستم صاحب کو ابھی شہر جا کر فون کرو اور انہیں کہو کہ میں شادی کے لیے تیار ہوں۔جلد از جلد بارات لے کر آجائیں....خوش اب..؟“

یہ سب کہہ کر وہ وہاں رکی نہیں تھی بلکہ تیزی سے وہاں سے چلی گئی تھی۔سبھی نفوس اُس کے اِس اچانک ردِ عمل پر حیران کھڑے رہ گئے تھے۔اِدھر امداد نے جیسے ہی شہر جا کر ایک ٹیلی فون بوتھ سے رستم صاحب کو کال ملائی تو دوسری گھنٹی پر ہی فون اٹھا لیا گیا تھا۔دعا سلام کے بعد امداد نے اپنا بتایا اور ساتھ ہی منال کا پیغام بھی رستم تک پہنچا دیا تھا۔رستم کے لیے تو یہ ایک بہت بڑی خبر تھی۔اس نے جلدی سے فون رکھا اور الوینہ کو تلاش کرنے لگا:

”الوینہ...!!کہاں ہو..؟“کوٹھی میں داخل ہوتے ہی رستم نے چہکتے ہوئے آواز لگائی تھی،پھر اس کا جواب نہ پا کر خود ہی وہ الوینہ کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ اندر قالین پر

بیٹھی اپنے ناخنوں پر نیل پالش لگا رہی تھی۔

''تیاریاں شروع کر لو!'' رستم نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پر اسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

''کس چیز کی تیاریاں...؟'' الوینہ نے بھنویں سکیڑیں۔

''اپنے ڈیڈی کی شادی کی تیاریاں! تمہاری سہیلی نے خود مجھے کہا ہے کہ اس سے شادی کر لیں۔''

رستم نے الوینہ کا متوقع ردِ عمل آنے سے پہلے ہی اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

''I swear!.... میں نے اسے کچھ نہیں کہا تھا.... ابھی کچھ دیر پہلے اس کے بھائی نے فون کر کے کہا ہے کہ منال مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے..''

اس کے ساتھ ہی اس نے قہقہہ لگایا تھا۔ الوینہ کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''It's imposibble!!!.... اس کے چہرے کے تاثرات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے رستم کمرے سے نکل گیا۔ وہ ایک ہاتھ میں نیل پالش برش پکڑے، ششدر بیٹھی اپنے ڈیڈی کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر اچانک طیش میں آکر اس نے نیل پالش کی شیشی اٹھا کر زور سے دیوار پر دے ماری تھی۔

....☆....

وقت گزرتا گیا۔ بلال کا گھرانہ کراچی منتقل ہو گیا تھا جہاں بلال کا ہمدرد یونیورسٹی میں داخلہ ہو گیا۔

''امی جان! پلیز مجھے اجازت دے دیں ناں۔''

عمر کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ کسی یورپی ملک کی یونی ورسٹی سے ڈگری کرے لیکن نگہت بیگم بیٹے کو اتنی دور بھیجنے پر راضی نہیں ہو رہی تھیں۔

''ارے نگہت! میرے پاس بھیج دو ناں اسے! میں اس پر کڑی نظر رکھوں گا۔ بے فکر رہو، میں تمہارے لاڈلے کو بگڑنے نہیں دوں گا''!

آسٹریلیا میں مقیم عبداللہ ماموں کو علم ہوا تو انہوں نے فون پر بہن سے بات کرتے ہوئے ہنس کر عمر کی سفارش کی تھی۔ نگہت بیگم کو طوعاً و کرہاً اجازت دینی ہی پڑی۔ بس اب اسٹوڈنٹ ویزہ ملنے کی دیر تھی،

اور وہ مل کر ہی نہیں دے رہا تھا۔ عمر آسٹریلیا کی کتنی ہی یونی ورسٹیز میں درخواستیں بھیج چکا تھا لیکن ابھی تک کہیں سے بھی جواب نہیں آیا تھا۔ آخر ایک دن اسے ایک فون آہی گیا۔ عمر نے بے تابی سے فون اٹھایا لیکن آگے سے آواز سن کر وہ چونک سا گیا۔

"ہیلو عمر! السلامُ علیکم"!

"وعلیکم السلام۔ کون بات کر رہا ہے؟" آواز اسے مانوس سی لگی تھی لیکن اس کی یاد کی گرفت میں وہ بندہ نہیں آرہا تھا۔

"میں نبیل بات کر رہا ہوں۔" جیسے ہی اس نے نام بتایا، عمر کے ذہن میں فوراً سر نبیل خالد آگئے، جنہوں نے سر سعید کی جگہ لی تھی۔

"نبیل خالد؟" عمر نے پوچھا تھا۔

"ہاں، میں نبیل خالد، تم لوگوں کا انگلش ٹیچر۔ کیسے ہو تم؟" اس بندے نے تصدیق کی تو عمر کا منہ کڑوا ہو گیا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔ نبیل کو اس کے لہجے کی رکھائی کا اندازہ ہو گیا تھا۔

"تم اب چکر نہیں لگاتے۔ کبھی آؤناں شاہ جی کے ڈیرے پر۔ ملاقات کرتے ہیں۔"

"مجھے ضرورت نہیں ہے آنے کی۔ میرے والد آپ لوگوں کے پاس خوش ہیں، انہیں ہماری یا اپنے دوستوں کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ آپ لوگوں نے خوب رونق لگا رکھی ہے ان کے گرد۔" عمر نے طنز کیا تھا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ جتنی بھی دفعہ عمر اصغر شاہ سے ملنے وہاں گیا تھا، وہاں ضرور جماعت کے لوگ موجود ہوتے تھے۔ نبیل اس کا طنز محسوس کر کے ہنس پڑا۔

"اپنے جب چھوڑ دیں تو پھر غیر ہی اپنے بن جاتے ہیں۔ بہر حال، مجھے شاہ جی نے بتایا تھا کہ تم آسٹریلیا جانا چاہ رہے ہو۔ کیا بنا؟" نبیل کی بات سن کر عمر نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے کچلا۔ اس نے نگہت بیگم کو منع کیا تھا کہ اصغر شاہ کو اس بات کی خبر نہ ہو لیکن ان کا کہنا تھا کہ اصغر شاہ باپ ہیں اور باپ کو باخبر

ہونا چاہیے۔

''جی، تو...؟'' عمر نے مختصر جواب دیا۔

''تو بھئی، میں تمہیں آسٹریلیا بھجوا دیتا ہوں۔ میرے لیے ایسا کرنا نہایت آسان ہے۔ پہلے بھی بہت سے نوجوانوں کو اس طرح میں آسٹریلیا اور دیگر ممالک میں بھجوا چکا ہوں۔'' نبیل نے بتایا تو عمر کو حیرت ہوئی۔

''کیا مطلب..؟آپ کیسے بھجوا سکتے ہیں؟ ' '

''بہت آسانی سے۔ ورنہ تم کب تک ویزہ لگنے کا انتظار کرتے رہو گے!! میرے لیے یہ بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ بس تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا، ہماری جماعت کا ایک فارم ہے، اس پر تم نے دستخط کرنے ہیں اور بس! ایک دو ہفتے میں ہی تمہیں اسٹوڈنٹ ویزہ مل جانا ہے۔'' اس کی بات سن کر عمر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''بات سنیں آپ میری''!

عمر نے ہر طرح کا لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے نبیل کو کہا: ''آپ میرے والد صاحب کے دوست اور میرے استاد تھے، اس لیے میں آپ کی عزت کرتا ہوں اور بہتر ہے کہ اس عزت کو آپ برقرار رہنے دیں۔ آج کے بعد اگر آپ نے مجھے اس طرح کی کوئی بھی دعوت دی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا اور میں یہ بھول جاؤں گا کہ آپ میرے والد کی دوست تھے اور میرے استاد رہ چکے ہیں۔ سمجھ میں آئی یہ بات؟

اگر میرا ویزہ نہیں لگتا تو نہ لگے لیکن جو بات آپ مجھے کہہ رہے ہیں، وہ دوبارہ مجھے کبھی مت کہنا، بلکہ دوبارہ مجھ سے رابطہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔''

یہ کہہ کر عمر نے غصے سے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا تھا۔

....☆....

''تو تم بھی ویسی ہی لڑکی نکلی منال! لالچی اور خود غرض...''!

الوینہ غصے سے اپنے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ کمرے کی ہر چیز الوینہ کے ہاتھوں تہس نہس ہو چکی

تھی۔

"Enough is enough daddy!"....آپ نے پہلے مجھ سے میری مما کو دور کیا اور اب میری فرینڈ....اس دنیا میں میری واحد فرینڈ کو بھی مجھ سے دور کر رہے ہیں!"اس نے چلتے چلتے دونوں ہاتھوں سے اپنے بالوں کو بھینچا: "آپ آخر ایک نارمل باپ کیوں نہیں بن جاتے؟ ہر وقت ہوس...ہر وقت عیاشی...!!"اسے پہلے تو اپنے باپ پر غصہ تھا لیکن اب منال بھی اس کے غصے کی حق دار بن گئی تھی۔اسے تصور میں اپنے سامنے منال کھڑی ہوئی نظر آرہی تھی۔

"اور تم....تم نے میرے باپ کی دولت دیکھی اور بس...!تم نے اس کی عمر نہیں دیکھی!تم نے اس کا کردار نہیں دیکھا...پھر تم نے کیا دیکھ کر یا کیا سوچ کر اس سے شادی کی حامی بھر لی..؟"الوینہ کے ذہن میں جیسے دھماکے ہو رہے تھے۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہاتھ میں آئی ہر چیز کا حشر کر ڈالے!

"تمہارا تو منگیتر تھا ناں....جب میں نے تم سے ڈیڈی سے شادی کی بات کی تھی تو تم مجھ سے پورا دن ناراض رہی تھی۔اور اب...!اب تمہارا بھائی خود فون کر کے بتا رہا ہے کہ تم شادی کے لیے تیار ہو۔مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ تم زیادہ لالچی ہو یا تمہارا خاندان..."!

الوینہ نے لپک کر میز سے پرفیوم کی بوتل اٹھائی اور پوری قوت سے آئینے پر ماری۔بوتل اور آئینہ، دونوں ہی چھناکے کی آواز کے ساتھ ٹوٹے تھے۔

"تمہیں لگتا ہے تم ڈیڈی سے شادی کر کے بہت مالدار ہو جاؤ گی؟اور ڈیڈی کو لگتا ہے کہ سب کچھ ان کی دسترس میں ہے،وہ جب جس کی بھی خواہش کریں،وہ انہیں مل جائے گی؟میں ایسا ہونے ہی نہیں دوں گی...!میں تم دونوں کی ان خواہشوں کو کبھی پورا نہیں ہونے دوں گی...."!

الوینہ نے بیڈ سے تکیہ اٹھا کر اسے بھی زور سے قالین پر پٹخا تھا،پھر تھک ہار کر بیڈ پر گر کر رو پڑی تھی۔اگلے دن وہ ربوہ میں جماعت احمدیہ کے مرکز میں داخل ہوئی تھی۔گیٹ پر اس نے اپنا تعارف اپنے باپ کے نام سے کروایا تھا،فوری طور پر اندر پیغام پہنچایا گیا۔

تب وہاں کے ڈیوٹی انچارج الوینہ کو لینے گیٹ تک آئے تھے۔

" ارے! آپ تو رستم رئیس صاحب کی صاحب زادی ہیں ناں!" انچارج عبد الصمد اسے دیکھتے ہی آگے بڑھے۔

"جی ہاں..." الوینہ نے کالی چادر کو سر پر دوبارہ جماتے ہوئے جواب دیا۔ چادر بار بار اس کے سر سے پھسل جاتی تھی۔

"کیسے ہیں وہ..؟ اور آپ کا یہاں آنا..؟ خیریت تو ہے؟"

"مجھے آپ کے انچارج سے بات کرنی ہے۔"

الوینہ نے کچھ احترام کے ساتھ جواب دیا تھا۔ اگرچہ وہ کسی حد تک آزاد خیال لڑکی تھی لیکن پھر بھی روحانیت کا کسی حد تک رعب اس کے دل میں موجود تھا۔ عبد الصمد صاحب کچھ لمحے تو اس کے چہرے کو گھور کر آنے کی وجہ کا اندازہ لگاتے رہے، پھر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا:

"آپ بیٹھیں... میں اندر اطلاع بھجواتا ہوں۔"

کچھ دیر بعد الوینہ کمرے میں تین نفوس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ سلام دعا کے بعد الوینہ سے اس کی آمد کا پوچھا گیا تو وہ کہنے لگی:

"مجھے اپنے ڈیڈی کے بارے میں بات کرنی ہے۔"

"جی بیٹی...! کہیے.... ہم سن رہے ہیں.."

ایک آدمی نے بڑے شفیق لہجے میں کہا۔ جواب میں الوینہ نے گہرا سانس لے کر انہیں رستم اور منال کی شادی کے بارے میں بتانے کے بعد کہا۔

"وہ لڑکی میری ہم عمر اور میری سہیلی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ میرے ڈیڈی کو اس شادی سے روکیں۔"

اس کی بات سن کر تینوں نفوس نے مسکرا کے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

"لیکن بیٹی..! یہ تو عین شرعی عمل ہے۔ اس میں کیا قباحت ہے؟ ایک کم عمر لڑکی سے شادی کی اسلام میں ممانعت نہیں ہے۔" انہوں نے الوینہ کو سمجھانا چاہا۔

''لیکن غیر شرعی تعلقات رکھنے پر تو پابندی ہے ناں...!'' الوینہ نے تھوڑے تیز لہجے میں کہا: ''میرے ڈیڈی خواتین سے ناجائز مراسم قائم کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے، وہ آپ حضرات سے الفت رکھتے ہیں مگر آپ نے انھیں کبھی سمجھایا کیوں نہیں..؟''

''دیکھیں بیٹی..!'' تیسرے شخص نے اسے کہنا چاہا: ''یہ آپ کے گھر کا معاملہ ہے۔ بہتر ہے اسے آپ اپنے گھر میں ہی سلجھائیں۔''

''نہیں سلجھا پا رہی، تبھی تو آپ کے پاس آئی ہوں..''!

الوینہ نے بے بسی سے لب کاٹے۔

''ڈیڈی نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں اپنی سہیلی کو اُن سے شادی کرنے پر رضامند نہ کر پائی تو وہ میری سہیلی کو زبردستی اٹھوالیں گے۔''

''لیکن کچھ دیر پہلے تو آپ نے بتایا کہ آپ کی سہیلی خود رستم صاحب سے شادی کرنے کو تیار ہوئی ہے۔''

''مجھے شک.... کہ اس کے پیچھے بھی ڈیڈی کا ہی ہاتھ ہوگا۔''

''اوہ.... تو آپ نے رستم صاحب سے بات کی ہے اس سلسلے میں..؟''

''یس.... وہ نہیں رک رہے، تبھی تو مجھے یہاں کے بڑوں کو اس معاملے میں انوالو کرنا پڑ رہا ہے۔''

الوینہ نے مدد طلب نگاہوں سے ان تینوں کی جانب دیکھا۔

''دیکھیں بیٹی...! ہم ایک بار پھر یہی کہیں گے کہ یہ آپ ک گھر کا معاملہ ہے، اسے گھر میں ہی سلجھائیں۔''

''یہ صرف میرے گھر کا معاملہ کس طرح ہے؟'' الوینہ کی آواز دوبارہ کچھ بلند ہوئی:

'' وہ فارم ہاؤس پر جوان لڑکیوں کو بلواتے ہیں اور آپ کے لوگ بھی اس فارم ہاؤس پر آتے جاتے ہیں، تو یہ صرف میرے گھر کا معاملہ کس طرح ہے؟''

اس کی بات سن کر کچھ ثانیے کے لیے کمرے میں خاموشی چھاگئی۔ پھر ایک شخص نے گلا کھنکھارتے

ہوئے اس سے پوچھا:

''آپ ہم سے کیا چاہتی ہیں؟' '

''میں چاہتی ہوں کہ آپ ڈیڈی کو منع کریں، ان سب کاموں سے.... اور اگر وہ منع نہیں ہوتے تو..... تو ان کا بائیکاٹ کریں یا پھر.... یا پھر انہیں جماعت سے خارج کرنے کی دھمکی دے دیں۔'' الوینہ خود ہی انہیں تجاویز دے رہی تھی جنہیں وہ تینوں بظاہر بہت توجہ سے سن رہے تھے۔

''ٹھیک ہے۔ ہم ان سے بات کریں گے۔ ابھی آپ کسی اور سے اس بارے میں کوئی بات مت کیجیے گا۔''

''او کے...'' الوینہ ہلکی پھلکی سی ہو گئی تھی، جیسے اس کے سر سے بہت بھاری سا بوجھ ہٹ گیا ہو۔

اس کے کمرے سے نکلنے کے بعد تینوں نفوس نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا تھا۔

''اب کیا کرنا ہے؟''

''کرنا کیا ہے، رستم کو خط لکھ کر یا فون کر کے بتاؤ کہ اس کی بیٹی کے کیا عزائم ہیں۔''

''اور جو وہ کہہ کر گئی ہے کہ رستم کو جماعت سے نکال دیں یا اس کا بائیکاٹ کر دیں.... وہ؟''

''ارے! ہمیں زیادہ فنڈ رستم رئیس ہی سے ملتے ہیں۔ جماعت اس کا بائیکاٹ کس طرح کر سکتی ہے؟ بس رستم کو کہتے ہیں کہ وہی اپنی بیٹی کو قابو کرے۔'' ایک نے کندھے اچکا کر کہا تو باقی دونوں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔

اُدھر رستم کو الوینہ کے بارے میں رپورٹ مل چکی تھی۔ اس نے فوری طور پر عبدل کو طلب کیا اور اس معاملے میں اس سے رائے مانگی:

''میرا مشورہ ہے کہ اسے کچھ دنوں کے لیے کہیں بھیج دو... کچھ عرصے بعد خود ہی نئی صورت حال کو قبول کر لے گی۔''

عبدل نے مشورہ دیا تھا جو رستم کو بھی مناسب لگا۔

اس نے فوراً اسلام آباد میں مقیم اپنے بھائی کو فون کیا۔ پھر مختصر سلام دعا کے بعد کہا کہ الوینہ کو اصرار

کر کے کچھ عرصے کے لیے اپنی طرف بلوالیں۔الوینہ خود موجودہ صورت حال سے بہت ڈپریس ہو رہی تھی۔ جیسے ہی سرمد چاچو کا فون آیا، وہ فوراً اسلام آباد جانے کو تیار ہو گئی اور اگلے ہی دن کی فلائٹ سے اسلام آباد چلی گئی، اس اطمینان کے ساتھ کہ وہ جماعت کے ذریعے رستم اور منال کی شادی رکوا چکی ہے۔

مگر دوسری طرف کھیل اپنے عروج پر تھا۔سب کے سب مراحل بہت تیزی سے طے ہوئے تھے۔ جب منال راضی تھی تو بابا اسحاق کیا کرتے؟ ویسے بھی چاچی بشیراں نے منال کے بارے میں گاؤں میں جو باتیں پھیلائی تھیں، اس کے بعد انہیں رستم کا رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا، امداد ویسے ہی چوڑا بنا پھر رہا تھا کہ اس کی بہن کی شادی اتنے اونچے گھر میں ہو رہی تھی۔

اسے سو فیصد یقین تھا کہ منال کا بڑا بھائی ہونے کی وجہ سے رستم اس پر بھی بہت عنایتیں کرے گا، اماں کو پہلے منال سے جتنے شکوے ہوتے تھے، اب ان میں سے ایک بھی باقی نہیں بچا تھا کیونکہ بیٹی اتنے مالدار شخص سے شادی کر رہی تھی اور اتنے ٹھاٹ سے رہنے جا رہی تھی جس کا انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

وہ تو بار بار شادی کے اس جوڑے اور سونے کے زیورات کو دیکھ رہی تھیں جو رستم نے شادی سے ایک دن پہلے ہی بھجوا دیے تھے تاکہ منال شادی والے دن بہت اچھی طرح تیار ہو۔ رہا جاوید، تو اس تک بھی منال کی رستم سے شادی کی خبر پہنچ گئی تھی اور ایجنٹ کے ہاتھوں سارے پیسے لٹوا کر عین شادی والے دن وہ بھی واپس گھر پہنچ گیا تھا۔ خوشی کے موقع پر ابا اس پر کیا غصہ نکالتے کہ جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا تھا۔

رستم اپنے کچھ دوستوں اور مولوی صاحب کے ساتھ آیا اور نکاح پڑھوا کر منال کو رخصت کروا کر اپنی کوٹھی میں لے گیا۔ پیچھے رہ گئے منال کے گھر والے، جو بے حد مطمئن تھے کہ منال کے دن پھر گئے تھے، اب اس کی وجہ اسے جلد ان سب کے دن بھی پھر جانے ہیں۔

....☆....

خوبصورت سرخ عروسی غرارے میں ملبوس منال کا حسن دیکھا نہیں جا رہا تھا! لیکن اس کا دل جیسے مرا ہوا تھا۔ کمال کی طرف سے بے اعتنائی اور منال کے کردار کے بارے میں اس کے ہونٹوں سے ایک بھی لفظ کا نکلنا... یہی وہ اصل وجہ تھی جس کی وجہ سے منال نے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا۔ ساری دنیا کی الزام تراشی ایک طرف اور کمال کی خاموشی ایک طرف.... وہ ساری دنیا کے الزام سہہ سکتی تھی لیکن کمال کی خاموشی نہیں سہہ سکی تھی۔

کوٹھی کو برقی قمقموں سے سجایا گیا تھا۔ منال کے لیے کوٹھی کے باغیچے میں ایک سٹیج سا تیار کیا گیا تھا جہاں وہ نروس سی، سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ارد گرد کی میزوں پر رستم کی کچھ قریبی فیملیز بیٹھی ہوئی تھیں جو بعام تناول کرنے کے ساتھ ساتھ منال پر تبصرہ بھی کرتی جا رہی تھیں۔ رستم اپنے کچھ دوستوں کے پاس کھڑا تھا جب شہباز بٹ نے رستم کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا:

''کیا بات ہے بھئی!!! تم تو واقعی حور کو ڈھونڈ لائے ہو!'' جواب میں رستم فخریہ انداز میں مسکرایا۔

''میں بھی سوچ رہا تھا کہ رستم ایسا بندہ تو نہیں جو اپنے آپ کو شادی جیسے جھنجھٹ میں قید کرے... لیکن بھابھی کو دیکھ کر یقین آگیا ہے کہ حسن کا اپنا ایک جادو ہوتا ہے جو انسان سے کچھ بھی کروا لیتا ہے!'' سیٹھ احمد معنی خیز انداز میں ہنسا تو رستم اور شہباز نے بھی قہقہہ لگایا۔

"ہاں یار! میں نے پہلے کبھی بھی عورت ذات کو اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ تم جانتے ہو عورت میرے لیے ہاتھ کی میل سے زیادہ کچھ نہیں تھی لیکن...."

رستم نے اپنے ہاتھوں کو پریشانی میں ایک دوسرے میں پیوست کیے، سر جھکائے منال کو دیکھا: "جب میں نے اسے دیکھا تو سوچا کہ نہیں یار.... یہ مختلف ہے! اس کے حسن کو لوٹنا نہیں ہے بلکہ اسے ہمیشہ کے لیے اپنا بنانا ہے۔ تو دیکھو! رستم نے جو سوچا، وہ کر ڈالا..."!

"لیکن دھیان سے! اس نئی بھابھی کو تمہارے پرانے کارناموں کا پتا نہ چل جائے!" شہباز نے مسکراتے ہوئے آواز دھیمی کی۔

"تم دونوں کے کارناموں کا تمہاری بیویوں کو آج تک پتا نہیں چلا تو میری بیوی کو کیسے پتا چلے گا...!"

یہ کہہ کر رستم نے زوردار قہقہہ لگایا تھا جس میں اس کے دونوں دوستوں نے اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔

"وہ.... الوینہ...؟" رات گئے جب منال کو بیڈ روم میں چھوڑا گیا تو اس نے جھجکتے ہوئے رستم سے الوینہ کے بارے میں پوچھا تھا۔

"اس کی آنٹی کی طبیعت کچھ خراب تھی اس لیے اسے وہاں اسلام آباد جانا پڑا۔ آجائے گی کچھ دنوں میں۔ تم پریشان مت ہو۔ اس حسن پر پریشانی جچتی نہیں ہے۔" رستم نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا۔ منال اپنی جگہ پر سمٹ کر رہ گئی۔

....☆....

ابا اور اماں بیٹی کو اتنی جلدی بالکل پرائے گھر میں رخصت کرنے پر اپنی اپنی جگہ پریشان تھے لیکن اگلے دن ولیمے کے لیے جب رستم نے جیپ بھیجی تاکہ وہ شہر کے بڑے سے ہال میں منعقد ولیمے کی تقریب میں شرکت کر سکیں تو ان دونوں کی پریشانی جاتی رہی۔

"دیکھا! میں نے کہا تھا ناں کہ منال کے لیے رستم صاحب کا رشتہ بہترین ہے"!

امداد نے سٹیج پر قیمتی عروسی لباس میں ملبوس منال کو دیکھا تو ابا اماں کو جتایا۔

"شکر اے رب سوہنے دا! لکھ واری شکر اے.."!

ابا نے امیر لوگوں میں گھری بیٹھی بیٹی کو دیکھتے ہوئے اللہ کا شکرادا کیا تھا۔

شادی کے کچھ دنوں کے بعد ایک دن رستم نے منال کے ہاتھ میں دو ائیر لائن ٹکٹ تھمائے تھے۔

''یہ کیا ہیں...؟'' منال نے حیران ہو کر ان ٹکٹوں کو دیکھا تھا۔

''ہمارے ٹکٹ، برطانیہ کے.... ہم برطانیہ جارہے ہیں۔'' رستم نے مسکراہٹ کے ساتھ بتایا تھا۔

''برطانیہ....؟'' منال حیران رہ گئی۔

شادی کے بعد سے رستم اس کا بے پناہ خیال رکھ رہا تھا، مانو تو اسے ہاتھ کا چھالہ بنا کر رکھا ہوا تھا۔ منال اپنے لیے اس کی والہانہ محبت دیکھ کر اپنی قسمت پر رشک کرتی تھی اور حیران ہوتی تھی کہ کہاں ایک کچے سے مکان میں رہنے والی غریب لڑکی اور کہاں ایک امیر کبیر مرد جواب اس کا شوہر تھا! جوڑ بظاہر بنتا نہیں تھا لیکن جوڑ بن گیا تھا۔

''ہاں، برطانیہ کا.... وہاں ہمارے مشائخ کا سالانہ جلسہ ہے۔ اس روحانی جلسے میں میری ہر سال ضرور شرکت ہوتی ہے اور اس دفعہ تو تم بھی میرے ساتھ ہو، تو اور بھی مزا آئے گا۔'' رستم نے اپنے اوپر پرفیوم کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے بتایا۔

''روحانی جلسہ...؟ میں سمجھی نہیں...''

''سمجھ جاؤ گی میری نازک کلی...!'' رستم نے آگے بڑھ کر منال کے گال کو چھوا تھا: ''ابھی تو میں جلدی میں ہوں۔''

یہ کہہ کر رستم کمرے سے نکل گیا تھا اور پیچھے منال کو حیران سا چھوڑ گیا تھا۔ باہر شاید عبدل آیا تھا:

''شادی کی بہت مبارک باد ہو رستم!'' عبدل رستم سے بغل گیر ہو گئے۔

''بہت بہت شکریہ.... لیکن آپ کی کمی میں نے بہت محسوس کی تھی۔'' رستم نے بھی ان سے گلے ملتے ہوئے کہا تو انہوں نے رستم کی پشت تھپتھپائی۔

''بس جلسے کی تیاریاں چل رہی ہیں اور تمہیں تو بخوبی علم ہے کہ میرے اوپر کتنی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ میں نے جماعت کو پورا ریکارڈ دکھانا ہوتا ہے تو اسی وجہ سے مصروف تھا۔ بہر حال.... تم بتاؤ، کیسا چل

رہا ہے سب کچھ ...؟" عبدل نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے۔" رستم مسکرایا: "میں آپ کے آنے سے کچھ دیر پہلے منال کو ٹکٹ ہی دے رہا تھا۔ پہلے تو میں اکیلا جلسے میں شریک ہوتا تھا، لیکن اب میرے ساتھ میری بیوی بھی شامل ہو گی۔"

"لیکن ...." عبدل اس کی بات سن کو چونکا: "وہ تو ابھی بیعت میں شامل نہیں ہوئی ..."

"اسی لیے تو اُسے جلسے میں لے کر جا رہا ہوں۔ مجھے قوی یقین ہے کہ جلسے کی برکات اور نورانیت سے وہ ضرور متاثر ہو گی اور جب میں اسے مشائخ سے بیعت ہونے کی دعوت دوں گا تو اسے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" رستم نے بتایا تو عبدل کو کچھ تسلی ہو گئی۔

"ہاں، یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو.....ارے! شادی کی خوشی میں کچھ پینے پلانے کا....."

عبدل کی معنی خیز ادھوری بات سن کر رستم نے قہقہہ لگایا تھا۔

"آپ کی خدمت کرنا تو ہم پر عین فرض ہے!! کب کا پروگرام رکھوں؟"

"میرا خیال ہے بدھ کی رات ٹھیک رہے گی۔ ذہن کچھ خشک سا محسوس ہو رہا ہے۔"

عبدل نے مسکراتے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا تھا اور دونوں کا مشترکہ قہقہہ ایک بار پھر ڈرائنگ روم میں گونجا تھا۔

....☆....

منال کے گھر والے اس سے ملنے چنیوٹ آئے ہوئے تھے اور اس کے ٹھاٹھ دیکھ کر رشک کی انتہا پر تھے۔ اماں تو ہر چیز کو دیکھتے ہوئے "ہاہائے...!" کہہ کر اس کا برملا اظہار بھی کر رہی تھیں۔ جامنی رنگ کے قیمتی جارجٹ کے سوٹ پر نفیس سی شال اوڑھے منال مسکراتے ان سب کی حیرت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"دیکھا....! میں نے ٹھیک فیصلہ کیا تھا ناں...!" امداد چہکا:

"اگر اس کی شادی کمال کے ساتھ ہو جاتی تو ابھی یہ بیٹھی گائے کا گوبر اٹھا رہی ہوتی۔" اس نے فخریہ انداز میں سب کو جتاتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن کسی کے پاس اس کو جواب دینے کا وقت نہیں تھا۔ سب کی

حیرت اور رشک ہی ختم نہیں ہو رہا تھا۔ البتہ اس کی بات سن کر منال کے اندر ایک درد سا ضرور اٹھا تھا جسے منال نے سر جھٹک کر ذہن سے نکال دیا۔ رستم کی زندگی میں آکر اسے کسی چیز کی کمی تھی جو وہ کمال کو یاد کرتی!

اب تو ابا بھی مطمئن نظر آرہے تھے۔ شروع میں برادری نے منال کی رستم سے شادی کے بارے میں مخالفت کی تھی لیکن جب رستم کی ٹور دیکھی تو سبھی رفتہ رفتہ خاموش ہو گئے، بلکہ وہ رشتہ دار بھی بابا اسحاق سے رسم و راہ بڑھانا شروع ہو گئے تھے جنھوں نے بابا اسحاق کی غربت کی وجہ سے کبھی اس سے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی۔ اب رستم کی وجہ سے بابا اسحاق کے گھرانے کے دن پھر گئے تھے تو انہیں خوش فہمی تھی کہ ان کے بھی بہت سے کام بن جائیں گے۔

''اماں..! آؤ تجھے اپنا کمرہ دکھاؤں..!'' منال بہت شوق سے اماں کا بازو پکڑ کر انہیں اندر لے گئی۔ باقی افراد نے بھی اس کی پیروی کی تھی۔ رستم گھر پر نہیں تھا، وہ 'ایک ضروری کام' کے سلسلے میں فارم ہاؤس گیا ہوا تھا۔

گیلری سے گزرتے ہوئے ابا کی نظر ان تصاویر پر پڑی تھی جو خوبصورت سے سفید فریم میں دیوار پر آویزاں تھیں۔

''اے کون آں..؟'' ابا نے آنکھیں میچتے ہوئے تصویروں کو غور سے دیکھا۔ سبھی وہاں رک گئے تھے اور تصویروں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''یہ اُن کے پِیروں کی تصویریں ہیں ابا جی...!! وہ کہتے ہیں کہ یہ ساری دولت انہی پیر صاحبوں کی وجہ سے انہیں نصیب ہوئی ہے۔''

منال نے عقیدت سے بتایا: ''بلکہ اگلے ہفتے وہ مجھے لندن بھی لے کر جا رہے ہیں، ان کے پِیر صاحب کا سالانہ جلسہ ہوتا ہے وہاں۔''

''تُو لندن جا رہی اے...؟'' جاوید کے کان لندن کے ذکر پر کھڑے ہو گئے تھے:

''منال! رستم صاب سے کہہ ناں کہ مجھے بھی ساتھ لے جائے! مجھے بڑا ای شوق اے باہر ملک

جانے کا۔''

''زیادہ اتاؤلا نہ ہو!'' امداد نے جاوید کو گھر کا تھا: ''رستم صاب سوچیں گے کہ شادی کو جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں اور منال کے پیکے والوں کی فرمائشیں شروع ہوگئی ہیں!'' اس کی بات سن کر جاوید نے منہ بنایا تھا۔

''امداد ٹھیک کہہ رہا ہے!'' اماں نے بھی گفتگو میں حصہ لیا: ''تُو سالا اے رستم دا.... او تیری گل ضرور مانے گا.... لیکن تھوڑا صبر کر....! چل منال... اندر چلیے۔'' اماں نے آگے قدم بڑھائے تھے۔ ان کی چال میں ایک عجب سی اکڑ آگئی تھی۔ آخر ان کی بیٹی کی اتنی اونچی جگہ پر شادی جو ہوگئی تھی۔

ابا البتہ کچھ دیر وہیں کھڑے تصویروں کو غور سے دیکھتے رہے، انہیں ان میں سے پہلی تصویر کچھ دیکھی بھالی لگ رہی تھی لیکن انہیں یاد نہیں آرہا تھا کہ یہ تصویر انہوں نے کہاں دیکھی تھی۔ ان پڑھ ابا اگر تھوڑا بہت پڑھے لکھے ہوتے تو انہیں فوراً پتا چل جاتا کہ رستم کا تعلق کس جماعت سے ہے اور جو تصویر انہیں دیکھی بھالی لگ رہی ہے، وہ کس کی ہے۔

دوسری طرف الوینہ سے رستم اور منال کی شادی کی خبر کو چھپا کر رکھا گیا تھا۔ اپنے کزنز کے ساتھ اسلام آباد میں اس کا بہت اچھا وقت گزر رہا تھا لیکن پھر ایک دن منزہ کے منہ سے رستم اور منال کی شادی کی بات نکل گئی۔ پہلے تو الوینہ کو یقین ہی نہیں آیا، لیکن جب یقین ہو گیا کہ اس نے جو سنا ہے وہ حقیقت ہے تو وہ غصے میں بھری ہوئی سرمد چاچو کے پاس پہنچ گئی جو اس وقت ٹینس کھیل کر واپس آئے تھے۔

''چاچو..! کیا آپ کو اس بات کا علم تھا..؟'''' الوینہ ان کے سامنے کمر پر ہاتھ رکھے، لڑاکا انداز میں پوچھ رہی تھی۔

''کس بات کا علم وینا؟'' انہوں نے ایک ہاتھ سے تولیہ گردن کی پشت پر رکھتے اور دوسرے ہاتھ سے ملازمہ سے جوس کا گلاس پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''ڈیڈی کی شادی کا...!'' الوینہ طیش سے بولی۔

''تمہیں کس نے بتایا؟'' سرمد چاچو نے تولیہ ایک جانب رکھا۔

''منزہ نے بتایا ہے۔''الوینہ کا جواب سن کر سرمد چاچو نے دل ہی دل میں منزہ کو گالیوں سے نوازا۔

''اچھا.... تو پھر ہو گئی ہو گی شادی..... ہمیں تو نہیں بلایا۔'' انہوں نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

''ہو گئی ہو گی نہیں.... ہو گئی ہے!'' الوینہ چلائی تھی:''آپ کے لیے یہ بات اہم ہے کہ آپ کو شادی پر نہیں بلوایا گیا؟آپ کو یہ بات عجیب نہیں لگ رہی کہ انہوں نے میری فرینڈ سے شادی کی ہے؟ میری بیسٹ فرینڈ سے ؟''

''ارے! چلا کیوں رہی ہو..؟آرام سے بات کرتے ہیں ناں۔'' سرمد چاچو نے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا لیکن اس نے جھٹکے سے ان سے اپنا ہاتھ چھڑوایا۔

''میں یہاں آنے سے پہلے ڈیڈی روحانی مرکز والوں کو بتا کر آئی تھی کہ ڈیڈی کیا کرتے پھرتے ہیں، لیکن انہوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔آپ کو بھی سب معلوم ہے ناں کہ ڈیڈی کتنے کرپٹ انسان ہیں؟ '

'

الوینہ دوبارہ چلائی تھی۔ سرمد چاچو کا چہرہ غصے سے اچانک سرخ ہوا تھا۔انہوں نے غصے سے جوس کا گلاس زمین پر پھینکا۔

''بس کرو الوینہ...! تمہیں معلوم ہے تم اپنے باپ کے بارے میں اول فول کہے جا رہی ہو...؟''

''ہاں مجھے معلوم ہے!''الوینہ کی آواز ابھی بھی بلند تھی:

''اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کام میں سب کے سب ملوث ہیں... کیا ڈیڈی ایسے ہوتے جیسے ہیں عیسے میرے ڈیڈی ہیں؟ ہر گز نہیں..! ان کے روحانی مرکز کے بڑوں کا کوئی ہولڈ نہیں ہے ان پر؟ کیا یہ جو بیعت کی دس شرائط ہوتی ہیں کہ اپنے آپ کو پاک دامن رکھنا ہے، وہ صرف لوئر کلاس لوگوں کے لیے ہوتی ہیں؟اس پر کلاس لوگوں کے کرتوتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا جاتا؟ کیا انہیں سب گناہ معاف ہوتے ہیں؟.... کیا جماعت.....''

ابھی الوینہ مزید کچھ بولنے ہی والی تھی کہ سرمد چاچو کا ہاتھ اٹھا تھا اور لمحے بھر ہیں الوینہ کے دائیں

گال پر اپنے نشان چھوڑ گیا تھا۔ وہ ششدر آنکھوں سے سرمد چاچو کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

''شٹ اپ!'' اب چلانے کی بارہ سرمد چاچو کی تھی: ''جسٹ شٹ اپ!... بولتی جارہی ہو، بولتی جا رہی ہو.... یہ سوچے بغیر کہ بول کیا رہی ہو!!!۔ تمھیں جماعت کے خلاف بولنے کی اجازت کس نے دی ہے؟''

''اگر ڈیڈی کو غیر عورتوں کو اپنے فارم ہاؤس پر بلا کر عیاشی کی اجازت ہے تو مجھے بھی جماعت کے اس دوغلے پن کے خلاف بولنے کی اجازت ہے!'' الوینہ بھی الوینہ تھی! وہ مزید بپھر گئی تھی۔

''جماعت تمہارے اوپر سے ہاتھ کھینچ لے تو تم سڑکوں پر آجاؤ گی..! یہ جو تم پیسے کی بنیاد پر اکڑتی رہتی ہو، یہ سب جماعت کے توسط سے تمہارے باپ کو ملتا ہے! اُن لوگوں کو اگر تمہاری ان باتوں کی خبر ہو گئی تو اس نے تمہیں جماعت سے نکال کر مرتد اور کافر قرار دے دینا ہے۔ پھر تم کہاں جاؤ گی؟.... بولو..؟''

سرمد چاچو اونچی آواز میں چلا رہے تھے۔ منزہ اور ارسل دروازے کے پیچھے سہمے کھڑے دونوں کی باتیں سن رہے تھے۔

''میں ایسی جماعت پر تھوکتی ہوں جس کے نزدیک اخلاقیات کا دوہرا معیار ہے!'' الوینہ ان سے بھی اونچی آواز میں چلائی تھی۔ پھر زور زور سے پاؤں مارتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی اور اپنے پیچھے کمرے کے دروازے کو دھڑام سے بند کر لیا۔

....☆....

منال اور رستم جلسہ سالانہ میں شرکت کے لیے لندن پہنچ چکے تھے۔ چونکہ رستم جماعت کی دل کھول کا مالی معاونت کرتا تھا اور پاکستان میں کسی بھی قسم کی پریشانی کی صورت میں رستم اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے جماعت کو بچا لیتا تھا، اس لیے ان دونوں کو جماعت کی طرف سے خاص طور پر پروٹوکول دیا جارہا تھا۔

''یہ کون سی جماعت ہے؟'' منال یہ سوال بارہا پوچھ چکی تھی لیکن ابھی تک رستم نے اسے کھل کر نہیں بتایا تھا۔

''تمہیں کیا لگ رہا ہے؟'' رستم نے اپنا سوٹ کیس کمرے کی الماری میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔'' منال نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ رستم اس کی الجھن دیکھ کر مسکرایا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''اچھا، یہ بتاؤ کہ ابھی تک تمہیں کوئی خلافِ شرع کام ہوتا ہوا نظر آیا ہے؟''

''نہیں... ایسا تو کچھ نہیں دکھائی دیا، بلکہ مجھے تو یہاں سب لوگ نمازوں کے بارے میں بہت سنجیدہ لگ رہے ہیں۔ خواتین نے بھی عبائے پہن رکھے ہیں اور پردے کا اہتمام کیا ہوا ہے۔''

''اور بس روایتی مولویوں سے ذرا ہٹ کر ہیں یہاں سب..... بلکہ میں کہتا ہوں کہ مولویوں نے تو اسلام کا اصل چہرہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ یہ جائز... وہ ناجائز.. یہ کافر... وہ مسلمان.... یہ مومن... وہ مرتد وغیرہ وغیرہ... مگر یہاں تمھیں ایسا کچھ نہیں ملے گا۔''

''بات تو آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ مگر انھیں کون سمجھائے...'' منال نے سادگی سے جواب دیا۔

''اب تم اسی بات سے اندازہ لگالو کہ یہاں تم نے کوئی کام خلاف شرع نہیں دیکھا، یہ معصوم اور جنتی لوگ جو تمھارے سامنے عبادت میں مصروف ہیں، پاکستان کے کچھ مولویوں اور بعض طبقات کے نزدیک یہ مسلمان ہی نہیں ہیں۔ آہ... !!۔ افسوس ہے۔ یہ مولوی تو آپس میں بھی ایک دوسرے کو کافر کافر کہتے رہتے ہیں، خیر میں بھی کن سنجیدہ موضوعات میں بھٹک گیا.. یہ۔ ابھی تمھارے سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں۔'' منال کچھ اُلجھ سی گئی تھی۔

''یہ تصویر کس کی ہے؟'' منال نے ایک شخص کی بڑی سی تصویر کی جانب اشارہ کرکے پوچھا، جس کی سیاہ داڑھی اور مونچھیں تھیں اور سر پر بندھی دستار نے اس کے کان چھپا دیے تھے۔ بظاہر تو تصویر ٹھیک تھی مگر اس کی ایک آنکھ یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے وہ زیادہ کھلی نہ ہو، یا یوں کہہ لیں کہ اس سے مدھم دکھائی دیتا ہو۔ منال کے اس سوال پر رستم اول تو ٹھٹک گیا، پھر ہمت کرکے بولا:

''اوہ... !! ہاں.. یہ ہمارے سب سے بڑے روحانی پیشوا یعنی اس فرقے کے بانی کی تصویر ہے۔''

''اوہ... ٹھیک ٹھیک... نام کیا ہے ان کا..؟

"آپ انھیں ہمارا پیرو مرشد، مجدد، نبی پیغمبر... یعنی جو سمجھنا چاہتی ہو، سمجھ سکتی ہو... یہ ہندوستان کے صوبہ پنجاب کے ایک قصبے میں پیدا ہوئے تھے اور یہ جو ساتھ والی تصویریں ہیں وہ ان کے خلفاء کرام کی ہیں۔"

"یعنی اس فرقے کے علماء ہیں یہ لوگ..؟" منال نے حیرت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"بھئی علماء تو بہت پیچھے رہ گئے.. ہمارا تو دین اور دنیا سب کچھ یہی ہیں... ہم انہی کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں اور انہی کی باتوں کو وحی مانتے ہیں۔" رستم نے بے دھڑک کہا تھا۔ اس پر منال کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ آخر اس نے اپنی پریشانی دور کرنے کے لیے پوچھ ہی لیا:

"وحی تو... میرا مطلب ہے کہ وحی تو نبیوں پر نازل ہوتی تھی ناں..."

"تو ہمارے پیشوا کیا کسی نبی سے کم ہیں..؟"

منال شدید حیرت زدہ تھی۔ کیوں کہ آج تک اس نے رستم کے "فرقے" کے لوگ نہ دیکھے تھے نہ سنے۔ بلکہ اس نے تو رستم کو کبھی مذہب میں دلچسپی لیتے دیکھا ہی نہیں تھا... مگر یہاں آکر سب اُلٹ تھا۔ رستم تو ایسے مذہبی امور سرانجام دے رہا تھا جیسے وہ کوئی بہت بڑا عبادت گزار ہو۔

"مجھے.... اس جماعت کے بارے میں کچھ خاص علم نہیں ہے.... آپ مجھے بتائیں گے؟"

منال نے جھجکتے ہوئے کہا تو رستم نے پُرجوش ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"مجھے پہلے سے یقین تھا کہ اس جلسہ سالانہ کی برکت سے تمہارے دل میں جماعت کے بارے میں جاننے کا شوق پیدا ہو جائے گا.... اور وہی ہوا!! مجھے بہت خوشی ہے کہ تم جماعت کے بارے میں جاننا چاہ رہی ہو۔"

اس کے بعد رستم نے منال کو اپنی جماعت کے بارے میں بتانا شروع کر دیا تھا جسے منال حیرت اور دلچسپی سے سنتی چلی گئی۔ ایک ہفتے میں رستم کی زندگی میں دو بڑی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ ایک طرف رستم کی بیوی نے خلیفہ وقت کے ہاتھوں پر بیعت کر کے جماعت میں شمولیت اختیار کر لی تھی، دوسری طرف رستم کی بیٹی نے جماعت کو چھوڑ دیا تھا۔

''تم سے ایک بیس سالہ لڑکی سنبھالی نہیں گئی؟'' الوینہ نے ایک دن بعد ہی سرمد کا گھر چھوڑ دیا تھا اور واپس لاہور ہاسٹل میں چلی گئی تھی۔ کلاسز دوبارہ شروع ہو چکی تھیں لیکن فی الحال منال نے دوبارہ کلاسز جوائن کرنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔

''میں کیسے سنبھالتا اسے... آپ نے اسے اتنا خود سر بنا دیا ہے کہ اسے میرا یا آپ کا، کسی کا بھی لحاظ نہیں ہے۔''

سرمد نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا تھا۔ دو دن پہلے ہی رستم کو الوینہ کے جانے کے بارے میں علم ہوا تھا اور اس نے لاہور کی بجائے اسلام آباد کی ٹکٹس کروالی تھیں۔ اب دونوں بھائی ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے جبکہ مسز شیریں سرمد کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ مسز شیریں سرمد جماعت کی ایک فعال رکن تھیں اور منال کو جماعت میں خواتین کے کردار سے آگاہ کر رہی تھیں۔ عجیب ہی بات تھی کہ کچھ دن پہلے اسی گھر میں خواتین کے حوالے سے جماعت کی مخالفت میں ہنگامہ ہوا تھا اور اب اسی گھر میں جماعت کے حق میں بات کی جا رہی تھی۔ سوال اٹھانے والی جا چکی تھی اور سوال پوچھنے والی آچکی تھی۔

....☆....

''پتا نہیں کیا وجہ ہے کہ منال ابھی تک ہاسٹل آئی ہی نہیں ہے۔ کلاسز شروع ہوئے دو دن ہو گئے ہیں۔ اللہ خیر کرے۔''

فاطمہ نے دل سے دعا کی تھی۔ وہ منال کے بارے میں فکر مند تھی لیکن اس کے پاس منال کا کوئی رابطہ نمبر نہیں تھا جس کے ذریعے وہ منال سے رابطہ کر پاتی۔ منال کی شادی کی خبر ابھی کسی کو نہیں پہنچی تھی۔ اُس دوپہر کو بھی وہ منال کے بارے میں سوچتی ہوئی یونی ورسٹی سے واپس ہاسٹل کی طرف جا رہی تھی اور ابھی ہاسٹل کے گیٹ سے اندر داخل ہونے ہی والی تھی کہ شہروز نے اسے پکارا۔

''ایکسکیوز می..!''

فاطمہ چونکی اور پلٹ کر دیکھا تو لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا شہروز اس کی طرف آ رہا تھا۔

''آپ اسی ہاسٹل میں رہتی ہیں ناں؟'' اس نے قریب آکر دوبارہ پوچھا تھا۔ فاطمہ کو سمجھ نہیں آئی کہ

اس بات کا وہ کیا جواب دے۔ وہ اجنبی مردوں سے بات کرنے میں خاصی محتاط تھی۔

''میں الوینہ کا دوست ہوں۔'' شہروز اس کی ہچکچاہٹ بھانپ گیا تھا:

'' آپ کے ہاسٹل میں الوینہ رہتی ہیں۔ کیا آپ انہیں میرا پیغام دے سکتی ہیں کہ میں باہر کھڑا ان کا انتظار کر رہا ہوں، وہ مجھ سے آکر مل لیں۔''

پیشتر اس سے کہ فاطمہ انکار کرتی، شہروز نے ملتجائی لہجے میں کہا تھا۔ فاطمہ نے کچھ سیکنڈ سوچ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے، میں انہیں کہہ دیتی ہوں۔''

''تھینک یو سو مچ...! میں یہاں کھڑا انتظار کر رہا ہوں۔''

شہروز نے گیٹ کے باہر ایک جانب کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو فاطمہ نے 'ٹھیک ہے' کہہ کر ہاسٹل کے گیٹ کو عبور کر لیا۔

اچانک کسی نے الوینہ کے کمرے کے دروازے پر دستک دی تھی۔ ذہنی انتشار اس قدر شدید تھا کہ الوینہ کو رونے کے علاوہ اور کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ جب فاطمہ نے کوئی جواب نہ ملنے پر دوبارہ دستک دی تو الوینہ نے بھاری سر اور متورم آنکھوں کے ساتھ بند دروازے کی طرف دیکھا۔

''کون ہے..؟'' فاطمہ نے اس کی آواز میں بھیگا پن بہت واضح محسوس کیا تھا۔

''آپ سے کوئی ملنا چاہ رہے ہیں..... شہروز نام ہے..... گیٹ کے باہر انتظار کر رہے ہیں۔'' فاطمہ نے شاید ہی کبھی اس سے براہِ راست بات کی تھی۔ اس سے پہلے منال ہی تھی جو ان دونوں کے درمیان پُل کا کردار ادا کرتی تھی۔

شہروز کا نام سن کر الوینہ کے آنسوؤں کو ایک دم سے بریک لگی تھی۔

''اچھا...... تھینک یو۔'' الوینہ نے جواب دیا تو فاطمہ اسی کے بارے میں سوچتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کچھ منٹ تو الوینہ آنکھیں بند کیے اسی طرح بال بکھرائے لیٹی رہی، پھر ایک خیال کے تحت تیزی سے

وہ بستر سے اٹھی اور اپنے حلیے سے بے نیاز باہر کی جانب بھاگ گئی۔

''شہروز.....!'' اپنا نام سن کر گیٹ سے ٹیک لگائے شہروز نے چونک کر اس طرف دیکھا اور حیران رہ گیا۔ گیٹ کے اندر سے اجڑے ہوئے حلیے میں الوینہ باہر نکلی تھی اور نکلتے ہی اس کے سینے سے لگ کر بلک بلک کر رو پڑی۔

''ارے... الوینہ!!! تمھیں کیا ہوا بھئی..؟'' شہروز اس صورت حال کے لیے تیار نہیں تھا۔

''مجھے.... مجھے بس کہیں لے چلو پلیز.. مجھے یہاں سے کہیں دور لے چلو!'' اس کے آنسوؤں سے شہروز کی شرٹ بھیگنی شروع ہو گئی تھی۔

''اچھا اچھا...!!'' شہروز نے گھبرا کر اپنے اطراف میں دیکھا۔ ارد گرد سے گزرتے لوگ ان دونوں کو عجیب نظروں سے گھور رہے تھے:

''میں لے چلتا ہوں.... لیکن پہلے اپنا حلیہ تو درست کر کے آؤ.... کم از کم کوئی شوز تو پہن لو''!

اس کے کہنے پر الوینہ اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی اس سے الگ ہوئی تھی۔

''لیکن تم...... تم نے کہیں جانا نہیں ہے..... پلیز شہروز...!'' اس نے سسکتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں، میں یہیں کھڑا ہوا ہوں۔ تم جلدی سے آؤ۔''

شہروز اس کی ظاہری اور ذہنی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ الوینہ اپنے آنسوؤں کو ہاتھوں کی پست سے صاف کرتے ہوئے ہاسٹل کی جانب پلٹ گئی۔ شہروز نے کن اکھیوں سے ہاسٹل کی عمارت کی طرف دیکھا۔ بالائی منزل کی بہت سی کھڑکیوں سے اسے لڑکیوں کے چھپ چھپ کر باہر جھانکتے سر نظر آئے تھے جو اسے یوں دیکھتے ہی فوراً پیچھے ہو گئے تھے۔

....☆....

شہروز الوینہ کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر تقریباً سنسان سڑک پر لے آیا تھا۔ سارا رستہ گاڑی میں الوینہ کی سسکیاں گونجتی رہی تھیں جنہیں شہروز لب بھینچے سنتا رہا۔ اس نے ایک دفعہ بھی الوینہ کو خاموش کروانے کی کوشش نہیں کی تھی تاکہ اس کے دل کا سارا غبار آنسوؤں کی صورت بہہ جائے۔

''اب بتاؤ، کیا بات ہے؟ تم نے تو مجھے شدید پریشان کر دیا ہے۔'' ایک جگہ گاڑی پارک کر کے وہ الوینہ کی جانب مڑا تھا جس کا رونا اب تھم چکا تھا۔

''تم مجھ سے شادی کر لو شہروز...'' الوینہ نے اسے دیکھتے ہوئے اچانک کہا تھا۔ شہروز اس کی ابت سن کر حیران رہ گیا۔

''کیا....؟''

''ہاں شہروز، تم مجھ سے شادی کر لو۔ ابھی، اسی وقت.....'' الوینہ نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے جیسے اس سے منت کی۔

''تم مجھے پہلے پوری بات تو بتاؤ کہ کیا ہوا ہے؟ پھر شادی بھی کر لیں گے۔''

شہروز نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے اسے تسلی دی تھی۔ جواب میں آہستہ آہستہ الوینہ نے پوری روداد بتا دی۔ بچپن میں اپنے اوپر گزرے سانحے سے لے کر رستم اور منال کی شادی تک، ایک ایک بات

اس نے اُس دن کھول کر بتادی تھی۔ پھر جیسے تھک ہار کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سیٹ کی پشت سے اپنا سر ٹکالیا۔

”اوہ...اوہ....“!

شہروز کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔الوینہ سر سیٹ پر ٹکائے،آنکھیں موندے خاموش رہی۔ لیکن اس کی بند آنکھوں کے کناروں سے ایک آنسو ٹپکا تھا۔

”تم نے مجھے یہ سب کچھ پہلے کیوں نہیں بتایا الوینہ....؟ کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں تھا؟“ شہروز بس اتنا ہی کہہ سکا۔

”بھروسہ تو تھا لیکن..... تمہیں کھونے کا ڈر بھی تھا۔“ الوینہ نے آنکھیں کھول کر اس کی جانب دیکھا۔آنکھیں کھلنے سے آنسوؤں پر پپوٹوں کی وجہ سے جو بند بندھا ہوا تھا، وہ کھل گیا تھا اور بہت سے آنسو الوینہ کے گالوں پر بہہ نکلے تھے۔

”اب وہ ڈر نہیں ہے کیا...؟“ شہروز نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا تھا۔الوینہ نے کچھ ثانیے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ پھر نظریں پھیر کر ونڈ سکرین سے باہر دیکھنے لگی۔

”زندگی میں اچانک سے اتنا کچھ ہو گیا ہے کہ اب کوئی ڈر باقی نہیں رہا... کیا دوسروں کی طرح تم بھی مجھے چھوڑنا چاہتے ہو...؟ چھوڑ دو..“!

آخری جملے پر اس کا لہجہ نمی سے بوجھل لیکن ٹھوس ہو گیا تھا۔ شہروز نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی جانب موڑا۔

”کبھی نہیں..... کبھی بھی نہیں“!

....☆....

شہروز الوینہ کو اپنے گھر لے گیا تھا۔اس کے والد عبدالاحد ڈار کا شمار بھی رستم رئیس کی طرح شہر کے مالدار لوگوں میں ہوتا تھا، لیکن رستم کے برعکس ان کی طبیعت میں چھچھوراپن نہیں تھا بلکہ شائستگی اور رکھ رکھاؤ تھا۔ مسز ڈار کا مزاج بھی اپنے شوہر جیسا تھا۔ دونوں نے پورے تحمل اور تسلی سے الوینہ کی بات سنی

تھی۔

''پریشان نہ ہو بیٹی۔!!، یہاں آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔''

ڈار صاحب نے الوینہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرادی، لیکن پھر اچانک اسے ایک نئی فکر نے آگھیرا۔

''انکل! میرے ڈیڈی جماعت کے بہت اہم رکن ہیں.... کہیں آپ کے لیے کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔''

''مسئلہ کھڑا ہو گیا تو اسے آرام سے بٹھالیں گے!''ڈار صاحب نے مسکراتے ہوئے ماحول کو ہلکا پھلکا کرنا چاہا تھا:

'' ویسے ان باتوں اور مسئلوں پر بعد میں غور کریں گے، پہلے تو آپ ہماری بیٹی کے اعزاز میں اچھے سے کھانے کا تو انتظام کریں۔''

انہوں نے اپنی اہلیہ کو کہا تو وہ مسکراتے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔

''آؤ بیٹی، تمہیں گیسٹ ہاؤس دکھادوں۔ اپنا حلیہ تو ٹھیک کرو، رو رو کر کیسے اتنے پیارے چہرے کو سُجایا ہوا ہے''!

مسز ڈار کے لہجے میں الوینہ کے لیے شفقت تھی۔ وہ ممنونیت سے مسکراتے ہوئے کھڑے ہو گئی اور ان کی پیروی میں ایک جانب چل دی۔ ان دونوں کے جانے کے بعد شہروز نے سنجیدگی کے ساتھ اپنے والد کی جانب دیکھا تھا۔

''اب کیا ہو گا پاپا...؟''

''تم دونوں کی شادی!'' وہ مسکرائے تھے۔

ان کا جواب سن کر شہروز کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس کے تاثرات دیکھتے ہوئے ڈار صاحب نے سنجیدہ لہجے میں کہا:

''یہ اُس مخصوص جماعت کا معاملہ ہے۔ وہ جانتی ہے کہ الوینہ اپنے باپ اور جماعت کے خلاف بہت

کچھ بول سکتی ہے اس لیے وہ ضرور اسے واپس لینے کے لیے سر توڑ کوشش کریں گے، اور انہی کوششوں میں وہ ہمارے گھر تک پہنچ جائیں گے۔ پیشتر اس سے کہ کوئی بدمزگی ہو، مجھے یہی بہتر لگ رہا ہے کہ تم دونوں کی جلد از جلد شادی کر دی جائے۔"

"لیکن پاپا..." شہروز کے لیے یہ خبر بالکل غیر متوقع تھی۔

"کیا بات ہے...؟ تم الوینہ سے شادی نہیں کرنا چاہتے کیا...؟" ڈار صاحب نے عینک کے اوپر سے اسے گھورا تو وہ گڑبڑا گیا۔

"نن.... نہیں پاپا، یہ بات نہیں ہے۔" شہروز کے چہرے پر حیرت کی جگہ شرمیلی سی مسکراہٹ نے لے لی تھی۔

"آج کل کے لڑکے تو پسند کی شادی کے لیے اتاولے ہوئے جاتے ہیں، ایک تم ہو، اماں باوا تمہاری پسند کی شادی کروا رہے ہیں اور تمہیں نخرے سوج رہے ہیں!" ڈار صاحب نے زیرِلب مسکراتے ہوئے دوبارہ عینک ناک پر ٹکائی اور شہروز کو کہنے لگے:

"زرا فون اور فون ڈائری لانا۔" شہروز نے نہ سمجھتے ہوئے فون اور ڈائری ان کے سامنے میز پر لا کر رکھ دی۔

"پاپا...! آپ کا کب تک میری اور الوینہ کی شادی کروانے کا ارادہ ہے..؟ میرا مطلب ہے۔" اس کی بات سن کر جس طرح عینک کے اوپر سے ڈار صاحب نے اسے دوبارہ گھورا تھا، وہ ایک بار پھر گڑبڑا گیا۔

"آج شام کو.... میں باسط بھائی اور معاذ کو کہنے لگا ہوں کہ اپنی فیملی سمیت شام تک ہمارے گھر پہنچ جائیں، تم اپنے انتہائی قریبی دو دو دوستوں کو بلا لو بس۔"

یہ کہہ کر ڈار صاحب فون پر اپنے بھائی کا نمبر گھمانے لگے، یہ دیکھے بغیر کہ 'آج شام کو' سن کر شہروز کے چہرے پر کیسی بھرپور سی مسکراہٹ پھیلی تھی، جس میں حیرت بھی تھی اور اپنی من پسند ہستی کو اتنی جلدی پا لینے کی بے انتہا خوشی بھی!

....☆....

منال کی زندگی یکسر بدل گئی تھی۔اب وہ سادہ سی منال نہیں رہی تھی جس کے پاس ذہانت اور حسن تو تھا لیکن دولت نہیں تھی۔اب تو اس کے پاس ذہانت بھی تھی، حسن بھی اور دولت بھی...! اور نخرہ بھی! وہ شرمیلی سی منال کہیں گاؤں میں ہی رہ گئی تھی۔

''اصل میں زندگی تو اب شروع ہوئی ہے!''اس نے باغیچے میں بیٹھ کر مالٹے کا تازہ جوس اپنے حلق میں اتارتے ہوئے سوچا تھا:''جب گاؤں کی زندگی کو پیچھے چھوڑ دیا تو کیوں نہ اس نئی زندگی کو بھرپور انداز میں جیا جائے''!

اس نے سردی کی دھوپ میں ایک ادا سے اپنے بالوں کو سہلایا تھا جن کی وہ پچھلے دن ہی ایک مشہور مہنگے پارلر سے ٹریٹمنٹ کروا کر آئی تھی۔

''آہ الوینہ!!! تم کتنی ناشکری تھی جو اِس زندگی سے تنگ تھی۔''جوس کا خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے اس کی نظر اپنے ناخنوں پر پڑی تھی جن پر نیوڈ رنگ کی پالش لگی ہوئی تھی۔اس نے تنقیدی نظروں سے ان کا معائینہ کیا، پھر مسکرادی:''یہ زندگی تو رشک والی ہے! انسان کے پاس حسن اور دولت ہو تو باقی کیا رہ جاتا ہے؟ دوستی بھی ایسا رشتہ ہے بھلا جس کے پیچھے زندگی کو روگ لگایا جائے''!!

اچانک اسے الوینہ پر ترس آیا تھا:

'' چچ چچ چچ....وہ تمھیں اپنی بیسٹ فرینڈ کہتی تھی منال...! اور اب تم اس کے گھر میں بیٹھی عیش کر رہی ہو۔تم نے تو اسے دھوکہ ہی دیا۔''

''نہیں.....میں نے اسے کوئی دھوکہ نہیں دیا....اسے ایک دوست کی ضرورت تھی، مجھے نہیں.....میری زندگی تو پہلے بھی ٹھیک چل رہی تھی اور اب تو ہے ہی شان دار....اس لیے مجھے اس کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا...!''اس نے شال کو اپنے گرد لپیٹا تھا۔

''لیکن تم نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی تو نہیں کی۔''

''ارے...! جو کام میرے شوہر کو نہیں پسند، تو وہ میں کیوں کروں؟ باپ بیٹی کا معاملہ وہی آپس میں نمٹائیں۔میں خواہ مخواہ اپنی ٹانگ ان کے معاملات میں گھسادوں....؟ ہونہہ!''اس نے سر جھٹک کر

ذہن میں آنے والی سوچوں کو رد کیا تھا اور شال سنبھالتی ہوئی کوٹھی کے اندر چلی گئی تھی۔

منال نے رستم سے کہہ کر اپنے گھر والوں کے لیے شہر میں ہی ایک گھر خرید لیا تھا۔ آنے والے وقت نے دیکھا تھا کہ منال اور رستم کی تبلیغ کی وجہ سے امداد اور اماں کتنی جلدی اس جماعت میں شامل ہو گئے تھے۔ جاوید نے شروع میں تو کچھ شش و پنج سے کام لیا لیکن جب جماعت نے اسے پیشکش کی کہ اگر وہ کینیڈا جانے کے لیے بس ایک کاغذ پر دستخط کر کے وقتی طور پر بھی اس جماعت میں داخل ہو جائے تو جماعت اسے کینیڈا بھجوا دے گی۔

اس پیشکش کو سنتے ہی جاوید نے مزید کچھ نہ سوچا اور اپنی طرف سے 'وقتی طور پر' جماعت میں شامل ہو گی جس کے بعد جلد ہی اسے کینیڈا بھجوا دیا گیا۔ اتنی بڑی عنایت اور اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کرنے پر جاوید جماعت کا اتنا احسان مند ہوا کہ اس نے اس جماعت کے بانی کو مسیح موعود اور ظِل نبی مان لیا۔

پیچھے رہ گئے ابا.... تو بظاہر ان پڑھ اور سیدھے سادھے سے باباساکو کا ایمان ان چاروں سے زیادہ مضبوط نکلا تھا۔ رستم، منال، اماں، جاوید اور امداد کی بارہا کوششوں کے باوجود ابا نے ان کی جماعت میں شمولیت اختیار نہیں کی تھی۔

''بس، تم لوگوں کو جو ٹھیک لگتا ہے، وہ کرو، اور مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو!'' جب بھی ان میں سے کوئی ابا سے اس سلسلے میں بات کرنے کی کوشش کرتا، باباساکو آگے سے یہ جواب دے کر اٹھ جاتے تھے اور بات کرنے والا اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا تھا۔

بظاہر ان سب نے بہت نفع کا سودا کیا تھا لیکن وہ بھول گئے تھے کہ گھاٹا صرف مال میں نہیں ہوتا، چوری صرف پیسے کی نہیں ہوتی، ایمان کی بھی ہوتی ہے۔ کیسی عجیب بات تھی کہ ان سب کا ایمان لوٹا جا چکا تھا اور وہ اس بات پر مطمئن تھے اور سمجھتے تھے کہ ان کا والد یعنی بابا اسحاق عرف ساکو پیچھے رہ گیا ہے۔

باباساکو کے ارد گرد جماعت میں شامل ہونے کی بہت ترغیبیں تھیں جن سے باباساکو نے اپنی سی کوشش کر کے اپنا ایمان تو بچا ہی لیا تھا، اور جس نے اپنا ایمان بچا لیا، اس نے اپنے آپ کو بچا لیا۔

....☆....

وہ کانپتے ہوئے وجود کے ساتھ ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا اور ان لوگوں کو دیکھنے لگا۔ جہاں مایوسی ہی مایوسی تھی۔ ہوا میں موجود ناگوار سی بو اب ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے اپنے ایک بازو سے اپنی ناک ڈھانپ لی تھی۔ وحشت بھرے اس پورے منظر نامے میں ایک مریل سی آواز گونجی تو اس نے اپنے کان کھڑے کر لیے:

''نبیل بھرا! بس اب جلدی جلدی کام ختم کریں اور یہاں سے نکلیں۔'' ایک شخص کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ وہ مراد تھا!

''ہاں ہاں، جلدی کرو، مجھے ویسے بھی بہت کام ہیں۔ پہلے ہی آدھا گھنٹہ دیر سے پہنچے ہیں۔''

نبیل نے آگے بڑھ کر میت کو پاؤں کی سمت سے پکڑا۔

''تم میں سے کوئی تو قبر میں اترے!'' اس نے جھنجھلا کر باقیوں سے کہا تو سارے جھجھک سے گئے۔

''نبیل! یار کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا ہے۔ گرمی بھی بہت......''

ابھی ایک فربہ جسم والے نے کہا ہی تھا کہ ایک شخص 'میں ہی اتر جاتا ہوں، تم لوگوں کے دماغ پر گرمی چڑھ گئی ہے۔'' کہتا ہوا قبر میں اتر گیا۔ اس کے ساتھ ہی مراد بھی قبر میں اترنے کی کوشش کرنے لگا۔

'لاؤ، اب جلدی سے پکڑاؤ...... جلدی کرو۔''

شروع میں تو وہ دونوں بے فکر سے محسوس ہوئے تھے لیکن کچھ ہی لمحوں بعد ان میں حد درجہ بے چینی عود آئی۔ نبیل اور فربہ جسم والے نے لوگوں کی مدد سے میت وصول کی اور قبر کے نچلے حصے میں کھڑے افراد کو پکڑا دی۔ انہوں نے بدحواس سا ہو کر میت کو قبر میں جیسے تیسے رکھا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے باہر نکل آئے۔ مراد قبر سے کچھ فاصلے پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا تھا۔ فضا میں اب پہلے سے موجود بو کے ساتھ عجیب سی بساند بھی شامل ہوتی جا رہی تھی۔ یہ بڑی حیرت والی بات تھی۔

''ایسا لگ رہا تھا جیسے دم گھٹ رہا ہو۔ عجیب خنکی تھی قبر میں، ویسی خنکی جو ہڈیوں میں اُترتی ہے۔''

دوسرا بھی کچھ خوف زدہ سا نظر آ رہا تھا۔

’’خنکی؟اندر قبر میں تو گرمی لگ رہی تھی مجھے، خوب تپش والی گرمی....‘‘ مراد نے جھرجھری سی لی۔

ان دونوں کی باتیں سن کر باقی نفوس کے چہروں کے رنگ بھی اُڑ گئے تھے۔ نبیل نے دیکھا تو فوراً کہنے لگا۔

’’وہم ہے تم لوگوں کا.... موت کا خوف محسوس ہو رہا ہے تم سب کو..... دیکھو پیارو‘‘!

اس کے لہجے میں نرمی امڈ آئی۔

’’مرنا تو ایک دن سبھی نے ہے۔ شاہ صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے، جیسے ہماری جماعت کے باقی لوگ اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں۔ ہمارے لیے خوشی کی بات بس اتنی ہونی چاہیے کہ یہ حق کی راہ میں مرے ہیں، اُن ملا پرستوں جیسی موت نہیں ہوئی جن سے وہ قبرستان اَٹا پڑا ہے۔ دیکھو تو کیسی پر سکون جگہ نصیب ہوئی ہے یہاں۔ ایک طرف ملک سلطان اور دوسری طرف چودھری عنایت جٹ‘‘!

نبیل نے پہلے بڑے قبرستان کی جانب اور آخر میں اپنے قریب بنی ہوئی دو قبروں کی جانب اچارہ کرتے ہوئے کہا۔ باقی افراد خاموشی سے اس کی باتیں سن رہے تھے کہ اچانک مراد اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا تیزی سے کھڑا ہوا۔

ایک بچھو نما کیڑا اس کے دامن سے نیچے زمین پر گرا جسے فوراً ہی لمبے قد والے شخص نے اپنے جوتے سے کچلنے کی کوشش کی، مگر وہ آناً فاناً کہیں غائب ہو گیا۔ سبھی نے کن اکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا، ماحول پر ایک دم سے وحشت سی چھا گئی تھی۔

’’چلو مٹی ڈالو بس اب...‘‘ نبیل نے کہا اور خود بھی مٹھی ہیں مٹی لے کر جلدی جلدی قبر پر ڈالنے لگا۔ باقی افراد بھی اس کی تقلید کرنے لگے۔ وہ ابھی تک درخت کے پیچھے چھپا اِن سب کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا رواں رواں کھڑا ہو چکا تھا۔

’’تو یہ تھے وہ پُر خلوص لوگ جن کی وجہ سے آپ نے اپنے عزیز دوستوں کو چھوڑ دیا تھا؟‘‘

اس نے تخیل میں شاہ صاحب کو مخاطب کیا تھا۔

جیسے تیسے قبر کو مٹی سے ڈھک کر، نبیل نے قبر پر پانی کا چھڑکاؤ کیا، مراد اِدھر اُدھر بکھری چیزیں سمیٹنے لگ گیا تھا۔اس کے بعد سبھی افراد اس پلاٹ سے افرا تفری میں نکل گئے۔ان کے جانے کے بعد کچھ منٹ تو وہ وہیں درخت کے پیچھے کھڑا رہا، پھر ناک کو ڈھانپے ہوئے قبروں کی جانب بڑھا۔پلاٹ کانٹے دار جھاڑیوں اور پودوں سے اٹا ہوا تھا جس کے درمیان میں کچھ ہموار اور خشک زمین پر قبریں بنی ہوئی تھیں۔اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

”لاالہ الااللہ محمد الرسول اللہ۔“

زیرِلب کلمہ پڑھتے ہوئے، اپنے آپ کو خار دار جھاڑیوں سے بچاتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہا تھا کہ قبروں کے پاس پہنچتے ہی اس نے ناگواری سے فوراً اپنے بڑھتے قدم روکے۔ چودھری عنایت جٹ کی اُجڑی، ٹوٹی قبر میں ایک شگاف بنا ہوا تھا جہاں کسی جانور نے اپنی غلاظت چھوڑی ہوئی تھی۔

”آخ.....“اور ملک سلطان کی قبر پر نظر پڑتے ہی وہ خوف سے لرز کر رہ گیا۔موٹے کالے چیونٹوں کی ایک قطار تھی جو اس ملک سلطان کے کتبے کے عین نیچے بنے ایک سوراخ سے قبر کے اندر جا رہی تھی، اور بس اندر جا رہی تھی، باہر نکلتی ہوئی کوئی قطار نظر نہیں آ رہی تھی۔

جیسے ہی اُس کی نظر تازہ قبر پر پڑی، اس کے سارے احساسات، ساری کیفیات بھک کر کے جیسے اُڑ گئی تھیں، پورا جہان اس کی آنکھوں سے جیسے غائب ہو گیا تھا، بس وہ تھا اور اس سے دو قدم کے فاصلے پر وہ قبر تھی، ویران اور وحشت زدہ سی قبر..... جس کے اوپر کچھ دیر قبل چھڑکا گیا پانی وہ پی چکی تھی اور اب جیسے پیاسی قبر اپنی ہی تپش سے گھبرا کر مزید پانی مانگ رہی تھی۔

قبر کو یک ٹک دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں ماضی کی پٹیاں سی چلنے لگیں۔ وہ باطنی آنکھ سے وہ صاحبِ قبر کو جیتا جاگتا، اس کے ساتھ باتیں کرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔اپنے احباب کے ساتھ بحث و مباحثہ کرتا ہوا دیکھ رہا تھا، اس کی خوش مزاجی اور خوش اخلاقی کو دیکھ رہا تھا۔ اسے لوگوں میں گھرا ہوا دیکھ رہا تھا، اور پھر........ کسی پرندے کی زوردار اور وحشت ناک سی چیخ اسے حال میں کھینچ لائی جہاں صاحبِ قبر بے جان تھا، خاموش تھا، بے پناہ عقلی دلائل کے باوجود اپنی عقل کو استعمال نہیں کر پایا تھا اور اب استعمال

کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔

"شاہ جی... !کاش آپ نے ایسا نہ کیا ہوتا۔" اس نے تاسف سے سر ہلایا۔

"کاش آپ نے سچ کو جان لینے کے بعد اس سے منہ نہ موڑا ہوتا۔ آپ جس بے مثال گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، کاش آپ اسی گھرانے کے نظریات اپنے رب کے پاس جاتے... اے۔ کاش...."

اس کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ اچانک اسے جھرجھری سی آئی اور ایک سرد لہر سی اس کی ریڑھ کی ہڈی سے گزر گئی۔

"لیکن آپ عقل اور شعور رکھتے تھے۔ آپ کو زمانے بھر کا علم تھا۔ آپ یہ علم کیوں نہ حاصل کر پائے؟ آپ کیوں اپنے علم پر اتنے نازاں ہو گئے کہ اپنی منزل سے راہ فرار اختیار کر بیٹھے؟ '

وہ بائیں بازو کو سینے پر موڑ کر اس پر دائیں بازو کو ٹکائے اور اس ہاتھ کو مٹھی بنا کر اپنے ہونٹوں پر رکھے، قبر کو نم آنکھوں سے دیکھے جا رہا تھا۔

"آپ نے اپنے اوپر ظلم کیا، آپ نے ان سب پر ظلم کیا جو آپ سے محبت کرتے تھے، آپ کو عزیز رکھتے تھے۔ آپ نے ہم سب کو اپنے آپ سے دور کر لیا۔ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم آپ کے لیے مغفرت کی دعا تک نہیں کر سکتے۔" اس کی آنکھ سے ایک آنسو ڈھلکا تھا۔

"لیکن نہیں، یہ راستہ آپ کا خود کا چنا ہوا تھا۔ آپ نے ہوش و حواس میں رہتے اتنا بڑا قدم کیسے اٹھالیا؟"

فضا میں حبس اور بدبو بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

"اللہ نے آپ کو پانچ سال دیے تھے واپس پلٹنے کے لیے۔ لوٹ آنے کے لیے تو پانچ لمحے بھی بہت ہوًتے ہیں، آپ کو تو اللہ نے ساٹھ مہینے دیے تھے۔ ہر مہینے کے تیس دن دیے تھے، ہر دن کے چوبیس گھنٹے، ہر گھنٹے کے ساٹھ منٹ.... کتنی تو مہلت دی تھی اللہ نے آپ کو... مگر... مگر آپ نے تو سوچ بچار ہی نہیں کی۔"

وہ قبر سے کچھ قدم دور کھڑا، صاحبِ قبر، سید اصغر علی شاہ سے مخاطب تھا۔ ایک اور آنسو ڈھلکتا ہوا

اس کے ہونٹوں پر جمے ہاتھ کی مٹھی تک آیا تھا۔

''آپ کو میرے والد نے کتنا سمجھایا تھا... آپ کو آپ کی اہلیہ، آپ کے رشتہ داروں نے بھی.. لیکن یہ کیسی کم عقلی کی پٹی تھی جو آپ کی آنکھوں پر باندھ دی گئی تھی اور آپ اسی کم عقلی کی پٹی کے ساتھ دنیا کو دیکھنے پر بضد تھے۔''

اس نے ہونٹوں پر جمے ہاتھ سے تاسف اور نفرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ گال پر بہتا ہوا آنسو صاف کیا۔

''یہ سب آپ کا اپنا کمایا ہوا ہے۔ یہ جنازہ جس کے اُٹھنے کا کسی کو پتا نہ چلا، کسی کو فرق نہ پڑا، یہ پتھر کی طرح سخت زمین پر اُجڑی ویران اور وحشت میں گھری قبر.....''اس کے چہرے پر اب سختی تھی۔

'' میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں یہاں نہ آؤں، لیکن مجھے یہاں آنا تھا، اور اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا کہ آپ جیسوں کی وحشت ناک موت، جنازہ کیسا ہوتا ہے، سو یہ وحشت میرے دل کی دنیا میں ہمیشہ قائم رہے گی۔''

یہ کہہ کر بلال عبدالکریم ایک جھٹکے سے مڑا اور وحشت زدہ پلاٹ سے نکل گیا۔ پیچھے قبرستان میں چند پرانی قبروں کے ساتھ بنی اصغر علی شاہ کی تازہ قبر بھی نحوست اور ویرانی کا منظر پیش کرنے لگی تھی۔

....☆....